مضامین

دیباچہ

متن

باسمہ

تقریب

سنہ ۱۸۵۷ء کی دار و گیر ہنگامے سے ہندوستان کی جو ریاستیں محفوظ رہیں اُن میں روہیلکھنڈ کی واحد اسلامی ریاست مصطفےٰ آباد عرف رامپور، مشرقی علم و ادب کی سرپرستی کے اعتبار سے ممتاز ترین درجے کی مالک ہے۔

یہ ریاست بارھویں صدی ہجری میں جانباز روہیلوں کی مردانہ کاریوں کی بدولت قائم ہوئی اور چند سال کے اندر اپنے خوش بخت فرمانروا نواب سید علی محمد خاں بہادر کے اقبال کی تائید سے روہیلکھنڈ کے طول و عرض پر چھا گئی۔ لیکن ابھی اس کی بنیاد کما حقہٗ استوار نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں نواب سید علی محمد خاں بہادر کا انتقال ہو گیا۔ حافظ رحمت خاں بہادر نے، دیگر روہیلہ سرداروں کے مشورے سے اُن کے فرزند سوم نواب سید سعد اللہ خاں بہادر کو، جو ابھی صغیر السن تھے، تخت نشین کر دیا۔ سلطنت اودھ، روہیلوں کے روز افزوں اقتدار و نشاط کو خطرے کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اُس نے اس نازک وقت سے فائدہ اُٹھایا، اور اپنی مسلسل جارحانہ مخالفت سے روہیلکھنڈ کی طویل و عریض سلطنت کو ریاست رامپور کی مختصر چار دیواری میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس پُر آشوب عہد میں، حکومت انگلشیہ کے زیر حمایت، نواب سید فیض اللہ خاں بہادر عرش منزل مسند آبائی پر متمکن ہوئے۔ آپ میں وہ تمام صفات حسنہ، جو ایک معدلت گستر حکمراں کا طرۂ امتیاز شمار کی جاتی ہیں، بوجہ اتم موجود تھیں۔ اس لیے آپ نے اپنی دانش شاہانہ سے کام لے کر روہیلوں کی منتشر قوت کو یکجا کیا، تعلیم و تربیت رعایا کے لیے مدرسۂ عالیہ قائم کر کے

ملا حسن فرنگی محلی اور بعد ازاں بحر العلوم مولانا عبد العلی لکھنوی کو اس کا پرنسپل مقرر فرمایا؛
اور محکمۂ قضا (جوڈیشل ڈپارٹمنٹ) کے لیے فتاویٰ فیض اللہ خانی مرتب کرایا، لیکن
ابھی عروجِ ستارۂ اقبال کی اُمیدِ مُردہ پوری طرح زندہ ہونے پائی تھی کہ ذی الحجہ سنہ
۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں نواب عرش منزل نے قضا کی۔

روہیلوں نے، آپ کے فرزندِ اکبر، نواب سید محمد علی خاں بہادر کو اپنا حکمراں تسلیم کیا
مگر یہ نیا دور ایک افسوسناک حادثے کے باعث بہت جلد ختم ہو گیا، اور محرم سنہ ۱۲۰۹ھ
(۱۷۹۴ء) میں بجائے آپ کے، نواب عرش منزل کے فرزندِ دوم، نواب سید غلام محمد خاں
بہادر مسند نشین ہوئے۔ حکومتِ اودھ نے، جو روہیلوں کی مجتمع قوت کو بہر خائفانہ نظروں
سے دیکھنے لگی تھی، اس معاملے میں بیجا مداخلت کی، اور نواب سید محمد علی خاں بہادر کا خوں بہا
طلب کرنے کے بہانے سے رامپور پر فوج کشی کر دی۔ سوءِ اتفاق سے روہیلوں کو
شکست ہو گئی۔ نواب سید احمد علی خاں بہادر ابن نواب سید محمد علی خاں بہادر، جو ابھی خورد سال
تھے، نواب سید نصر اللہ خاں بہادر کی سرپرستی میں والی بنائے گئے؛ اور نواب سید
غلام محمد خاں بہادر اور اُن کی اولاد رامپور سے باہر رہنے پر مجبور ہوئی۔ لیکن "خدا
شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" ان حضرات کی بظاہر ناکامی و محرومیِ تخت و تاج،
ان کی آئندہ عظمت و شہرت کا سبب بن گئی۔

سنہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں نواب سید احمد علی خاں بہادر فوت ہوئے، اور اُن کی
اکلوتی صاحبزادی، شمسہ تاجدار بیگم صاحبہ کی حکومت تسلیم کرنے سے روہیلہ سرداروں نے
انکار کر دیا۔ حکومتِ انگلشیہ کے تدبر نے نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے خلف الرشید،
نواب سید محمد سعید خاں بہادر جنت آرامگاہ کو اس وراثتِ آبائی کا حق دار قرار دیا۔
نواب جنت آرامگاہ نے سنِ شعور کو پہنچ کر حکومتِ انگلشیہ کو شرفِ خدمت
اعطا اور اپنی کارروائی اور قابلیتِ انتظامی کی بدولت ڈپٹی کلکٹری [illegible]
فرما چکے تھے۔ آپ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے [illegible]
نے توجہ مبذول فرمائی، اور فوج، پولیس اور محکمۂ مال کے لیے [illegible]

فرماکر، روہیلوں کے غیر منظم جرگے کو آئینی ریاست کے قالب میں ڈال دیا۔

انتظامی امور سے فارغ ہو کر، نواب جنت آرام گاہ نے سرپرستی علم و ادب کی طرف قدم اٹھایا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، ملک الشعرا مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی، حکیم احمد خاں فاخر رامپوری اور دیگر علما و ادبا مختلف کتابوں کے ترجمہ و تالیف پر مامور ہوئے۔ لیکن یہ پودا پروان چڑھنے نہ پایا تھا کہ سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب جنت آرام گاہ نے وفات پائی۔

آپ کے بعد نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں نے تاج ریاست زیب سر فرمایا۔ آپ، نواب جنت آرام گاہ کی تخت نشینی سے قبل دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے، اور مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، اور میرزا اسد اللہ خاں غالب سے علوم عربی و فارسی کی تحصیل فرما چکے تھے۔ آپ کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہندوستان نے حکومت انگلشیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ نواب فردوس مکاں نے اس موقع پر حکومت کی حمایت و ہمدردی میں بیش بہا خدمات انجام دیں، اور غدر فرو ہو جانے پر آفت رسیدہ علما، شعرا، ادبا اور دیگر اہل ہنر کے لیے اپنے سایۂ عاطفت و پرورش کو وسیع فرمایا۔

نواب فردوس مکاں کے دامن جود و سخا میں پناہ لینے والے حضرات کی طویل فہرست میں مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی، میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی، منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی، منشی امیر احمد امیر مینائی، صاحب عالم میرزا رحیم الدین بہادر حیا دہلوی، شیخ علی بخش بیمار، میر عوض علی عدیل ملیح آبادی خوش نویس نستعلیق، اور منشی انبا پرشاد لکھنوی داستان گو، وہ ممتاز ہستیاں ہیں، جن سے ارباب علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔

لیکن ان تمام صاحبان فضل و کمال میں، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ زمانۂ سنہ ۵۷ء میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی وساطت سے، نواب فردوس مکاں نے انھیں فن سخن میں اپنا مشیر خاص مقرر فرمایا تھا۔ ابتداءً نواب فردوس مکاں وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے۔ غدر کے بعد اُن کی پنشن بند ہو جانے پر، نواب صاحب نے جولائی سنہ ۵۹ء سے سو روپے ماہوار تنخواہ جاری فرما دی تھی، جو اُن کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانے سے ملتی رہی اور میرزا صاحب

کی وفات پر اُن کے متبنّٰے حسین علی خاں شاداںؔ کے وظیفے کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

اس رشتے کی بدولت سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۸۶۹ء تک دربارِ رامپور اور میرزا غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا۔ اس مراسلت کا معتدبہ حصہ محکمۂ عالیۂ دارالانشا (پولیٹکل ریکارڈس آفس) میں محفوظ تھا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں احقر نے اعلیٰ حضرت بندگانِ حضور پُرنور ہز ہائنس عالی جاہ فرزندِ دلپذیر دولتِ انگلشیہ مخلص الدولہ ناصر الملک امیر الامرا نواب سر سید محمد رضا علی خاں بہادر مستعد جنگ کے سی۔ ایس۔ آئی؛ ایل ایل۔ ڈی؛ ڈی لٹ فرمانروای رامپور، دَامَ اِقْبالُہُمْ وَمُلْکُہُمْ کی توجہ ہمایوں اس نادر و نایاب ذخیرے کی اشاعت کی طرف مبذول کرانے کی جرأت کی۔

بندگانِ اعلیٰ حضرت کی ذاتِ گرامی، اپنے آبای کرام کی طرح، سرپرستیِ علوم و آداب میں عموماً اور پرورشِ زبانِ اردو میں خصوصاً، اقران و اماثل میں ممتاز ہے۔ بنا بریں حکمِ عالی نافذ ہوا کہ اس مجموعے کو باحسن وجوہ مرتب کر کے افادۂ اربابِ ذوق کے لیے شائع کر دیا جائے۔

میں نے مولوی امتیاز علی خاں عرشیؔ، ناظم کتاب خانۂ رامپور کو (جن میں علمی قابلیت ذوقِ سلیم اور علم و ادب کی علمی خدمت کے جذبات جمع ہیں، اور جن سے مجھے آیندہ کے لیے بہت بلند اور خوش آیند توقعات ہیں) اس ادبی خدمت کے انجام دینے پر مامور کیا، اور وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات اور مشورے دیتا رہا۔ ان کی مسلسل دو سال کی سعی و جانفشانی کے بعد آج یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت شہریارِ رامپور دام اقبالہم کے حضور میں اس گذارش کے ساتھ پیش کیا جا سکے کہ

لائق نبود قطرہ بعمّان بردن ‏ ‏ ‏ خار و خس صحرا بگلستان بردن

اما چہ کنم کہ رسم موری باشد ‏ ‏ ‏ پای ملخی پیش سلیمان بردن

التجا ہے کہ یہ حقیر کوشش شرفِ قبولیت سے مفتخر کی جائے، کہ یہی اس کی تالیف و طباعت کا پیش خیمہ ہے۔ خدا سرکار کی عمر دراز کرے، اور جاہ و جلال و اقبال زیادہ فرمائے تاکہ اس مبارک عہد میں اہم سے اہم اور زیادہ سے زیادہ علمی خدمات انجام پائیں۔ آمین:

رنگ محل پیلس، رامپور
۱۶ مارچ ۱۹۳۷ء

بشیر حسین زیدی
چیف منسٹر، رامپور

مکاتیب غالب
دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

بعد خانِ ہمایونِ اعلیٰ حضرت فرمانروای رامپور، دام اقبالہم وملکہم کے حکم سے مکاتیبِ غالب کا پہلا نسخہ ۱۹۳۷ء میں شائع کیا گیا تھا۔

مرتب کا ارادہ تھا کہ ملک کے مستند نقادوں کے مشورے اور اپنی نئی معلومات کے پیشِ نظر دوسری اشاعت کو صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے بہتر شکل میں پیش کرے گا لیکن ابھی اس کی نوبت نہ آئی تھی کہ دنیا کی سب سے بڑی جنگ شروع ہوگئی اور چند دن کے اندر عمدہ کاغذ نایاب ہوگیا۔ اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ حالات کے سازگار ہونے تک کتاب کی طباعت ملتوی کی جائے۔ حُسنِ اتفاق سے ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے اسے اپنے اُردو کے نصاب میں داخل کرلیا تھا۔ طلبا کی ضرورت مجبور کررہی تھی کہ جلد از جلد کتاب بازار میں لائی جائے۔ آخر کار ذوقِ حسنِ طباعت پر طلبا کی ضرورت کا احساس غالب آیا، اور ۱۹۴۳ء میں دوسری بار اور ۱۹۴۵ء میں تیسری بار مکاتیب کا درسی ایڈیشن چھاپا گیا۔

گزشتہ سات برس کی مدت میں مرتب مکاتیب نے اس امر کی برابر کوشش کی تھی کہ کتاب کے داخلی محاسن کی آراستگی و پیراستگی کا عمل جاری رکھے۔ الحمد للہ کہ اس سعی میں کامیابی نصیب ہوئی اور مکاتیب کا ظاہری حسن جتنا گھٹتا گیا، باطنی اوصاف اس سے کہیں زیادہ بڑھتے چلے گئے۔ اب کہ یہ چوتھا نسخہ شائع کیا جارہا ہے، مرتب کو اطمینان ہے کہ اس کا متن میرزا صاحب کے پسندیدہ اصولِ املا کے بالکل مطابق اور دیباچے اور حواشی کے مباحث پچھلی تمام طباعتوں سے

زیادہ صحیح اور مفید ہیں۔

چونکہ اس بار پچھلے دیباچے غیر ضروری جان کر حذف کر دیے گئے ہیں اس لیے یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ کتاب میں اردوئے معلی اور عود ہندی کے جن نسخوں کا مطبع و سنہ کے ذکر بغیر حوالہ دیا گیا ہے، وہ بالترتیب اکمل المطابع دہلی اور مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۸۶۹ء میں چھپ کر شائع ہوئے تھے۔ ان دونوں کے دوسرے ایڈیشنوں نیز اور کتابوں کا حوالہ دیتے وقت مطبع و سنہ طباعت کا اظہار کسی ایک جگہ کر دیا گیا ہے، جس سے حوالوں کی تصدیق میں کوئی خاص زحمت و دقت نہیں ہوگی۔

پچھلی طباعتوں میں معاونین کا شکریہ نام بنام ادا کیا جا چکا ہے، لیکن جذبۂ منت پذیری کے مزید تقاضے سے مجبور ہو کر مرتب کتاب اس بار پھر ان سب حضرات کی خدمت میں دلی شکریہ پیش کرتا ہے، جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر مفید مشورے دیے تھے۔ خدا انھیں جزائے خیر عطا کرے اور رامپور کے اس "دورِ رضوی" کو ہمارے لئے مزید برکت و خیر کا باعث بنائے! آمین

کتاب خانۂ رامپور
۱۵ جنوری ۱۹۴۶ء

حقیر
امتیاز علی خاں عرشی
ناظم کتاب خانہ رامپور

سرگذشتِ غالب

آتشِ غدر سرد ہو جانے کے بعد میرزا غالب نے نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا تھا، جس کا یہاں سے جواب نہیں گیا۔ میرزا صاحب نے خیال کیا کہ شاید میری رودادِ غدر سے واقف نہ ہونے کے باعث سرکار کو شبہ ہے کہ میں بھی باغیوں کا شریکِ کار رہا ہوں، اور اس بنا پر ازراہِ احتیاط مراسلت سے احتراز فرمایا ہے۔ اس شبہے کے ازالے کے لیے ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کو انھوں نے دوسرا عریضہ ارسال کیا، اور اس میں اپنے انگریزی روابط، حقیقتِ تعلقِ قلعہ اور ایامِ غدر میں اپنی گوشہ گیری کے تذکرے سے پہلے سرکار کو لکھا:

"ہر آئینہ در دل چنان گذشت کہ درین بار بہ انشائے سخن سرائی توان گفت کہ
سرگذشتِ من از دلِ نعمت شان و تباہی درمیان نماند"[1]

میرزا صاحب کی اس توجیہ کے پیشِ نظر ہم نے بھی مناسب خیال کیا کہ کم از کم وہ حالات جنھیں خود میرزا صاحب اس عریضے یا دیگر تحریروں اور مکاتیب کے ذریعے سے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں، یا دیگر فرماں روایانِ دربار کے علم میں لانا ضروری سمجھتے تھے، چند ضروری اضافوں کے ساتھ آغازِ مکاتیب میں شامل کر دیا۔

نام، تخلص اور خطاب

میرزا صاحب کا نام اسد اللہ خاں، عرف میرزا نوشہ، تخلص غالب اور "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ" خطاب تھا۔

۱۔ مکاتیب: ۸۱ – ۲۔ مکاتیب: ۳، ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۵۲

پیدائش اور یتیمی

میرزا صاحب آگرے میں ۸ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو پیدا ہوئے[1]۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں ۱۸۰۲ء میں راج گڑھ کی جنگ میں گولی کھا کر انتقال کر گئے، تو چچا نے اپنا بیٹا بنا لیا اور بڑے ناز و نعمت سے ان کی پرورش شروع کر دی۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں:

"در پنج سالگی پدرم عبداللہ بیگ خاں بہادر را ... چراغ زندگی فرو مرد
گرامی آذر درین ... مرا بپسر خواندہ و بناز پرورد"[2]

نسبی خاندان۔ چچا

میرزا صاحب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں بہادر چار سو سواروں کے رسالے کے افسر تھے۔ انھوں نے جنرل لارڈ لیک بہادر کے ماتحت گرانقدر فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ جب سنہ ۱۸۰۵ء میں سونک سونسا (متصل آگرہ) کا پرگنہ انگریزی قبضہ و تصرف میں آیا[3] تو لارڈ صاحب کی سفارش پر حکومت نے یہ پرگنہ تاحینِ حیات اُن کی جاگیر میں دے دیا۔ ابھی اس عطیے سے اچھی طرح فائدہ اٹھانے نہ پائے تھے کہ سنہ ۱۸۰۶ء میں نصر اللہ بیگ خاں کا یکایک انتقال ہو گیا۔ گورنمنٹ نے جاگیر واپس لے کر اُن کے ورثا کی پنشن مقرر کر دی۔ میرزا صاحب کو یہ پنشن ابتداءً ریاستِ فیروز پور جھرکہ کے خزانے سے اور بعد ازاں مدت تک خزانہ کلکٹری دہلی سے ملتا رہا۔ خود فرماتے ہیں:

۱۔ مکاتیب: ۱۸۷؛ اردوی: ۳۹۹؛ عود: ۶۹ (۲)؛ دستنبو: ۲۴۔ میرزا صاحب نے ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء کو لکھا ہے: "میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یا شہر خوقند میں ہوں تو ہوں ... پانچ برس کی عمر سے الفت کے دام میں اسیر ہوں ۶۱ برس ستم اٹھاتے ہیں" (خطوط: ۱: ۱۰۲)۔ ان باتوں ... پانچ برس کی عمر میں چچا اور چچی کی پرورش میں آنے کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ ان کی چچی نواب احمد بخش خاں کی حقیقی بہن تھیں اس لیے میرزا صاحب کی بیوی کی حقیقی پھوپھی اور ان کی چچی میں شامل ہوئیں ... ۳۔ تاریخ سلطنت انگلشیہ: ۸۸ طبع مراد آباد سنہ ۱۸۶۷ء خود میرزا صاحب نے یہ بتایا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے زورِ بازو سے سونک سونسا کے پرگنے بھرت پور کے راجہ کے سواروں سے چھینے تھے۔ جرنیل صاحب نے دونوں پرگنے خان موصوف کو بطریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر جاگیر مقرر ہونے کے ... بعد ... ہاتھی پر سے گر کر مر گئے۔ جاگیر سرکار میں باز یافت ہوئی اور اس کے عوض نقد ... مقرر ہوئی ... ۱۴ جمادی ...

"عالی رای جہان آرا جلی باد کہ بر بینہ نمک خوار سرکار انگریزم۔ واز سر آغاز سالِ یکہزار و ہشت صد و شش کہ دراں گاہ شمار سنین عمرِ من از دہ نگزشتہ بود، بعوضِ جاگیرِ عمِ حقیقی نسبی خود، نصر اللہ بیگ خان بہادر کہ با جمعیت رسالہ چہار صد سوار بمعیتِ جرنیل لارڈ لیک بہادر در فتح ہندوستان کوششہای شایان کردہ، و پرگنہ سونک سونسا بقید حین حیات جاگیر یافتہ، و ہم دراں عہد بمرگِ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوری گورنمنٹ مشتِ زرِ ی شاملِ جاگیرِ عمم سپس نواب احمد بخش خان بہادر، در وجہ معاش من بجملہ زرِ استمراری سرکاری کہ بذمۂ احمد بخش خان بہر دوام دا جب الادا بود، قرار یافت۔"[1]

چچا کے انتقال کے بعد میرزا صاحب کے سرپرست ان کے نانا خواجہ غلام حسین خان کمیدان رہے، جو آگرے کے ایک عالی خاندان رئیس تھے۔[2]

حقیقی بھائی

میرزا صاحب تین بھائی بہن تھے۔ ان میں بہن، چھوٹی خانم ان سے بڑی اور بھائی میرزا یوسف بیگ خاں، چھوٹے تھے۔ بھائی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال، اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔"[3]

میرزا یوسف بیگ خاں نے ۱۹ صفر سنہ ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر سنہ ۱۸۵۷ء) کو بحالتِ دیوانگی دلّی میں انتقال کیا۔[4]

سبھی خاندان۔ بی بی

میرزا صاحب کی بی بی امراؤ بیگم، نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خاں، والیٔ فیروز پور جھرکہ و جاگیردارِ لوہارو کی، بھتیجی تھیں۔ ۸ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو میرزا صاحب کے عقد میں آئیں، اور ان کے

۱۔ مکاتیب: ۸ (۲) یادگارِ غالب: ۱۰، غالب ۲۲ بحوالہ اردوئے معلی (۳) مکاتیب: ۱۸

۲۔ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۳۹۹

بعد تک زندہ رہیں۔ نواب فردوس مکاں کی مزاج پرسی کے ایک خط[۱] میں مرزا صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر۔۔ کیا گزر رہی ہے!"

مرزا صاحب کے انتقال کے بعد، امراؤ بیگم نے اپنی مالی مصیبت کا سارا کچا چٹھا لکھ کر کمشنرِ دہلی سے درخواست کی تھی کہ مرزا صاحب کی پنشن حسین علی خاں پسرِ متبنّیٰ کے اور میرے نام منتقل کر دیجائے۔ ڈپٹی کمشنر کی ہمدردانہ رپورٹ کے باوجود کمشنرِ دہلی نے جواب دیا کہ متبنّیٰ بیٹے کے نام پنشن کسی طرح جاری نہیں ہو سکتی۔ البتہ بیوہ کچہری میں حاضر ہو، تو اُس کے نام دس رُپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جائیگا اس باغیرت بی بی نے کچہری کی حاضری کو گوارا نہ کیا، اور دس رُپیے ماہوار کے وظیفے سے انکار کر دیا۔

حسین علی خاں نے ۱۲ جون سنہ ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا۔ اُس میں مرزا صاحب کے قرض کی ادائگی کی درخواست اور اپنے حاضر نہ ہو سکنے کے عذر کے بعد، بیگم غالب کی درخواست پنشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پنشن سرکارِ انگریزی کی یہ صورت ہوئی کہ ہنگامِ ثبوت و تحقیقِ مفلسی دبقیہ ورثا و قرضداری ڈپٹی کمشنر صاحب نے رپورٹ اچھی کی۔ اُس پر کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ پسرِ متبنّیٰ کی پنشن نہیں ہو سکتی۔ ہاں، زوجہ کے واسطے مبلغ دس روپیے تجویز ہوں گے۔ جناب دادی صاحبہ نے دس روپیے نامنظور کیے۔ یا امید بھی باقی رہی۔"[۲]

اس عرضی کے آخر میں، بیگم صاحبہ کی طرف سے لکھا گیا تھا:[۳]

"اور جانب امراؤ بیگم (سے) بعدِ کورنش تو بعد نمود ولی عرضی ہذا گزارش ہے۔

۱- مکاتیب ۲۶ [illegible] نقل) ۱۷۵ء صفحۂ احباب[۱] محمد نواب خلد آشیاں محافظ خانہ دارالانشا۔

۳- امراؤ بیگم کی یہ تحریریں ان کی دستخطی نہیں، حسین علی خاں کے قلم کی معلوم ہوتی ہیں۔

کنیز بیوہ اول بعمر ہفتاد سالہ مرتعش و نقلِ مکان سے معذور، اور سوائے اُس کے
صدمۂ انتقالِ شوہر اور ہجومِ قرض خواہان سے اور معیشتِ آئندہ سے مجبور، باہر
ہمہ بسبب عدت کے نامانے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ بدیں وجوہ مانعِ حضوری ہے
اور سوائے دیرِ دولت کے کوئی ملجا و ماوا نظر نہیں آتا، حضور کو دستگیری مجھ
بیکسہ عاجزہ کی واجب ہے۔ اور یہ ارادہ ہے کہ بعد انقضائے مدتِ عدت
خدمت میں حاضر ہوں، اور وہیں انفاسِ بقیہ کو گزاروں۔ اب نانِ شبینہ کو
محتاج ہوں۔ چارہ اس کا بجز بندگانِ عالی کے ممکن نہیں۔ رحم فرمائیے
اور خبرگیری کیجیے، کہ بدعاگوئی دولتِ ابد مدت مشغول رہوں۔
مہر: امراؤ بیگم بنتِ الٰہی بخش خاں - ۱۲۴۱"

۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ اگست سنہ ۱۸۶۹ء) کو بیگم صاحبہ نے
پھر نواب خلد آشیاں کو لکھا:

"جنابِ عالی، جس روز سے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے وفات پائی ہے
تو یہ عاجزہ بیوہ اس قدر مصائب میں گرفتار ہے کہ تحریر سے باہر ہے۔ اول
تو یہ مصیبت ہے کہ مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپیے کے قرضدار مرے۔ دوسری
مصیبت یہ کہ پنشنِ انگریزی مسدود ہوئی۔ تیسری یہ کہ تنخواہ سو روپیے ماہوار،
جو آپ از راہ قدردانی کے مرزا مرحوم کو ارسال فرماتے تھے، وہ بھی یکلخت
موقوف ہوئی۔ اب تک قرض لیکر اوقات بسری کی۔ اب قرض بھی نہیں ملتا
نوبت فاقہ کشی کی پہنچی۔ اس حالتِ حیرانی اور پریشانی میں پھر یہی خیال آیا
کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا وسیلہ پرورش اور اوقات گزاری کا اس دنیا میں
آپ کی ذاتِ بابرکات کو بنایا ہے، اور سوائے آپ کی ذاتِ بابرکات
کے دوسرا کوئی نظر نہ آیا۔ لاچار برخوردار حسین علی خاں کو آپ کے
قدموں پر لا ڈالا۔ آپ نے بسبب شرفا پروری اور اقتضائے مروت اور
فتوت کے اُس قدر اوپر حال برخوردار کے عنایت فرمائی ہے کہ بیان سے

باہر ہے۔ اب دعاگو کی یہ تمنا ہے کہ ایسی پرورش مجھ ضعیفہ کی ہو جائے کہ مرزا مرحوم حق عباد سے بری ہو جائیں، کہ یہ سخت عذاب ہے۔ اگر حضور صورتِ ادای قرض فرما دیں، تو کمالِ ثوابِ عظیم ہوگا۔ اور اگر دفعۃً صورتِ ادای قرض مناسب رای بیضاضیا کے نہو، تو یہ تنخواہ ششماہ کی بحساب فی ماہ صد روپیہ بالفعل مجھ بیوہ کو عنایت ہو جاسے۔ باقی ۱۰۲ اور بجا بیہ مذکورۂ بالا مرحمت ہو جائیں، تاکہ میں بیوہ قرض مرزا صاحب کا ادا کر دوں اور ظاہر ایقین ہے کہ زندگی میری بھی اسی مہیاد میں پوری ہو جائے گی۔ اور یہ احسان کرنا مجھ پر فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ میں بیوہ ضعیفہ اور بیکس ہوں۔ اتنی عنایت سے آپ کی زندگی میری بسر ہو جائے گی۔ اور پنشن میری دس روپے انگریز کرتا ہے، بشرطِ اینکہ کچہری میں حاضر ہوں۔ اور جانا میرا کچہری میں ہرگز نہ ہوگا، گو فاقوں سے مر جاؤں۔ کیا میں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کر دوں؟ اور جو عزت اور ریاست میرے چچا کی اور حرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص و عام کے تھی، حضور پر سب روشن ہے۔ حاجت بیان کی نہیں ہے۔[1]

اس عریضے پر بھی سرکار نے کوئی حکم نہ دیا، تو ۴ جمادی الاولی سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ دسمبر ۱۸۶۹ء) کو بیگم صاحبہ نے مکرر درخواستِ پرورش پیش کی۔[2] اس کا مضمون تقریباً سابق درخواست کے مطابق ہے، اس لیے اعادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس عرضی کے لفافے پر میر منشی صاحب کا یہ نوٹ ہے:

"پیش نمودہ شد۔ حکم نفاذ یافت کہ درین خصوص بہ نواب مرزا خان فہمایش و ہدایت بعمل آمدہ۔ ۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۹ء"۔

۱۔ مثل ۲۵۴، صیغۂ مذکورہ۔ ذکر غالب (ص ۷۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی انگریزی پنشن کے بارے میں کوشش جاری رہی، تاآنکہ فروری ۱۸۷۰ء سے قبل اجرای پنشن کا حکم آ گیا، مگر ابھی اس کے لینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ (۲) مثل ۲۳۶، صیغۂ مذکورہ۔

غالباً یہ ہدایت مزید تحقیق و تصدیق کے متعلق ہو گی؛ اس لیے کہ اس نوٹ کے
ایک مہینہ اور اکیس دن کے بعد ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کو سرکار نے ادائی قرض کا
حکم دے دیا اور اس حکم پر ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۹ء کو ۶ سو روپے کی ہنڈی رام کشن داس
کی دکان سے حکیم غلام نجف خاں کی معرفت میرزا صاحب کی بیوی کو بھیج دی گئی۔[1]
اس کے بعد بیگم غالب کی ایک اور درخواست شعبان سنہ ۱۲۸۶ھ (نومبر ۱۸۶۹ء)
میں آئی تھی۔ مثل میں صرف لفافہ شامل ہے۔ اس بنا پر مضمونِ عرضی کے متعلق
صرف قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ ادائی قرض کے شکریے پر مشتمل ہو گی۔

امراؤ بیگم نے نواب خلد آشیاں کو جو پیشین گوئی لکھی تھی، وہ تقریباً سچی نکلی؛
یعنی میرزا صاحب کی برسی کے دن ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۶ھ (۴ فروری ۱۸۷۰ء)
کو ان کا انتقال ہو گیا۔[2]

بی بی کے چچا اور بھائی

نواب احمد بخش خاں بہادر، والیِ فیروز پور جھرکہ و جاگیردارِ لوہارو، میرزا
صاحب کی بی بی کے حقیقی چچا تھے۔ حکومتِ انگریزی میں اُن کی بڑی عزت اور
منزلت تھی۔ آخر سنہ ۱۸۲۲ء میں اپنے بڑے بیٹے، نواب شمس الدین احمد خاں کو
فیروز پور کی حکومت اور نواب امین الدین احمد خاں بہادر اور نواب ضیاء الدین
احمد خاں بہادر نیّر کو لوہارو کی جاگیر دے کر خود اپنی حویلی واقع قطب صاحب میں
گوشہ گیر ہو گئے تھے۔[3] نواب شمس الدین احمد خاں، جو میواتن کے بطن سے تھے،
اپنے مختلف البطن بھائیوں سے خوشگوار تعلقات نہ رکھ سکے۔ خاندان کے
دوسرے افراد بھی غالباً اپنی نسبی برتری کا مظاہرہ کرتے ہوں گے، جن میں میرزا
صاحب کو نمایاں ہونا چاہیے۔ شاید یہی باعث تھا کہ ان سے بھی تعلقات اچھے
نہ تھے۔ جب اُنھیں ولیم فریزر، ریذیڈنٹ دہلی، کے قتل کے الزام میں پھانسی
دی گئی، تو میرزا صاحب نے اسے کیفرِ کردار قرار دیا۔ چنانچہ اپنی سرگزشت میں

۱۔ آوارجہ آمد و صرف ریاست سنہ ۱۸۶۹ء (۲) ذکرِ غالب: ۷۵، (۳) غالب: ۴۵؛ تحفۂ : ذکرِ خستاں۔

اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوری گورنمنٹ ششصد (روپیہ) سالانہ از جاگیر
عم سببی من، نواب احمد بخش خاں بہادر، در وجہ معاشِ من قرار یافت۔ چون
جانشینِ احمد بخش خاں کیفرِ کردار یافت و جاگیر بسرکار باز یافت شد، رسیدن
آن وجہ مقرری از خزانۂ کلکٹری دہلی صورت پذیرفت"[1]

نواب احمد بخش خاں نے ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں اس دارِ
فانی سے کوچ کیا، اور نواب شمس الدین احمد خاں بہادر کو ۸ اکتوبر سنہ ۱۸۳۵ء
کو صبح کے وقت کشمیری دروازے کے باہر پھانسی پہ لٹکا دیا گیا۔[2]

بی بی کے پوتے، باقر علی خاں

امراؤ بیگم کے سات بچے ہوئے، لیکن کسی نے پندرہ مہینے سے زیادہ عمر
نہ پائی۔ نواب زین العابدین خاں عارفؔ امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے، اور میرزا
صاحب کے شاگردِ رشید، سنہ ۱۸۵۲ء میں دو خرد سال بچے چھوڑ کر انتقال
کر گئے۔ میرزا صاحب نے ان دونوں کو متبنیٰ کر لیا۔ خود فرماتے ہیں:

"کمابیش پنج سالست کہ دو کودک بی مادر و بی پدر سہم از دودۂ آن زن کہ
خونِ منش بگردن، بفرزندی برداشتہ ام"[3]

ان میں بڑے باقر علی خاں تھے، جو والد کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ
تک اپنی دادی، بنیادی بیگم کے پاس رہ کر ان کے بعد میرزا صاحب کے یہاں
چلے آئے تھے۔

میرزا صاحب اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء میں درد قولنج میں مبتلا ہوئے، سخت
کمزور ہو گئے تھے، جس کا ۱۱ نومبر ۱۸۶۱ء کے عریضے میں ذکر بھی کیا ہے۔ اپنی
بیماری کے پیشِ نظر معفول نے نواب فردوس مکاں سے درخواست کی کہ
میرے بیٹے کے لیے تنخواہ مقرر کر دی جائے۔ سرکار نے ۲۳ اپریل سنہ ۱۸۶۲ء کو
اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

۱- مکاتیب: ۸ (۲) ذکرِ غالب: ۲۷، ۳۰ نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ۹ مکاتیب (۳) دستنبو: ۳۸

"ہر چند مخلص را پرورش و مراعاتِ صاحبزادۂ آن کرم فرما بدل ملحوظ و مرکوز؛ الا دستور این سرکار بعنوانِ مرقومہ سامی نبودہ است۔" ۱

اس سے صاحبزادے کا نام نہیں معلوم ہوتا؛ مگر قیاس یہ ہے کہ باقر علی خاں مراد ہیں، جن کی عمر اُس وقت چودہ سال کی تھی۔

میرزا صاحب نے باقر علی خاں کی پرورش کی، پڑھایا لکھایا، اور جب جوان ہو گئے تو ڈھائی ہزار روپے لگا کر نواب ضیاء الدین خاں بہادر کی صاحبزادی سے شادی کر دی۔ نواب خلد آشیاں کو شادی کے مصارف کے متعلق لکھا ہے:

"باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ اُنھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپیہ دیے؛ اور میری زوجہ نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو روپے صرف کیے۔" ۲

باقر علی خاں شاعر تھے، اور کامل تخلص کرتے تھے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک شاگردِ غالب، سے مشورۂ سخن تھا۔ ۲۹ ویں برس میں یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۳ھ (۲۵ مئی ۱۸۷۶ء) کو اُنھوں نے انتقال کیا۔ ۳

حسین علی خاں

عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خاں تھے میرزا صاحب نے فردوس مکاں کی مزاج پرسی کے پہلے خط میں اُن کو اپنا فرزند لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے؛ عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔" ۴

خود حسین علی خاں نے بھی نواب خلد آشیاں کی خدمت میں ۱۲ جون ۱۸۶۹ء کو جو عریضہ تحریر کیا تھا، اُس میں اپنے نام کے بعد "پسر متبنٰی مرزا اسد اللہ خاں

۱۔ مثل نمبر ۴۔ ۲۔ صحیفۂ احباب؛ عہدِ فردوس مکاں؛ میرزا صاحب کا خط مثل میں محفوظ نہیں ہے۔ (۲) مکاتیب: ۴

۳۔ تاریخ لطیف قلمی: ۱۹۱۔ دیوان سالک: ۲۹۳، ذکرِ غالب: ۷۲۔ وفیات دہلی (۴) مکاتیب: ۲۷

غالب' لکھاہے۔ اسی عریضے میں یہ بھی درج ہے کہ گورنر نے پسرِ متبنیٰ کے نام میرزا صاحب کی پنشن جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا مذکورۂ بالا حاکم کی عدالت میں بھی حسین علی خاں کو میرزا صاحب کا متبنیٰ ظاہر کیا گیا تھا۔

میرزا صاحب نے آغازِ سنہ ۶۶ء میں نواب خلد آشیاں سے ان کی تنخواہ کی استدعا کی تھی۔ مگر یہاں سے خلافِ مدعا جواب دیا گیا۔[1] پھر ۱۹ اگست ۱۸۶۶ء کو اُن کی منگنی کے بارے میں لکھا:

"آپ کے غلامِ زرخرید یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی، اور اپنے کنبے میں ہوئی یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے، اور رجب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ ہے۔"[2]

سرکار نے جواباً تحریر فرمایا کہ آپ کی تحریر مجمل ہے "خلاصۂ مکنونِ خاطر" تحریر فرمائیے۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے[3] ۵ ستمبر کو لکھا:

"مجملاً یہ کہ میں درِ دولت کا گدای خاک نشین اور وہ آپ کا غلام۔ تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک، اور میرے گھر میں زیورِ زرینہ و سیمینہ کا نام و نشان نہیں۔ ہنبت اُدھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں، تا یہ کام سرانجام پائے، اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔ دوسری بات یہ کہ سو روپیے آپ کی سرکار سے بطریقِ خیرات اور باسٹھ روپیے آٹھ آنے مہینا انگریزی سرکار سے بعوض جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ حسین علی خاں کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جائے۔ لیکن توقیعِ تنخواہ اُس کے نام جاری نہ ہو، بلکہ اُس کی زوجہ، حسن جہاں بیگم بنت اکبر علی خاں، کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو، اور اُس کی مہری رسید سے ملا کرے۔

۱۔ مکاتیب: ۵۰ (۲) ایضاً: ۶۲

زرِ مصرفِ شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار جو خداوند کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت "۱

سرکار نے ارقام فرمایا کہ مابدولت کو بربنائے مؤانست و اتحادِ قدیمہ آپ کی خوشنودیٔ خاطر مدِّ نظر ہے۔ آپ مصارف کی مقدار لکھیئے تاکہ حکم مناسب دیا جائے۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۲۳ ستمبر کو تحریر کیا:

"باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ انھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپیے دیے اور میری زوجہ نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو روپیے صرف کیے۔ حسین علی خاں کا سسرا، یعنی اکبر علی خاں، اپنے خاندان کا ہے۔ لیکن امیر نہیں، نوکری پیشہ ہے۔ اب یہ میں کیونکر عرض کردوں کہ مجھے کیا دو؟ سائل ہوں، یہ رسم نہیں کہ سائل مقدار سوال عرض کرے حالِ مصارفِ شادیٔ خاندان لکھ دیا۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرا حق خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دوگے اس میں شادی کردوں گا" ۲

سوءِ اتفاق سے اکتوبر میں سرکار کا مزاج ناساز رہا۔ اور میرزا صاحب یاددہانی نہ کر سکے۔ البتہ زمین ہموار کرنے کے خیال سے ایک مدحیہ قطعہ ۳ نومبر کو ارسال کر دیا تھا۔ اس پر بھی کار برآری نہ ہوئی اور رجب کی ۱۷ تاریخ آ پہنچی تو ہنڈوی کی رسید میں قرض کا دکھڑا رو کر لکھا:

"پیر و مرشد، رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا تقاضا ہے۔ ادھر سے جز سکوت جواب نہیں" ۳

اِس عریضے کا سرکار کی جانب سے کوئی جواب نہ گیا، اور رجب میں شادی ملتوی ہوگئی، میرزا صاحب نے ۲ رمضان سنہ ۱۲۸۴ھ (۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ء) کو تحریر کیا:

۱۔ مکاتیب: ۳۰، (۲) ایضاً: ۴۷، (۳) ایضاً: ۷۷

"ماہِ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے اور اس بڈھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسمِ نکاح عمل میں آئے۔ اور چونکہ اس ماہِ مبارک میں درِ فیض باز اور سالِ انگریزی کا بھی آغاز ہے، وہ چھپن روپیہ مہینا، جو زبانِ مبارک سے نکلا ہے، جنوری سنہ ۱۸۶۸ء سے بنامِ حسین علی خاں مذکور جاری ہو جائے، تو مجھے گویا دونوں جہان مل گئے۔"(۱)

لیکن جواب کے انتظار میں ذیقعدہ آپہنچا، تو میرزا صاحب نے ۹ مارچ سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا:

"مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عطیۂ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے تو آخرِ ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے، خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائے گا، تو اس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا! غرض اس سے یہ کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔"(۲)

سرکار نے یہ درخواست منظور فرمالی، اور آمدِ زمستاں تک شادی سے فراغت کی امید ہو گئی۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی، اور حکیم مظفر حسین خاں بہادر لکھنوی نے علی الترتیب میرزا صاحب کو قبولِ التماس کی اطلاع دی۔ اس کی توثیق، نیز مکرر یاد دہانی کی خاطر میرزا صاحب نے ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا:

"تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں۔ سو اب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے ان خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ انشاء اللہ الکریم حسبِ ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ میں، آمدِ زمستاں یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض بھی ادا

(۱) مکاتیب: ۷۸ (۲) ایضاً: ۷۹

ہو جائے گا، اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی، اور اُس کے واسطے
اُس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائے گی۔" ۱

اس عرصے میں حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا سخت تقاضا شروع ہو گیا۔ میرزا صاحب نے مجبور ہو کر ۷ ستمبر کو پھر عرض کیا :

"پیر و مرشد، حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ بطریقِ "شیئاً للہ" سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے، وہ عطا کیجیے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجیے؛ لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں۔" ۲

سرکار نے ابھی اس کا جواب تحریر نہیں فرمایا تھا کہ میرزا صاحب پر قرضخواہوں کا تقاضا ہونے لگا، اور شادی کی خوشی کے حصول سے قبل قرض کے غم کا رفع کرنا ضروری ہو گیا۔ ادای قرض کی سبیل صرف سرکارِ رامپور کا عطیہ تھا۔ بنا بریں ۱۶ نومبر کو میرزا صاحب نے بحالتِ اضطرار لکھا :

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے ۵۴ روپیے بچے۔ ۶۳ روپیے کا چٹھا ماہوار کا، سود سہ ماہہ دینا، پچھلا آٹھ سو روپیے ہوں، تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اُس کے نام کی تنخواہ سے قطعِ نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال، کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپیے مجھ کو اور دیجیے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔" ۳

میرزا صاحب مرتے دم تک اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ آخری عریضے میں بھی، جو ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۹ء کو تحریر کیا تھا، حسین علی خاں کی شادی کا ذکر نہیں کیا، اور یہ ارمان ساتھ لے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حسین علی خاں نے اُن کے انتقال کے ایک مہینے بعد ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء

۱۔ مکاتیب : ۸۱ (۲) ایضاً : ۸۲ (۳) ایضاً : ۸۳ (۴) ایضاً : ۸۴

کو اپنے تقررِ تنخواہ کی درخواست بھیجی۔ بعد ازاں ۱۲ جون کے عریضے میں پھر اپنی خواہش وظیفہ کا اعادہ کیا، اور یہ بھی عرض کیا کہ فدوی بیمار رہے، اس لیے حاضرِ خدمت نہیں ہو سکتا۔ صحت کے بعد قدمبوسی کی سعادت حاصل کرے گا۔

امراؤ بیگم کے ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ اگست سنہ ۱۸۶۹ء) کے محولۂ بالا عریضے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت تک حسین علی خاں ملازم ہو چکے تھے لیکن ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ حسین علی خاں نے رامپور سے دلّی واپس جا کر ۱۲ فروری سنہ ۱۸۷۰ء کو ایک خط منشی سیلچند صاحب کو لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی خاں اگست سنہ ۱۸۶۹ء کے بعد رامپور آ کر فروری ۱۸۷۰ء میں میرزا صاحب کی برسی کی فاتحہ کے لیے رخصت لے کر دلّی گئے، تو سسرال والوں نے شادی کا تقاضا کیا۔ چونکہ سرکارِ رامپور سے تیس روپیے ماہوار اُن کی تنخواہ مقرر ہوئی تھی، اور ملازمت پر صرف ۶ مہینے گزرنے کے باعث کچھ پس انداز ہو نہ سکا تھا، اس لیے جداگانہ عریضے میں سرکار سے مصارفِ شادی عطا فرمانے کی درخواست کی تھی، اور منشی صاحب سے خواہش کی تھی کہ اس کام میں کوشش کریں۔ "یقین تو ہے کہ حضور، دام اقبالہٗ، ہیں رحم فرما کر کچھ عنایت فرمائیں گے۔ آگے مقدر۔"

اس کے بعد شادی سے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ سنہ ۱۸۷۰ء میں حسین علی خاں کی شادی ہوئی، تو ریاست کی طرف سے اُن کی کچھ مدد کی گئی یا نہیں۔

حسین علی خاں بھی شاعر تھے، اور فارسی میں خیالی اور اُردو میں شاداں تخلص کرتے تھے۔[1] انھوں نے تیسویں سال میں یکم شوال ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) کو انتقال کیا۔ "شادانِ فرخ نہاد" مادۂ تاریخ ہے۔[2] اُن کا مختصر سا دیوان، چند سال ہوئے، کتاب خانے کے ردّی گھر میں دستیاب ہوا ہے۔ کچھ منتخب کلام خمخانۂ جاوید

۱۔ فغانِ دہلی میں حسین علی خاں کا تخلص راقم لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شاداں تخلص بعد اختیار کیا تھا۔ (۲) انتخابِ یادگار: ۲۷ و ۱۷۶؛ "تاریخ لطیف": ۱۵۲؛ ذکرِ غالب: ۷۴۔ یہاں ۱۲۹۸ھ سالِ وفات درج ہے۔

ہیں اور ایک شعر فغانِ دہلی میں بھی درج ہے۔

تعلیم عربی و فارسی

میرزا صاحب نے خلیفہ معظم سے، جو آگرے کے جگت استاد تھے عربی کی ابتدائی اور فارسی کی مروجہ تعلیم حاصل کی تھی۱۔ لیکن زبانِ فارسی سے طبعی لگاؤ، ذوقِ سلیم اور قدیم و جدید فارسی کے عمیق مطالعے نے انھیں نغز گو شاعر اور دیدہ ور ادیب بنا دیا۔

اپنی فارسی دانی کے متعلق ایک عریضے میں فرماتے ہیں:

"بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے، بحث کا طریقہ یاد نہیں"۲

میرزا صاحب نے اس بزرگ کا نام عبدالصمد اور سالِ ورود ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۲/۱۸۱۱ء) بتایا ہے۳۔ لیکن برہانِ قاطع کے ادبی ہنگامے سے پہلے کسی جگہ اس علامۂ دہر استاد کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ بحالتِ جوانی کلکتے میں جو معرکہ پیش آیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مخالفین کے سامنے ایسے یکتا استاد سے استفادے کا اظہار کرتے۔ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں ملا عبدالصمد خود اُن کے اپنے ذہن کی پیداوار تو نہیں۔ خواجہ حالی نے۴ لکھا ہے کہ میرزا صاحب فرماتے تھے "مجھ کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ مجھ کو بے استاد کہتے تھے، اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے" اس بیان سے یہ شبہہ حدِ یقین کو پہنچ جاتا ہے۔

تصوف و فلسفہ

دلّی میں میرزا صاحب کا حلقۂ احباب مولانا فضلِ حق خیر آبادی جیسے فلسفی

(۱) یادگارِ غالب: ۱۳، غالب نامہ: ۷ (۲) غالب: ۲۸ (۳) مکاتیب: ۶۰ (۳) قاطع برہان: ۷ (۴) یادگارِ غالب: ۱۳

حکیم مومن خاں مرحوم جیسے نجومی، منشی صدرالدین خاں آزردہ جیسے فقیہہ، شاہ نصیرالدین عرف کالے صاحب جیسے صوفی بزرگواروں پر مشتمل تھا، اِس لیے مجلسی مذاکروں اور ذاتی مطالعے سے اُنھیں تصوف کے اُصولی مسائل کا ضروری علم حاصل ہو گیا تھا۔ اِدھر احباب اور شاگردوں میں چند طبیب شامل تھے، اور خود اُن کی عمر کا خاصا حصّہ بھی گوناگوں امراض میں گزرا۔ ان اسباب نے طب سے خاطر خواہ واقفیت کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں جابجا ان علوم کی اصطلاحوں کا عالمانہ طور پر ذکر آیا ہے۔ زیرِ نظر مکاتیب میں بھی ایک کے اندر اصطلاحاتِ علمِ نجوم اور دوسرے میں طبّی تجربے کا ذکر ہے[1]۔ اسی طرح نواب خلد آشیاں کے جشنِ جلوس کے موقع پر جو نثر لکھ کر پیش کی تھی، اُس میں بھی منجمانہ پردازِ بیان نمایاں ہے[2]۔

وطن اور سکونتِ دہلی

میرزا صاحب کا وطن اکبرآباد (آگرہ) ہے۔ اپنے ایرانی اُستاد کے ذکر میں نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے:

"اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔"

لیکن شادی کے بعد ترکِ وطن کر کے دلّی میں آ بسے تھے۔ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۲ء کو لکھتے ہیں:

"میں باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں۔"[3]

اس حساب سے اُن کا دلّی میں قیام سنہ ۱۸۱۳ء یا سنہ ۱۸۱۴ء سے ہونا چاہیے۔ دلّی میں میرزا صاحب کا آبائی مکان نہ تھا، اس لیے بیشتر کرایے کے مکانوں میں رہے۔ ان میں سے دو کا ذکر ۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے عریضے میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"دبیرانِ خاص بعنوانِ نامہ ہای بشیبن نشانِ کاپیٔ این دردلیش دلریش

۱۔ مکاتیب: ۱۶ (۲) ۴۵ (۲) کلیاتِ نثرِ فارسی: ۹۱۱ (۳) مکاتیب: ۵۷

عقب مسجد جامع نشستہ اند ومن از ہفت ہشت سال در محلۂ بلی ماران می مانم"۱

مسکن کے حالات

جس زمانے میں میرزا صاحب دلّی تشریف لائے وہ اس جہان آباد کی پیرانہ سالی کا عہد تھا، تاہم آثارِ شگفتگی و آبادانی ہر طرف ہویدا تھے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء نے شہر کی بچی کھچی دولت لوٹ کر تیاسکہ چلا دیا۔ عمارات گرا کر سڑکیں بچھائی گئیں، شہر اجاڑ کر قبرستان آباد کیے گئے اور اہلِ شہر کو شہر بدر کر کے شہر میں فوج کا پڑاؤ ڈالا گیا، تو دلّی دلّی نہ رہی، کمپ ہو گئی۔ ایک بار نواب فردوس مکاں کو چوب چینی کی ضرورت پیش آئی۔ شہرِ دہلی اطبّا اور عطاروں کا مخزن تھا۔ سرکار نے میرزا صاحب سے فرمائش کی۔ اس کے جواب میں ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کو تحریر کرتے ہیں:

"دلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطرافِ شہر کے رؤسا"۲

۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو کاتبوں کے فقدان کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں"۳

خشک سالی

سنہ ۱۸۶۵ء میں دلّی بارانِ رحمت کے فیض سے محروم رہی۔ جولائی بھری برسات کا مہینا ہے، لیکن شہرِ دہلی کے اندر اس زمانے میں بھی لو چلتی رہی۔ میرزا صاحب نے ۲۳ جولائی کے عریضے میں دلّی کی محرومی کا رونا ان لفظوں میں رویا:

"یہاں خلق کو مینہ درکار ہے، اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز

۱۔ مکاتیب: ۱۰ (۲) ایضاً: ۳۰ (۳) ایضاً: ۵۸

ہوا جانستان، امراض مختلفہ کا ہجوم یہاں تہاں۔ جز اعضای انسان
کے کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں۔ یا گویلیق ہے
یا مطلق ہوا نہیں۔" ۱
۱۱ اگست کو پھر لکھا:
"یہاں مینہ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصلِ فصلِ
ربیع سے ہاتھ دھولیں۔" ۲

برسات

لیکن آیندہ سال بارش نے سنہ ۶۵ء کی قلتِ باران کی تلافی کر دی،
اور شہر میں اس قدر پانی برسا کہ گزشتہ باون ترپن برس سے ایسا نہ برسا تھا
یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو میرزا صاحب نے لکھا ہے:
"برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں،
عرش آرامگاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی، یا امسال
نظر آئی ہے۔" ۳

عقائد

ایک عریضے سے میرزا صاحب کے عقائدِ اسلامی پر اجمالی روشنی پڑتی
ہے۔ فرماتے ہیں:
"اگرچہ فاسق و فاجر ہوں، مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا
بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔" ۴
میرزا صاحب کا خاندان سنی عقیدے کا تھا۔ لیکن وہ خود توحید و
رسالت کے بعد امامت کے بھی قائل تھے، اور اس طرف ان کا رجحان
بچپن ہی سے تھا۔ حضرت عباس علمدار کی منقبت میں اُن کا ایک

۱۔ مکاتیب: ۳۹ (۲) ایضاً: ۴۰ (۳) ایضاً: ۵۷ (۴) ایضاً: ۶۱

فارسی قصیدہ ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:[۱]

انکو دکیم در ہیں دلا ی تو ر دانست دانی خود از بن ہیچ کہ گفتم تتو کم را

منقبت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالی عنہ میں فرماتے ہیں:[۲]

کز تاکینہ از مہر بشناختم بکس غیر حیدر نہ پرداختم

جوانی ہمین در بستر بردہ ام شبی در خیالش سحر کردہ ام

بظاہر جب تک گھر میں تبدیل مذہب کے دواعی موجود نہ ہوں، کوئی بچہ از خود ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے بعید نہیں کہ میرزا صاحب کی ننھیال جہاں ان کی پرورش ہوئی تھی، شیعی عقیدہ رکھتی ہو۔

اخلاق و عادات

میرزا صاحب کے اخلاق و عادات اس عہد کے دنیا دار اور زمانہ فہم شرفا کے اخلاق و عادات کا نمونہ تھے۔ لغو گوئی سے پرہیز، ہمیشہ جھوٹ سے نفرت، احباب کی تکلیف سے رنج، خوشی سے راحت، چھوٹوں پر مہربانی اور بزرگوں کی خیر خواہی کا ثبوت ان کی زیر نظر تحریروں میں بھی ملتا ہے۔[۳]

قدما کا اعتراف

میرزا صاحب شعرای قدیم کے فنی مرتبے اور ان کے کلام سے استشہاد کو تسلیم کرتے تھے۔ نواب خلد آشیاں کو صراحتاً لکھا ہے:

"فقیر اشعار قدما کا معتقد، ان کے کلام کا عاشق ہے"۔[۴]

نیز خلیفہ احمد علی صاحب رامپوری کو دور متاخرین کے گل نوشگفتہ مولانا عرفی شیرازی کے متعلق لکھتے ہیں:

"قواعد زبان فارسی کا ماخذ توان حضرات کا کلام ہے۔۔۔۔ عرفی کی زبان سے

۱۔ کلیات نثر فارسی: ۲۰۸ (۲) ابر گہر بار: ۶۱، اکمل المطابع دہلی سنہ ۱۲۸۰ھ
۳۔ مرقع تیسیر: ۱۲، ۱۶، ۲۱، ۲۳، ۳۸، ۴۶، ۶۱ (۴) ایضاً: ۶۱

جو نکل جائے وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے اور ہم اس کے مقلد اور مطیع ہیں" ۱

ہندی شعرا اور فرہنگ نویسوں کا انکار

لیکن ہندی شعرائے فارسی گو اور ہندی فرہنگ نویسوں کے قائل نہ تھے، اور اس معاملے میں بڑی حد تک انصاف سے آگے نکل گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ حضرات اہلِ زبان کا کلام پڑھ کر محاورات و الفاظ کے معنے اپنے قیاس سے قائم کرتے ہیں، جو بھروسے کے قابل نہیں۔ نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے:

"میاں انجو جامعِ فرہنگِ جہانگیری، شیخ رشید راقمِ فرہنگِ رشیدی علمائے عجم میں سے نہیں، ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قند یا ہادی اِن کا، اِن کا قیاس، ٹیکچند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو، سبحان اللہ، ہندی بھی اور ہندو بھی" ۲

اِس عریضے کے جواب الجواب میں لکھتے ہیں:

"شعرائے ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی اور باہم جو اُن کی عقول میں اختلاف ہے، اُس میں کلام نہیں کرتا، اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں" ۳

بے تکلفی

مخلص احباب اور محسنوں سے تکلف برتنے کو نامزا جانتے تھے۔ نواب فردوس مکاں سے اُن کا تعلق سراسر اخلاق پر مبنی تھا۔ جب روپے کی ضرورت آپڑتی، بلا تکلف مانگ لیا کرتے تھے۔ اپنے اس رویے کو ایک خط میں ظاہر بھی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" جو آپ بن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں، اور جب مجھے حاجت

۱- مکاتیب: ۱۰۴ (۲) ایضاً: ۶۱ (۳) ایضاً: ۶۱

آپڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔"

قرض کی عادت

متموّل اور ذی عزت خاندان کا فرد ہونے کے سبب سے میرزا صاحب کے مصارف زیادہ تھے، اِس لیے انگریزی پنشن اور رامپور کا وظیفہ ملنے کے زمانے میں بھی اُنھیں قرض سے نجات نہ ملی، اور اس بارِ گراں سے سبکدوشی حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ سرکارِ رامپور سے امداد طلب کرتے رہے۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی تحریر ہیں، جو پنشن کی بندش کے زمانے میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال کی ہے، لکھتے ہیں:

"بارِ گرانِ غم سے پست ہوگیا ہوں، آ گئے تنگدست تھا، اب تہی دست ہوگیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجیے، اور کچھ بھجوا دیجیے۔"[۲]

اس کے بعد ۸ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو پھر لکھا ہے:

"سو روپیے کی ہنڈی ... پہنچی، اور روپیہ جلد ہی آیا، اور صرف ہوگیا، اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نکھوں تو کس سے کہوں اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیے مجھ کو اور بھیج دیجے گا، تو جلا لیجے گا، لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو، اور بہت جلد مرحمت ہو۔"[۳]

۲۴ اگست سنہ ۱۸۶۵ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں تحریر کیا ہے:

"ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار سرگرمِ تقاضا بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپیے کی ہنڈی صراحئ آبِ حیات ہوگئی، دامِ مرگ سے نجات ہوگئی۔"[۴]

ایک بار رامپور سے تنخواہ کی روانگی میں دیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے ۱۰ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو سرکار کی خدمت میں لکھا:

۱۔ مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً ۱۱ (۳) ایضاً: ۱۰۷ (۴) ایضاً ۴۵

"میرا حال یہ کہ انگریزی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسطیں جاتی ہے۔ حضور کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور غریب حسین علی خاں کا گزارا ہے۔ عالم جانتا ہے، جس طرح گزرتی ہے۔ چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔"[1]

۱۳ اگست کو پھر لکھتے ہیں:

"کل آخر روز میر منشیٔ حضور کا خط آیا۔ جون کی تنخواہ کی رسید نہ پہنچنے کی اطلاع پائی۔ تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا۔ اسی وقت عرضی لکھی۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا، مگر بھیجدی۔"[2]

۱۶ اکتوبر سنہ مذکورہ کے عریضے میں راحت کا انحصار قرض کی ادائیگی میں بتاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔"[3]

سرکار نے میرزا صاحب کا قرض ادا فرما دیا، تو ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو اس کے شکریے میں لکھتے ہیں:

"حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہوگیا۔ تنخواہ نے قسط سے اور میں نے رنج سے رہائی پائی۔"[4]

اگست سنہ ۱۸۶۸ء میں میرزا صاحب کے قرض کی ادائیگی کا سرکار نے پھر وعدہ فرمایا۔ اس وعدے سے میرزا صاحب کو جو مسرت ہوئی، اُس کا اندازہ ان الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے:

"تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں... اُن خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ انشاء اللہ الکریم حسبِ ارشاد حضور اسی برس ۶۸ء میں"

۱- مکاتیب: ۵۵ (۲) ایضاً: ۵۶ (۳) ایضاً: ۶۰ (۴) ایضاً: ۶۲

آمدِ زمستان، یعنی نومبر و دسمبر، میں میرا قرض ... ادا ہو جائے گا۔"[1]

۱۶ نومبر سنہ مذکورہ کو پھر لکھا:

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے ۵۴ روپیے بچے ..... مجملاً آٹھ سو روپیے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے، تو غنیمت ہے ... مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ اگر حضور جو عطا فرماتا ہے جلد ارشاد ہو۔"[2]

۱۷ دسمبر کو میرزا صاحب نے یاد دہانی کی، اور آخری خط میں اپنے اضطراب کو ان الفاظ سے ظاہر کیا:

"حضور، قرضخواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ بس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں۔ آگے حضرت مالک ہیں۔"[3]

لیکن ابھی یہاں سے رقم پہنچنے نہ پائی تھی کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔

ضعفِ پیری

میرزا صاحب نے سب سے پہلے یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء کے عریضے میں ضعفِ پیری کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"خدمت گزار ہوں اور دعا و ثنا میرا کام ہے۔ بڑھاپے نے کھو دیا۔ جز نفسے چند، مجھ میں کچھ باقی نہیں۔"[4]

قولنج

امراض کا شکوہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میرزا صاحب ابتدائً دردِ قولنج اور بعد ازاں بخار میں مبتلا ہو کر ایک ماہ تک امراض کی مصیبت جھیلتے رہے تھے۔ فرماتے ہیں:

"دعاگو ایک مہینا بھر سے بیمار رہے۔ ابتداء ہی قولنج دوری بسببِ استعمال

۱۔ مکاتیب: ۸۱ (۲) ایضاً: ۸۳ (۳) مکاتیب: ۸۴ (۴) ایضاً: ۱۵

اور یہ حارہ کہ اس مرض میں) اُس سے گریز نہیں، تپ نے آ گھیرا کبھی باریاں بھگتیں۔ اب دو باریاں ٹل گئی ہیں۔ لیکن طاقت بالکل سلب ہو گئی ہے، اور ضعفِ دماغ نے قریب ہلاکت پہنچا دیا ہے۔ بالفعل آبِ سیب کا استعمال ہے" ۱

امراضِ مختلفہ کا ہجوم

نواب خلد آشیاں کی دعوتِ قدومِ رامپور کے جواب میں ۱۸ جون ۱۸۶۵ء کو لکھتے ہیں:

"وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر ہے" ۲

۲۳ جولائی کو پھر تحریر کیا ہے:

"پانی جگر گداز، ہوا جانستان، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جاں ستاں" ۳

نیم مردہ

سنہ ۱۸۶۵ء میں، نواب سکندر زمانی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔ ایسے موقع پر میرزا صاحب کو "بزبانِ فارسی دعبارتِ بلیغ" تعزیت نامہ لکھنا چاہیے تھا، لیکن ضعفِ پیری مانع آیا، اور مرحوم نے ۱۸ ستمبر کو ازراہِ معذرت لکھا:

"اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف ہے" ۴

کوفتہ و رنجور

رامپور کے دوسرے سفر سے واپس ہوتے ہوئے میرزا صاحب مرادآباد پہنچکر بیمار ہو گئے تھے۔ نواب خلد آشیاں نے مزاج پرسی کی، تو اُس کے جواب میں ۲۱ جنوری سنہ ۶۶ء کو رودادِ سفر بیان کر کے لکھتے ہیں۔

"دو ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا پیر و ناتواں ہوں جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا" ۵

۱۔ مکاتیب: ۲۲ (۲) ایضاً: ۳۸ (۳) ایضاً: ۳۹ (۴) ایضاً: ۴۷ (۵) ایضاً: ۴۹

درد لیش کا حال

بعد ازاں ۱۵ فروری سنہ مذکورہ کو امراض کی تفصیل فرماتے ہیں:

"سامعہ مدت سے کھو بیٹھا تھا، اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا۔۔ فقدانِ طاقت، سقوطِ اشتہا، ضعفِ بصر، شدتِ سوزش ہے۔"[1]

نیم جان ہوں

اس سفر کی صعوبت اور عرضِ راہ کی بیماری نے میرزا صاحب کی رہی سہی صحت برباد کر دی، اور یہ اپنے آپ کو نیم جان سمجھنے لگے۔ چنانچہ ۹ مارچ کو لکھتے ہیں:

"اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتوان تھا، اور اب نیم جان ہوں۔ برخوردار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدے کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے، وہ مسموع و مقبول ہو۔"[2]

حواس درست نہیں

امراض اور مالی پریشانیوں نے میرزا صاحب کے حواس پر بھی کافی اثر اندازی کی تھی۔ ۱۱ اگست سنہ ۶۶ء کو تحریر کیا ہے:

"غم نے بشمول بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم، نہ حواس درست، نہ رائے صحیح! برسوں سے فکر دامنگیر میں مبتلا رہتے رہتے اب طاقت تحمل کی نہ رہی۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں، کیا کرنا چاہیے، کیا کرتا ہوں۔"[3]

۱۸ ستمبر کو اختلالِ حواس کے ساتھ بصارت کے فتور اور ہاتھ کے رعشے کا بھی ذکر کیا ہے۔[4]

امراضِ قدیم بڑھ گئے

اِس کے بعد ۱۳ مارچ سنہ ۶۷ء کو لکھتے ہیں:

۱۔ مکاتیب: ۵۰ (۲) ایضاً: ۵۱ (۳) ایضاً: ۵۶ (۴) ایضاً: ۵۸

"اس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراضِ قدیم بڑھ گئے۔ دورانِ سر اور رعشہ اور ضعفِ بصر تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی۔ ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے" [۱]

فرضِ محال

اس کے ایک مہینے بعد ۱۴ اپریل سنہ ۶۷ء کو نمائشِ باغ بےنظیر کی شرکت کی آرزو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"نمائش گاہِ سراسر سورِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے، میں وہاں نہیں! بالا خانے پر رہتا ہوں۔ اتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا، اور پالکی میں بٹھا دیا، کہار لے کر چلے، راہ میں نہ مرا اور رامپور پہنچ گیا کہاروں نے جا کر بےنظیر میں میری پالکی رکھدی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بےپر و بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے، ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے" [۲]

اب دم نہیں

ماہ و سال کے سفر کے ساتھ ساتھ، میرزا صاحب کے اعضا بھی فرسودہ و ناتواں ہوتے چلے گئے، تا آنکہ ۱۱ جون ۱۸۶۷ء کو انھوں نے منشی بیلچند کو صاف صاف لکھدیا:

"بھائی! بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں۔ نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں۔۔۔۔۔ بس اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا کل بچا پرسوں مرا" [۳]

۱۔ مکاتیب: ۶۸ (۲) ایضاً: ۶۹ (۳) ایضاً: ۱۱۱

وفات اور مدفن

آخر وہ دن بھی آگیا، جس کی میرزا صاحب کو برسوں سے آرزو تھی، یعنی ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت اُن کا انتقال ہوگیا۔ ۲۱ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو دلی اور دلی والوں سے ناراض ہوکر حسین مرزا کو لکھا تھا:

"رامپور زندگی میں میرا مسکن اور بعدِ مرگ میرا مدفن ہو لیا۔"[۱]

مگر قضا و قدر نے انھیں دلی ہی میں رکھا اور وہیں شاہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے قریب اپنے سسرالی خاندان کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔[۲]

۱۔ اردوی: ۳۲۹ (۲) تاریخ و وقتِ انتقال کے لیے دیکھو حاشیہ مکتوب ۱۱۶۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مولانا مہر کو اس پر اصرار ہے کہ ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء کو ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ کی تیسری تاریخ تھی، دوسری نہ تھی۔ اُن کی نظر میں اس کی دلیل یہ ہے کہ ہجری و عیسوی تاریخوں کا تطابق بتانے والی کتابوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان کتابوں کا حساب اس مفروضے پر قائم ہے کہ ہجری مہینوں میں سے ایک ۲۹ کا اور ایک ۳۰ کا ہوتا ہے، لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے یعنی کبھی دو چاند پے بہ پے ۲۹ یا ۳۰ کے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے جس واقعے کے متعلق اُسی دن عیسوی اور ہجری تاریخ ضبط کر لی جائے اور وہی تاریخ کسی دوسرے دور و دراز مقام پر بھی تسلیم کی جا چکی ہو، تو پھر حسابی تطابق کو اس شہادتی تطابق پر ترجیح نہ دی جائے گی۔ ۱۵ فروری کو ذیقعدہ کی دوسری تاریخ کا ہونا خواجہ حالی نے یادگار میں ضبط کیا ہے۔ ان سے پہلے حسین علی خاں بھی اپنے عریضۂ موسومہ خلد آشیاں میں یہی دو تاریخیں لکھ چکے ہیں۔ یہاں سے جو جواب گیا ہے، اُس کی تاریخیں دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس سال ۱۴ فروری کو ذیقعدہ کی پہلی ہوئی تھی۔ اس سال کی جنتری میں بھی جس کا ایک نسخہ کتابخانۂ رامپور میں محفوظ ہے، ۱۵ فروری کو ۲ ذیقعدہ کے مطابق درج کیا ہے۔ ان تمام شہادتوں کے مقابلے میں حساب کی کتاب کو یہ جانتے ہوئے کہ وہ مفروضے پر مبنی ہے، کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ہاں کوئی معاصر بیان ہمارے سامنے نہ ہوتا، تب البتہ تطابق کو ضرور مان لیتے جیسا کہ تمام اہلِ علم کا معمول رہا ہے۔

تصانیف

میرزا صاحب نے زیرِ نظر عریضوں میں اپنی متعدد تصنیفات کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر مشہور ہیں، اور بار بار طبع بھی ہو چکی ہیں۔ بعض کے حالات سے ابتدار یا ب علم آگاہ نہیں؛ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے۔

مہرِ نیمروز

۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے عریضے میں میرزا صاحب نے اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"از ہفت ہشت سال بتحریرِ تاریخ سلاطینِ تیموریہ .... می پرداختم۔" ۱

۹ جون سنہ ۶۶ء کو پھر لکھا:

"بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمتِ تاریخ نگاری سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی۔" ۲

تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں شاہِ ظفر نے میرزا صاحب کو تاریخ نویسی کی خدمت پر پچاس روپے کے مشاہرے کے ساتھ مقرر فرمایا، اور حکم دیا کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر تاریخوں سے حالات اقتباس کریں، اور میرزا صاحب اپنے اندازِ خاص میں ان واقعات کو لکھیں۔ کتاب کا نام پرتوستان رکھا گیا،

۱۔ مکاتیب: ۹ (۲) ایضاً: ۵۲

اور یہ تجویز قرار پائی کہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی جائے: پہلا حصہ ابتدائے آفرینش سے امیر تیمور گورگان تک بالاختصار، اور تیمور سے ہمایوں تک قدرے تفصیل کے ساتھ مرتب کیا جائے، اور دوسرے میں جلال الدین اکبر سے سراج الدین بہادر شاہ تک کے واقعات ہوں۔ میرزا صاحب نے حصۂ اول کا نام "مہر نیم روز" اور ثانی کا "ماہ نیم ماہ" رکھا۔ حصۂ اول کے متعلق ۱۱ جون سنہ ۱۸۵۲ء کو منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھا ہے:

"مسودۂ روداد اورنگ نشینانِ چغتائیہ بدستِ ہیرا سنگھ روان داشتہ ایم، وہنوز از رسیدنش نشان نیافتہ ایم۔ اگر رسیدہ است بنویسند، ورنہ از ہیرا سنگھ بازپرس کنند"۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر نیم روز کی ترتیب کا کام سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی ختم ہو چکا تھا، لیکن کتاب کی طباعت کی نوبت سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں آئی۔ چاہیے تھا کہ میرزا صاحب حصۂ ثانی کی ترتیب شروع کر دیتے، لیکن ایسا نہ ہوا، حتیٰ کہ سنہ ۵۷ء نے بساطِ تلوّن ہی الٹ دی، اور ماہِ نیم ماہ شرمندۂ طلوع نہ ہو سکا۔ بظاہر اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسی سال شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوا تھا اور میرزا صاحب بہ تنخواہِ سابق، استادِ شہ قرار پا گئے تھے، اس لیے انھوں نے خلافِ دانشمندی سمجھا ہو گا کہ ایک تنخواہ کے عوض دو خدمتیں انجام دیں۔۲

غدر کے بعد میرزا صاحب اس کتاب کو اپنے انگریزی تعلقات کے لیے مضر خیال کرنے لگے تھے۔ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو شیو نراین کو لکھا ہے:

"مہر نیم ماہ نہیں، اس کا نام مہر نیم روز ہے اور وہ سلاطینِ تیموریہ کی تواریخ ہے۔ اب وہ بات گئی گزری، بلکہ وہ کتاب اب چھاپنے کے لائق ہے، نہ چھپوانے کے قابل ہے"۳

۱۔ کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲۵۰۔ (۲) اس ایڈیشن کا ایک نسخہ کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ آمد و خرچ خزانہ سنہ ۵۶-۱۸۵۵ء سے پتا چلتا ہے کہ ۴ مارچ سنہ ۱۸۵۶ء کو اس کا حساب مجرا ہوا تھا۔ اس لیے فروری سنہ مذکورہ میں خریداری عمل میں آ چکی ہے۔ (۳) خطوط: ۱/ ۲۸۷۔

دستنبو

میرزا صاحب نے "آغازِ یازدہم مئی سنہ ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا... اور التزام اس کا کیا... کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسیِ قدیم لکھی جائے، اور کوئی لفظ عربی نہ آئے"۱ اور منشی شیو نراین کے مطبع مفید خلائق واقع اکبرآباد (آگرہ) میں بڑے اہتمام و صحت کے ساتھ طبع کرایا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ نواب فردوس مکاں کو بھی ارسال کیا تھا۔ ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو اس کی رسید کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ چار جزو کا رسالہ جواب بھیجا ہے، اس کا دیکھنا ضرور در کار ہے۔ فارسیٔ قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ؟ با این ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ... میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور وزرائی ملکہ دارا دربان کے دو سارٹیفکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے، تو اسی کتاب موسوم بہ 'دستنبو' میں دیکھا چاہیے۔"۲

لیکن خط کے الفاظ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا ہوا نسخہ مطبوعہ تھا یا قلمی۔ اگر مطبوعہ تھا، تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء سے قبل کتاب طبع ہو چکی تھی۔

نامۂ غالب

میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۶۰ء میں فارسی کی مشہور فرہنگ برہانِ قاطع کے اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ قاطعِ برہان لکھ کر، نواب فردوس مکاں کی امداد سے شائع کیا تھا۔ اس کے جواب میں ہندوستان کے متعدد اہلِ علم نے رسائل لکھے ان میں سے ایک بزرگ مرزا رحیم بیگ نے رسالۂ ساطعِ برہان تصنیف کیا اور اس میں میرزا صاحب کو بہت جلی کٹی سنائیں۔ میرزا صاحب نے اس کا جواب الجواب لکھا، اور اس کے پانچ نسخے نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے توسط سے نواب

۱- اُردوی: ۴۹ (۲) مکاتیب: ۱۰ و ۱۱

خلد آشیاں کی خدمت میں پیش کرکے، ۱۳ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا :

ایک عبارت کا ایک جز و بطریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے پارسل اُس کا نواب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبولِ نذر کو میرا عز و شرف جانیں گے۔"[۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسالۂ مذکورہ شروعِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا سوءِ اتفاق سے ان پانچ نسخوں میں کا ایک بھی کتاب خانے میں نہیں نہ کسی اور جگہ مکمل نسخے کا پتا چلا۔ البتہ اس رسالہ کا اخیر ورق ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کے پاس محفوظ ہے، اُس سے پتا چلتا ہے کہ رسالہ ۱۶ صفحوں میں ختم ہوا ہے صفحۂ ۱۲ کے نیچے مسطر کے باہر چھاپے خانے والوں کی طرف سے یہ عبارت خاتمے کی چھپی ہے: " الحمد للہ کہ نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بیگ صاحب کا مطبع محمدی محمد مرزا خاں میں: بیچ کنپ دہلی اندرون کوچہ چیلہ گذر نفیض حدچھاؤنی کے، اہتمام عبدالرزاق بیگ سے چھپا سنہ ۱۸۶۵ء"۔

دیوانِ اُردو

میرزا صاحب نے ۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۳ھ (۲۷ جولائی سنہ ۱۸۵۷ء) کے عریضے میں دیوانِ اُردو کا اس طرح ذکر کیا ہے :

" مجھ کو یہ غم ہے کہ ... دیوانِ اُردو کی رسید میں نے نہ پائی .... دیوان کی رسید ... ایسے ہی باریک کاغذ پر لکھ کر اس ساہوکار کو دیجیے گا، اور اُس کو تاکید کیجیے گا کہ اس کو بھیج دے"[۲]

منشی شیونرائن اکبر آبادی کو اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اب تم سنو۔ دیوانِ ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔"[۳]

اس بیان سے مترشح ہے کہ میرزا صاحب نے مئی سنہ ۱۸۵۷ء سے قبل دیوانِ اُردو

۱۔ مکاتیب: ۱۴۱ (۲) ایضاً: ۷۵ (۳) اردو ی: ۳۸۱

رامپور بھیجا۔ لیکن دراصل نسخۂ مذکورہ پانچویں عریضے کے جواب کی تاریخ (۹ مئی) اور تاریخِ آشوبِ غدر (۱۱ مئی) کے درمیان بھیجا گیا تھا۔ چونکہ وہ تاریخ غدر سے قبل تھی، اس لیے میرزا صاحب نے مجملاً "غدر سے پہلے" کہا ہے۔

میرزا صاحب کو اس کی رسید نومبر سنہ ۱۸۵۸ء تک موصول نہ ہو سکی۔ جب ماہِ مذکور میں انھوں نے دستنبو کی ایک جلد تحفۃً ارسال کی اور نواب صاحب نے جواب میں لکھا کہ عدیم الفرصتی کے سبب دیوان اور دستنبو ملاحظے سے نہ گزرے تو میرزا صاحب نے ۷ نومبر کو لکھا:

"اس فقرے سے کہ بسبب کم فرصتی کے اُن کا ملاحظہ نہ کرنا مرقوم تھا، سے ۔۔۔ کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا"۔ ۱

بظاہر اس کے کاتب کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مگر خط کا انداز کلیاتِ فارسی کے خط کے مطابق ہے۔ اس سے میں قیاس کرتا ہوں کہ یہ نواب فخر الدین خاں خرد کے قلم کا ہے، جو کلیاتِ فارسی کے کاتب ہیں۔

کلیاتِ فارسی

کلیاتِ فارسی کا نسخہ میرزا صاحب نے مارچ سنہ ۱۸۶۱ء میں نذر کیا تھا۔ ۷ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء کو اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"کلیاتِ فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول ہونے سے مجھ کو بہت خوشی حاصل ہوئی" ۲

۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب خلد آشیان کو لکھتے ہیں:

"دو قصیدۂ مدحیہ میرے دیوانِ فارسی میں مرقوم اور وہ دیوان حضرت کے کتاب خانے میں موجود ہے" ۳

بعد ازاں ۱۸ جون سنہ ۱۸۶۵ء کو پھر لکھتے ہیں:

"اب عرض یہ ہے کہ حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوانِ فارسی میں، جو کتاب خانے میں موجود ہے، درج کیا جائے" ۴

خود میرزا صاحب کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کے کاتب نواب

۱۔ مکاتیب: ۱۰ (۲) ایضاً: ۲۰ (۳) ایضاً: ۳۷ (۴) ایضاً: ۳۸

فخر الدین محمد خاں خرد تخلص دہلوی ہیں![1]

انتخابِ دیوانِ اُردو

نواب خلد آشیاں نے اساتذۂ فارسی و اُردو کے منتخب اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں ۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو میرزا صاحب سے اپنے چیدہ اشعار بھیجنے کی فرمائش کی۔ میرزا صاحب نے ۸ ستمبر کو جواباً تحریر کیا:

"اُردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے..... بعد اتمام تحریر نذر کیا جائے گا۔"[2]

۱۸ ستمبر کو پھر لکھا:

"خاطرِ اقدس میں نہ گزرے کہ غالب تعمیلِ احکام میں کاہل ہے..... کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں! بارے ایک دوست نے کاتب کا نشان دیا۔ اُردو کا دیوان، اشعار پر صاد کر کے، اُس کو حوالے کیا۔ کل وہ اجزائے منقولہ آئے۔ آج بطریق پارسل مع اس عرضی کے ارسال کیے۔ خط کاتب کا مجھ کو پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیونکر پسند آئے گا! اغلاط اتنے تھے کہ مجھ کو تحریر کے برابر محنت پڑی۔"[3]

۲۴ ستمبر کو سہ بارہ اُردو دیوان کا اس طرح ذکر کیا:

۱- ملاحظہ ہو اُردوئے معلّٰی: ۲۸۹ - نواب فخر الدین محمد خاں خرد تخلص، نواب ضیاء الدین محمد خاں دہلوی کے فرزند اور بڑے آزاد مزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، نیر اور میرزا صاحب وغیرہ کی کتابت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کلیاتِ نظم اور اُردو اور فارسی دیوان شیفتہ کے نسخے، جو کتب خانۂ رامپور میں محفوظ ہیں اور دیوانِ غالب اُردو کا نسخہ مملوکۂ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی انھیں کے لکھے ہوئے ہیں۔ میرزا صاحب نے ان کے متعلق تفتہ کو لکھا ہے کہ "کاتب اُن اجزا کا جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے، علم اُس کا ضیاء الدین رامپوری اور حکیم محمد حسن سے زیادہ ہے" (خطوط: ۱/ ۵۲) خرد کی کتابت حیرت انگیز حد تک اغلاط سے مبرا ہوتی ہے۔ خود میرزا صاحب بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۸۵۹ء میں مجروح کو لکھا ہے: "قاطع برہان کے مسودے سب میں نے پھاڑ ڈالے، اس واسطے کہ ہر نظر میں اُس کی عبارت بدلتی گئی۔ وہ تحریر بالکل مغشوش ہو گئی، ہاں، اُس کی نقلیں صاف کہ جن میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کر لی ہیں، ایک میرے واسطے، ایک بھائی ضیاء الدین خاں کے واسطے۔" (خطوط: ۱/ ۲۵۳)

۲- مکاتیب: ۵۸ (۳) ایضاً: ۵۸

"اُردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے کہ حضرت کی نظرِ انور سے گزر گیا ہو۔" ۱

انتخابِ دیوانِ فارسی

ابھی سلسلے میں میرزا صاحب نے فارسی دیوان کا انتخاب بھی روانہ کیا تھا۔ ۱ستمبر کے خط میں اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر چند شخصوں کے حوالے کیا ہے۔" ۲

۱۸ستمبر کے عریضے میں، دیوانِ اُردو کے ارسال کی اطلاع کے بعد، لکھتے ہیں:

"فارسی کلیات کا شیرازہ کھول کر اجزا اس کے احباب پر تقسیم کر دیے ہیں۔ جابجا اشعار پر صاد کر دیے ہیں، وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعدِ اتمام وہ بھی پیشکش کر دوں گا۔" ۳

۲۴ستمبر کو یہ انتخاب روانہ کرکے سرکار کو لکھا:

"آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریقِ پارسل اس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں .... اس در دلیش نے صرف غزلوں اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو، تو وہ بھی بھیجوں۔" ۴

مثلوں میں ایسی کوئی تحریر موجود نہیں جس سے پتا چل سکے کہ سرکار نے ان اصناف کا انتخاب بھی طلب فرمایا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کو مزید زحمت نہ دی گئی۔ کتاب خانۂ رامپور نے یہ دونوں مجموعے "انتخابِ غالبؔ" کے نام سے یک جا چھاپ کر شائع کر دیے ہیں۔

اِن کے علاوہ حسبِ ذیل کتابیں بھی میرزا صاحب کی لکھی ہوئی ہیں:

(۱) کلیاتِ نثرِ فارسی، (جو پنج آہنگ، مہرنیمروز اور دستنبو کا مجموعہ ہے)

(۲) پنج آہنگ (مجموعۂ مکاتیبِ فارسی۔)

۱۔ مکاتیب: ۵۹ (۲) ایضاً: ۵۸ (۳) ایضاً: ۵۸ (۴) ایضاً: ۵۹

(۳) قاطعِ برہان، فارسی لغت کی مشہور کتاب برہانِ قاطع کے اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ۔

(۴) درفشِ کاویانی، (قاطعِ برہان کا ترمیمہ نسخہ)

(۵) سبدِ چین (جس میں وہ فارسی اشعار ہیں، جو کلیاتِ نظم کی طباعت کے بعد کہے گئے تھے)

(۶) باغِ دو در۔ یہ سبدِ چین کا دوسرا نسخہ ہے۔ میرزا صاحب نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ وہی ہے جو سبدِ چین کے نام سے چھپا تھا صرف چند نظموں کا اضافہ ہوا ہے۔ دوسرا حصہ ان نثروں پر مشتمل ہے، جو کلیاتِ نثرِ فارسی میں چھپنے سے رہ گئی تھیں۔ دیباچے میں ۱۲۸۳ھ سالِ تالیف لکھا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ جناب وزیر حسن صاحب ایم۔ اے (دہلی) کے پاس محفوظ ہے۔

(۷) عودِ ہندی
(۸) اردوئے معلیٰ } (مکاتیبِ اردو کے مجموعے)

(۹) نکات و رقعات، (قواعدِ فارسی سے متعلق ضروری ہدایات اور چند فارسی خطوط کا مجموعہ)

(۱۰) قادر نامہ[1]، (خالق باری کی طرز کا رسالہ)

(۱۱) تیغِ تیز،

(۱۲) لطائفِ غیبی، (جو میاں داد خاں سیاح کے نام سے میرزا صاحب نے شائع کی تھی)

۱۔ بعض حضرات کو قادر نامے کے تصنیفِ غالب ہونے میں شبہ ہے۔ لیکن کتاب خانۂ رامپور میں اس کا ایک ایسا مطبوعہ نسخہ موجود ہے، جو سنہ ۱۲۸۰ھ میں خود دہلی کے مجتبائی پریس میں چھپا تھا اس میں نہایت صفائی کے ساتھ اسد اللہ خاں غالب دہلوی کو اس کا مؤلف بتایا ہے۔ اس شہادت کے سوا خود اشعار، بالخصوص وہ نمونے کی غزلیں، سے غالب کی شوخی اور ندرتِ بیان اتنی ہویدا ہے کہ جو اصحاب غالب کی افتادِ طبع سے کما حقہ واقف ہیں، ایک لمحے کے لیے بھی اسے غالب کے علاوہ کسی دوسرے کا نتیجۂ طبع تسلیم نہیں کر سکتے۔

(۱۳) ترجمۂ دعای صباح ۔ (ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے، جو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک عربی دعا کا منظوم ترجمہ ہے غالب کے حقیقی بھانجے میرزا عباس بیگ صاحب کی فرمایش پر سنہ ۱۲۸۴ھ سے پہلے مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپی تھی۔ بعدازاں رسالۂ نگار لکھنؤ کے ماہِ مئی سنہ ۱۹۴۱ء کے پرچے میں حقیر عرشی کی ایک مختصر تمہید کے ساتھ شائع ہوئی ۔

(۱۴) میرزا صاحب نے شاہ ظفر کی طرف سے ایک فارسی مثنوی بھی لکھی تھی جس میں اس افواہ کی تردید کی گئی تھی کہ بادشاہ نے مذہب اہلِ تشیع اختیار کرلیا ہے ۔ سلطان العلما مولانا سید محمد صاحب لکھنوی کو خود میرزا صاحب لکھتے ہیں :[1]

"در نگارش مثنوی مضمون از خسرو است و الفاظ از من، چنانکہ در رہ اش زخمہ از معنی و صدا از تار۔"

اس مثنوی کے ۴۶ شعر ہیں۔ کلام کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے :[2]

ہلہ ہان، ای فقیہہ اندیشان	حق پرستان و معدلت کیشان
تر زبانانِ وصفِ جہد و جہاد	رازدانانِ دین و دانش و داد
شاہی را بہ ہر حادثہ نیست	تو برغلط خواندہ بیست
یافت ہر کس کہ جست عنوانش	منتہی تا بہ یافتم غلانش

(۱۵) اسمای فارسی ۔ قادر نامے کے مجلس پریس والے نسخے کے آخر میں فراہی کی نصاب البیان کے انداز پر ۱۱ فارسی قطعے مذکورۂ بالا نام سے چھاپے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے : الحمد للہ والمنۃ کہ نسخۂ کثیر المنفعت قلیل الحجم مسمی بہ قادر نامہ و اسمای فارسی از تصنیف خاقانی زمان دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب باہتمام کنھیا لال داروغہ درمجلس پریس دہلی طبع شد۔"

---

[1] کلیاتِ نثرِ فارسی : ۲۲۹ (۲) یہ پوری مثنوی متفرقاتِ غالب مرتبۂ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی میں شائع ہوچکی ہے ۔

اس عبارت سے مترشح ہے کہ اسمائی فارسی بھی غالب ہی کی تصنیف ہے۔ کتاب کے آخری بے نقط قطعے کے انداز سے مذکورہ خیال کی بڑی حد تک تائید ہوتی ہے۔ واللّٰہ اعلم عنداللّٰہ۔

تلامذۂ رامپور

میرزا صاحب کے رامپوری شاگردوں میں سے حسبِ ذیل حضرات کا ذکر زیرِ نظر مکاتیب میں آیا ہے:

ناظم

یہ نواب فردوس مکاں کا تخلص ہے۔ آپ فروری سنہ ۱۸۵۷ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے۔ ابتدائی چند غزلوں میں یوسف تخلص کیا۔ بعد ازاں میرزا صاحب کے مشورے پر ناظم لکھنے لگے۔

میرزا صاحب کے قیام دہلی کے باعث، زیادہ تر خط کتابت کے ذریعے اصلاح عمل میں آتی تھی۔ سرکار اپنے مسودے خوشنویس سے صاف کرا کے میرزا صاحب کے پاس بھیجتے۔ اصلاح ہو کر غزلیں واپس آتیں، تو ملاحظے کے بعد خوشنویس سے بشکلِ دیوان لکھا کر رکھ لیتے۔ حسنِ اتفاق سے اصلاحی مسودوں میں سے چند کتاب خانے کے ردی گھر میں دستیاب ہو گئے ہیں۔ اُن میں سے وہ اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں، جن پر میرزا صاحب نے صاد کیا ہے

اِن شعروں پر تین صاد کیے ہیں:

حیلۂ پیروئ شرع کہاں سے سیکھا؟ | قبرِ عاشق کا نشاں خوب مٹایا تو نے
کی بھلائی بھی، تو کس نخوتِ پندار کے ساتھ | بختِ خوابیدہ کو ٹھوکر سے جگایا تو نے

خاطر تو جمع ہے کہ نہیں بعدِ حشر موت | ناظم گذر ہی جائے گا روزِ شمار بھی

مارا ہے اس طرح کہ عجب کیا ہے، گر ہو | محشر میں زندہ ہونے کا میرے یقیں تجھے

ان شعروں پر دو صاد کیے ہیں:

چاہیئے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد ملول ق چاہیئے تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ
نہ تجھے حشر کا، اے فتنۂ ایام خیال نہ تجھے خلق کا، اے شوخِ ستمگار، لحاظ

ان بیتوں پر ایک ایک صاد ہے:

دیکھنا شوخی کہ میرا پوچھتے پھرتے ہیں گھر سُن لیا ہے یہ کہ اُسکو کچھ نہیں گھر سے غرض

بات کی پچ ہے، جو ناصح سے کیا کرتا ہوں بحث ورنہ دل دینے سے ہوں میں خود پشیماں آجکل

آستینیں بھی نچوڑ ڈالیں گے اشک کے پونچھنے سے فرصت ہو

غلط سہی اثرِ آہ و نالہ، پر ناظم رہے نہ دل میں ہوس، آہ بھی کر دیکھو

طریقِ عشق میں ہرگز رہا نہ میں بیکار جو گر پڑا، تو قدم میں نے پاسباں کے لیے

عبث ہے خوفِ شکایت، لب آکے ملیاؤ رہے ہیں یاد ستمہائے بیشمار کسے

مرزا صاحب کے تمام شاگردوں میں یہ فخر صرف نواب ناظم کو حاصل ہے کہ اُنھوں نے اپنے اُستاد کے اندازِ خاص کو سب سے زیادہ اپنایا ہے۔ اس رائے کی تقویت کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کچھ اور منتخب اشعار پیش کیے جائیں۔ فرماتے ہیں:

طولِ شبِ ہجر جانتا ہوں مرنا مجھے لاکھ بار ہوگا

عیسیٰ کا بھی علاج کئی بار ہو چکا اچھا غمِ فراق کا بیمار ہو چکا
اب کیوں کمی کرے تجھے کس کا لحاظ ہو رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا

بلبلے ہے امتحانِ وفا میں مزا ہنوز ناظم، اگرچہ تجربہ سو بار ہو چکا

میں بھی ہوں حضرتِ ناصح، دانا کچھ سمجھ کر مجھے سمجھائیے گا
تم نہیں قول و قسم کے سچے جھوٹ کہتا ہوں، قسم کھائیے گا

مے میں یہ بات کہاں جو ترے دیدار میں ہے جس کو دیکھا کہ گرا، پھر نہ سنبھلتے دیکھا
دل کے پینے میں یہ قدرت اسے اللہ نے دی جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا

وہ کون ہے جو نہیں چاہتا کہ کام بنے ہر اختیار میں بھی ہو درست کر لینا
کہاں کی نیند، ادا جب یہ اس کی یاد آجائے اُٹھا کے تکیے سے بازو پہ سر کو دھر لینا

چاہو تم اور ہو آزردہ، یہ مانا ہم نے شرطِ انصاف نہیں شکوے کو بیجا کہنا

تپش و زاری و تنہائی و سرگردانی گھر میں سب کچھ ہیں موجود، یہ صحرا کیسا

آبرو کیا، پیرہن جیب بے گریباں رہ گیا! پارۂ آنسو، کچھ کٹے میرے کہ داماں رہ گیا
دیکھنے کو میرے آیا، لو حسن اللہ مرحبا! مرتے مرتے مجھ پہ اس ظالم کا احساں رہ گیا
آدمی پر راز حسنِ بے نشاں کیونکر کھلے! جس قدر ظاہر ہوا اُتنا ہی پنہاں رہ گیا

ہمنشیں، خستگیٔ دل کا ہوا غم تجھ کو یہ نہ دیکھا کہ مرے دل میں ہے پیکاں کس کا؟

دکھتی کہوں اور نہ کر سکو مجھ سے شکایت اس چشم فسوں ساز کو بیمار کہوں گا

شرمندہ ہوئے پر کہیں ضد اور نہ بڑھ جائے
عہد اُس کا اُسے یاد دلانا نہیں اچھا
غم کھانے میں کچھ نفع بھی ہوتا ہے کہ ناصح
کہتا ہے کہ غم بیہودہ کھانا نہیں اچھا

وہ عذر ہائے تو بہ سنئے کہ کیا کہیے
ہوئے ہم اُن سے گلہ کر کے شرمسار بہت
زمیں پہ گر کے بھی ہوتی نہیں شراب تلف
کہ زیرِ خاک ہیں رندانِ بادہ خوار بہت

نہ ثواب اُس میں ہے، نہ اِس میں اثر
صبر بیہودہ کا اضطراب عبث

شداد، شکر کر کہ گئی در پہ تیری جان
جب تھا مقامِ شکوہ کہ مرتا ارم سے دور
دم بھر میں جا پہنچتے ہیں، یاں کے مقیم واں
یہ مرحلہ نہیں ہے سوادِ عدم سے دور

گالیاں دینے میں تم کو نہیں زنہار لحاظ
پوچھیے بات، تو ہو مانع گفتار لحاظ
سچ ہے، تھا عہدِ وفا بیکے دل اُس کو دینا
آ گیا وقت پہ کرتے ہوئے تکرار لحاظ
جیب و دامن کو کیا سر بسر آلودۂ خوں
کچھ نہ آیا تجھے، اے دیدۂ خونبار لحاظ

مٹی نہ وصل میں بھی کلفتِ زمانِ فراق
تمام رات کہی ہم نے داستانِ فراق
خوشا حبیب وا داہای ونشانِ حبیب!
بدا فراق و الٰہمای جانستانِ فراق!
جگر گداز ہے کیا گرمیٔ نگاہِ عتاب!
جگر شگاف ہے کیا تیزیٔ سنانِ فراق!

ہمنشیں، صورتِ آرائشِ عالم کب تک؟
جادو دانی سہی نقش، مگر ہم کب تک!
کون ہوگا کہ نہ ہو معتقدِ فصلِ بہار
موسم اچھا ہے، پہ یہ کہیے کہ موسم کب تک!
کیا نہ سوکھیں گے سرِ شک اور نہ دم ٹوٹے گا
گریہ پے در پے و فریاد دمادم کب تک؟

گھیرے ہیں نے کیا ہے اُس کو یہاں آجکل
بن رہا ہے گھر میں گلستاں کا زنداں آجکل
آگیا برسات کا موسم وہ اب کیوں آئیں گے
اُن کے ہاتھ آیا ہے عذرِ باد و باراں آجکل

شہرت نہیں مجنوں کی برابر، یہ مسلم
پر کوئی نہ جانے ہمیں، ایسے بھی نہیں ہم
ہستی سے ہمیں بہرہ ملا ہے فقط اتنا
ہیں مثلِ سحر ایک دمِ بازپسیں ہم

یہ ظلم جو تم کرتے ہو، بیجا نہیں گویا
کہتے ہوئے "شکوہ بیجا نہ کردیم"
نے دام نہ دانہ، فقط اک شرطِ وفا کی
کیوں آ کے پھنسے کوئی، گرا لبیانہ کر دیم
ہم تم کو بُرا کہتے ہیں با خو کو تمہاری
لو خو کی بھی اچھی کہی، جھگڑا نہ کر دیم

فسانۂ ستمِ ہجر ہے، سوال نہیں
نہ دو جواب، سُنتے جاؤ، کچھ ملال نہیں
سُنا بھی تم نے تو کس سے سُنا، خدا کی پناہ!
کہا ہے غیر نے جو کچھ، وہ میرا حال نہیں

مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا
کہ اک دریا رواں ہے اور میں ہوں
وصالِ دائمی کا ہے تصوّر
بہارِ بے خزاں ہے اور میں ہوں

دل سخت ہے کافر کا، پر آنکھوں میں حیا ہے
سُنتے ہی جفا کا گلہ شرما گئیں آنکھیں
دل دیکھ رہا گریۂ خونیں کا مجھے شغل
باقی تھا جگر، سو اسے یوں کھا گئیں آنکھیں

دل جانتے ہیں تو کہتے ہیں، "اچھی طرح تو ہو"
گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

جب ترا نام سنا، تو نظر آیا گویا
کس سے کہیے کہ تجھے کان سے ہم دیکھتے ہیں
ذرّہ و مہر و گل و خار میں ہر سو موجود
دیکھتے ہیں تجھے، گردھیان سے ہم دیکھتے ہیں

کتنے ہو جائیں گے، پھر کیوں نہیں جاتے، جاؤ — میرے جینے کی مجھے راہ بتاتے جاؤ
غصّہ کیسا؟ نہ مجھے زجر، نہ درباں کو عتیب — در تک آتے ہو، تو آواز سناتے جاؤ
میں نے پھونکا بھی، تو کیا تم نے تماشا دیکھا — گھر کو، اچھا ہے، تمھیں آگ لگاتے جاؤ

عاشق ہوے سے کم نہوئی اُس کی سرکشی — معشوق سے ہے عربدہ تازہ ادا کے ساتھ
مُنھ تک رہے ہیں، بوسے کے سائل ہیں، پر خموش — اک نوع کا غرور بھی ہے التجا کے ساتھ

فرہادِ ہوس پیشہ نے بھی دی تو سہی جان — پر شیوۂ اربابِ وفا اور ہی کچھ ہے
ہم زہد و عبادت کے بھی منکر نہیں، ناظم — پر قاعدۂ فقر و فنا اور ہی کچھ ہے

ہمیں ہے حضرتِ عیسیٰ کا امتحاں منظور — کہے نہ کوئی کہ پھرتے ہیں ہم دوا کے لیے

کھلے کیا دل، درو دیوار کے آثار باقی ہیں — ہوا ہر چند گھر ویراں، پہ صحرا پھر بھی صحرا ہے
مسیحائی کا دم بھرتے ہو، سچ لیے ہی ہو لیکن — کبھی اپنے مریضِ غم کو بھی پوچھا کہ کیسا ہے

کیسی شفا، کہاں کی شفا، یہ بھی چند روز — قسمت میں تھا کہ نازِ مسیحا اُٹھائیے
ڈرتے ہیں محتسب سے، بھلا آئے تو سہی — ایسی کہی کہ ساغر و مینا اُٹھائیے

مہر و وفا کو کوئی نہ اچھا کہے بھلا — آزردگی ہوئی بھی تو کس بات پر ہوئی
تم سے نہ ہو سوا خذہ، یہ اور بات ہے — پر کیا کہو گے ظلم کی پرسش اگر ہوئی

وہ اپنے وعدے کے سچے ہیں آئیں گے لیکن — مجالِ صبر کہاں، تابِ انتظار کسے!
نہ دل سے نالہ رکے اور نہ آنکھ سے آنسو — کوئی کہو کہ کہے کوئی رازدار کسے

تو وہ ہے کہ گر ہم درِ گلزار سے گزرے "کیوں باغ گیا تھا" یہی تکرار نکالی
ہم وہ ہیں کہ، بد وضع، تری روز نئی بات سنتے رہے، پر منہ سے نہ زنہار نکالی

نواب فردوس مکاں کا دیوان دو بار چھپ چکا ہے۔ مگر پہلی بار سنہ ۱۲۷۰ھ میں چھپا، تو صرف میرزا صاحب کے اصلاحی کلام پر مشتمل تھا۔ دوبارہ اُن کے صاحبزادے سید حیدر علی خاں بہادر نے سنہ ۱۲۸۹ھ میں شائع کیا، تو وہ غزلیں بھی شامل کر دیں، جن میں آسیر لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا گیا تھا۔[1]

بیتاب

نواب فردوس مکاں کے حقیقی چچا زاد بھائی، اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ مومن خاں مرحوم سے تلمذ تھا۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے اور مومن خاں کا دیکھا ہوا مکمل دیوان اُن کے پاس اصلاح کے لیے بھیج دیا۔ اس کی اصلاحیں بیتاب کے نام کے خطوں کے ساتھ لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں صادی اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔[2]

اس شعر پر میرزا صاحب نے تین صاد بنائے ہیں:

لکھ دیا لکھنے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آ گیا رو دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر

اور حاشیے پر لکھا ہے: "آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب"

ان شعروں پر دو دو صاد ہیں:

کیا ہوئی عین جبیں؟ ہنستے ہو کیسے نقش پر! زندگی میں یوں کبھی صورت نہ دکھلائی ہیں

غیر بھی کہہ نہیں سکتا ہو کہ بیتاب ہوں میں نام سے میرے ہوئی ہو اُنھیں نفرت کیسی

۱- دیوانِ اول کے چند نسخے کتاب خانۂ رامپور میں موجود ہیں اور اہلِ ذوق کے ہاتھ فروخت کیے جاتے ہیں۔

۲- بیتاب کا دیوان گلدستۂ باغِ جناں کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ان اشعار پر ایک ایک صاد ہے :

کیا پشیماں ہوئے وہ مار کے ٹھوکر افسوس! سنگِ رہ سمجھے تھے جس کو وہ مرا سر نکلا

ضد تو دیکھو کہ نہ کی غیر کی جانبداری بولنا یوں بھی انھیں ہم سے گوارا نہ ہوا

کوئی یوں نیم بسمل کو تڑپتا چھوڑ جاتا ہے! یہ بیرحمی تو دیکھو، کس جگہ وہ رحم کھاتا ہے

نواب خلدآشیاں

خلدآشیاں نے میرزا صاحب سے مشورۂ سخن کا آغاز فارسی نثر سے کیا تھا۔ میرزا صاحب نے تفتہ کے خط میں لکھا ہے:

"نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائی طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔" [1]

خود نواب صاحب کو تحریر کیا ہے:

"دافعی افتتاحِ کلام بطرزِ میرزا طاہر وحید اور پھر نگارش مطالب بشیوۂ میرزا جلالائی طباطبائی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ اعجازِ خسروی کا رنگ جلوہ گر ہے۔ پس ناقدِ بصیر کے نزدیک یہ نگارش، طاہر وحید اور جلالائی کی عبارت سے بہتر ہے۔" [2]

بہت ممکن تھا کہ فارسی نظم میں بھی انھیں سے مشورہ کرتے۔ مگر سوءِ اتفاق سے یہ رشتہ استوار نہ رہ سکا۔ اور انھوں نے اپنا فارسی کلام مورخ الدولہ سپہر کاشانی کے پاس ایران بھیجدیا۔ اردو میں امیر مینائی کے شاگرد ہوگئے۔

آپ نے اپنے اردو اور فارسی دواوین بڑے اہتمام سے شائع فرمائے تھے [3] مگر عام طور پر اہلِ ادب اُن کے اندازے ناآشنا ہیں۔ اس لیے بمقتضائی مقام

۱- اردوی: ۱۴۴ (۲) مکاتیب: ۵۷ (۳) نواب خلدآشیاں کے دواوین کے باقی ماندہ نسخے اہلِ ذوق کے ہاتھ فروخت کیے جاتے ہیں۔

یہاں چند منتخب شعر لکھے جاتے ہیں:

ملا ہزاروں سے میں، مجھ سے اک زمانہ ملا
مگر خدا کی قسم! ہمتائے وفا نہ ملا

ملا ہے یار، تو نواب اتنے خوش کیوں ہو؟
خدا ملا، کوئی دولت ملی، خزانہ ملا!

ستاتا ہے ہر دم نئے رنگ سے
زمانہ بھی تیری ادا ہو گیا

میں تو مرتا ہوں اپنی ہمت پر
جان دے کر بھی انفعال ہوا

حشر تک تجھ کو مبارک رہے رونا، نواب
رکھ دیا آنکھ پر اُس شوخ نے دامن اپنا

ہجر میں ناتواں ہونے دے
ناز کیوں کر ترے اُٹھاؤں گا

کون مقتل میں سنے گا میری فریادیں کہ تم
ہاتھ اُٹھاؤ گے، تو شورِ مرحبا ہو جائے گا

یہ کیا کیا کہ کیا دعوئ وفا نواب
کہ اُس کو اور جفا کے لیے بہانہ ہوا

ذوقِ دیدار مدد کر، کہ بڑے شوق سے
حوصلہ دیکھتے ہیں اپنے تماشائی کا

نواب تو نے وصل کا پیغام کیوں دیا؟
کمبخت، کیا فراق میں تجھ کو مزا نہ تھا؟

نواب، یونہی اُس نے آنکھیں لڑائیں سب سے
پر دیکھنا وہی ہے، جس کو ادا سے دیکھا

اثر آیا دعا میں اُس دم، ہائے
دل میں جب کوئی مدعا نہ رہا!

کس خرابی سے دل کو تھاما ہے! ناز سے اب نہ مسکرائیں آپ

ہم تو رو رو کے جتاتے رہے الفت اپنی زیرِ لب ہنس کے وہ کہتے رہے ہر بار "عبث"

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند جو گنہ کیجیے ثواب ہے آج

دیوانہ گر کہیں گے، تو مجھ کو کہیں گے لوگ تم کیوں ہو مضطرب، مجھے بیتاب دیکھ کر؟

مرنا بہت ہے مشکل، کہتے ہو منہ بنا کر صدقے تمہارے منہ کے، دیکھو تو مسکرا کر

جاتے ہیں انتظار میں جی سے کون بیٹھا رہے قیامت تک!

شکوے نہ سننے کی ہے تغافل سے خو وہاں اٹکا ہے دم یہاں گلۂ ناتمام تک

دیا ہے بوسہ اسے پھیر لو تو ہم جانیں یہ دل نہیں ہے کہ لیجاؤ مسکرا کر تم

ہوش میں آؤ، نہ بھولو مری نادانی پر تم کو ہشیار بنایا ہے "وہ ناداں ہوں میں"

ابھی تو بھولے ہوئے ہو، مگر یہ یاد رہے نہ ہوں گے ہم، تو کہو گے: "وہ یاد آتے ہیں"

ایسی تو بیخودی نہیں ہوتی شراب میں کیا تم نے میرے بخت کو دیکھا ہے خواب میں

سو ظلم اب تو ہم پہ ہیں، پر کچھ بھی یاد ہے کہنا وہ بے بسی میں کہ "اللہ کیا کروں"؟

جس حشر پہ توقعِ فریاد ہے مجھے ڈرتا ہوں، وہ بھی کوئی تمھاری ادا نہ ہو

اثر فلک سے اُتر آ ذرا خدا کے لیے! کہ اُس نے ہاتھ اُٹھائے ہیں ادعا کے لیے

مانگیں ہیں رقیب نے دعائیں مٹی نہ خراب ہو اثر کی

وصل میں اک نہ اک بلا آئی جب رُکاوٹ گئی، حیا آئی

آپ کا ماتم میں آنا عذر خواہی کے لیے حشر میں کافی ہے میری بے گناہی کے لیے

حشر میں سوئے بن کے چھوٹ گئے یہ نئی طرح کی شرارت تھی

اشک بیجا اور آنکھیں دو، خدایا رحم کر اتنی ہی آنکھیں بھی دے آنسو بہانے کے لیے

یہ کس کا زخم ہے یارب کہ ہیں مرتے وقت تڑپ کے بیکڑوں بوسے دل و جگر کے لیے

لذت نہ پائی کچھ دلِ اُمیدوار نے دھوکا بڑا دیا ستمِ روزگار نے

کون کہتا ہے کہ نالوں میں نہیں تاثیر کچھ چور کرتے ہیں وہ ہم پر اک اثر یہ بھی نو ری

منشی

منشی سکھچند دارالانشا کے افسر کا تخلص ہے۔ اُنھوں نے نواب فردوس مکاں کے غسلِ صحت کی تاریخ کا ایک شعر لکھ کر میرزا صاحب کے پاس بغرضِ اصلاح و تکمیل بھیجا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ مزید کلام

دستیاب نہ ہو سکا۔

شوخی[1]

نادر شاہ خاں کا تخلص ہے۔ ان کے والد کا نام محمد ضامن خاں رسالدار اور وطن رامپور تھا۔ شوخی کی پیدائش دلّی کی ہے۔ اوائلِ شباب میں وہیں ملازمت بھی کی۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں میرزا صاحب رامپور تشریف لائے، تو انھوں نے اپنا کلام پیش کیا۔ میرزا صاحب نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: "تم جانتے ہو، میں نواب صاحب کا بلایا ہوا حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے اصلاح شعر کی خدمت میرے سپرد کی ہے۔ بغیر اُن کے حکم و اجازت کے یہاں اور کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتا"[2]۔

شوخی اس بات سے بہت مایوس ہوئے، مگر اتفاق یہ کہ میرزا صاحب کے پاس شراب ختم ہو گئی۔ نجی ملازموں میں سے کوئی اس کا اہل نہ تھا کہ مرادآباد سے جا کر شراب لا دے۔ شوخی آئے، میرزا صاحب نے اُن سے سارا حال کہا، وہ اس خدمت کے بجا لانے کو تیار ہو گئے۔ میرزا صاحب نے شراب کا نام بتایا اور مزید شناخت کی خاطر خالی بوتل دکھا کر ویسی ہی ایک بوتل لانے کا حکم دیا۔ شوخی نے گھر آ کر باپ سے منتیں کر کے روپیہ لیا، اور ایک کی جگہ ۵ بوتلیں خرید کر لا دیں۔ میرزا صاحب بہت خوش ہوئے، اور قیمت لینے پر اصرار کیا مگر شوخی نے ایک نہ مانی۔

۱۔ زیرِ نظر مکاتیب میں شوخی کا مذکور نہ ہونے کے باعث یہاں ذکر کرنا بے جوڑ سا نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا مہر نے اپنی کتاب میں میرزا صاحب کے قیام رامپور کے کچھ واقعات ان کی زبانی نقل کیے ہیں، جن کے متعلق خود شوخی کی شاگردی کا دلچسپ واقعہ بھی ہے۔ چونکہ میں نے بحیثیت متعلقاتِ رامپور بھی شوخی کے بیان سے فائدہ اٹھایا ہے اس لیے جزاءِ احسان کے طور پر یہاں اُن کا ذکر کر رہا ہوں۔

۲۔ ممکن ہے کہ میرزا صاحب شوخی کو ٹالنا ہی چاہتے ہوں۔ لیکن انھوں نے نواب زین العابدین خاں عرف کلن میاں کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کی جو وجہ بیان کی تھی وہ بھی میرزا کے استغنا زدہ تھی۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ریاست کے جذبہ رقابت و رشک کے خوف سے میرزا صاحب فی الواقع سرکار کے اعزا اور رعایا دونوں سے استادانہ تعلق پیدا کرنے کو مصلحت کے خلاف جانتے تھے، اور اسی لیے بلا اجازت اصلاح دینے سے بچتے تھے۔

دوسرے دن شوخیؔ حاضر ہوئے، تو میرزا صاحب نے فرمایا: "وہ تمھاری غزل کہاں ہے، جو اُس دن لائے تھے"؟ شوخیؔ نے فوراً جیب سے نکال کر غزل پیش کر دی۔ میرزا صاحب نے اُسے دیکھ کر جا بجا اصلاح دی۔ اصلاح دیتے جاتے تھے، اور ساتھ ساتھ ہدایات و افادات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس کے بعد شوخیؔ دہلی جا کر کئی ماہ تک میرزا صاحب کی خدمت میں رہے (۱)

وسطِ عمر میں شوخیؔ بنارس چلے گئے تھے، اور کلکٹری کے نائب ناظر اور پیشکار کی خدمات انجام دینے کے ساتھ میرزا صاحب سے مشورۂ سخن بھی کرتے رہے۔(۱)

مولانا ابوالکلام آزادؔ نے اُن کے پاس ایک قطعہ دیکھا تھا، جس پر میرزا صاحب کے قلم کی اصلاحیں تھیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

ہوں کسی حالت میں، پر غصہ ہو اس دلگیر پر — خود بخود بل آ گیا پیشانیٔ تصویر پر

ہر ہر سخن پہ جان نہ دینے کا ہے گلہ — اک بات آ گئی ہے بُتِ خود نما کے ہاتھ

بنا کروں کوئی میخانہ، جی میں ہے، شوخیؔ — کہ بعدِ مرگ زمانے میں یادگار رہے

کچھ روز جوانی کے مزے لینے دے زاہد — دو چار برس میں تو قیامت نہیں ہوگی

---

(۱) غالب: ۱۳۴، طبع ثانی (۲) خمخانہ: ۵، ۶۶۔

لوازمِ امارت

<u>شاگرد پیشہ</u>

۱۰ اگست سنہ ۶۶ء کے عریضے میں میرزا صاحب نے اپنے ملازموں کا بھی اجمالی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"حضور کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشے کا اور حسین علی خاں کا گزارہ ہے۔

عالم الغیب جانتا ہے جس طرح گزرتی ہے۔"(۱)

۱۵ نومبر سنہ ۶۷ء کو پھر لکھتے ہیں:

"ستہ شاگرد پیشہ اور لعنۃ قرض متفرقہ ان جا کر اور روپے بھیجیں گے۔"(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالی پریشانی کے باوجود میرزا صاحب امیرانہ ٹھاٹھ رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ میرزا صاحب کے دوسرے سفرِ رامپور کے ضمن میں آئے گا۔

<u>شاگرد پیشے کی تنخواہ</u>

میرزا صاحب نے نومبر سنہ ۱۸۶۷ء میں نواب خلد آشیاں کو اپنے ماہوار مصارف کی جو روداد لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہر مہینے ۴۳ روپے نوکروں کی تنخواہ کے ادا کرنا پڑتے تھے۔(۳) لیکن ۱۲ نومبر سنہ ۶۵ء کو رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو مختار کار کی شکایت میں لکھا ہے:

"خفا میں ہوں کہ...... چھتا ۲۳ روپے ۸ آنے کا نہ بانٹا۔"(۴)

ظاہر ہے کہ دو سال کے اندر ملازموں کی مقدار میں اتنا اضافہ ممکن نہیں کہ ۲۳ کی جگہ ۴۳ روپے کا ماہوار خرچ ہو جائے۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یا تو میرزا صاحب نے سرکار کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے واقعی صرف سے زیادہ لکھا، اور یا حکیم صاحب کے خط میں کاتب نے ۴۳ کی دہائی کو غلطی سے دو پڑھ لیا۔ چونکہ ۴ اور ۲ میں اکثر دھوکا

(۱) مکاتیب: ۵۵ (۲) ایضاً: ۷۷ و ۸۳ (۳) خطوط: ۱، ۲۳۱

ہو جاتا ہے، اس لیے میں یہی خیال کرتا ہوں کہ کاتب نے ؁۶۳ یا غلط پڑھ کر ۶۲۳ کی جگہ ۳۲ لکھ دیے ہیں۔

مختار کار

میرزا صاحب نے ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کے عریضے میں مختار کار کا بھی ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"آج آخر روز توقیع وقیع مع جولائی کی تنخواہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ ہنڈوی مختار کار کو دی اور یہ عرضی لکھنے بیٹھا۔"(۱)

بعد ازاں ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو منشی سیل چند کے نام کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اگلے مہینے یعنی اگست ۱۸۶۶ء کی تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی اس کا روپیہ ابھی تک نہیں ملا۔ میں تو جس دن ہنڈوی آتی ہے، اسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہاتھ کہ وہ بھی مہاجن ہے، بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اس مختار کار کو جس کے ہاں ہنڈوی آتی ہے، اس نے روپیہ ابتک نہیں دیا۔"(۲)

اس بیان سے مترشح ہے کہ مختار کار سے کوئی تنخواہ دار ملازم مراد نہیں ہے بلکہ میرزا صاحب کا جس مہاجن سے لین دین تھا اسی سے میرزا صاحب مختاری کا کام بھی لیتے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کے محولہ بالا خط سے مختار کار کا نام بھی معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"کدارناتھ لڑکا ہے۔ وہ مجھ سے کیا خفا ہوگا؟ روپیہ جو خزانے میں جمع ہوگا آخر وہی لائے گا۔ خفا میں ہوں کہ روپیہ دام دام لیا میرا نمک نہ دیا، اور چھپا ۲۳ روپے آٹھ آنے کا نہ بانٹا۔"(۳)

---

(۱) مکاتیب: ۵۸ (۲) ایضاً: ۱۱۳ (۳) خطوط: ۱، ۲۳۱

انگریزی تعلقات

دیرینہ نمکخوار

حکومتِ انگلشیہ سے میرزا صاحب کے تعلق کا آغاز، اُن کے چچا نصراللہ بیگ خاں بہادر کے توسط سے ہوتا ہے - نصراللہ بیگ خاں بہادر انگریزی فوج میں رسالدار، اور پرگنۂ سونک سونسا[1] کے جاگیردار تھے - میرزا صاحب اپنے والد کے انتقال کے بعد چچا کی سرپرستی میں پرورش پا رہے تھے کہ سنہ ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ خاں بہادر کا انتقال ہو گیا - لارڈ لیک بہادر نے دیرینہ خدمات کا لحاظ کرکے، جاگیر کے عوض اُن کے متعلقین کی ۵ ہزار روپے نقد پنشن مقرر کر دی، اور اس طرح میرزا صاحب انگریزوں کے وظیفہ خوار بن گئے - یہ پنشن نصراللہ بیگ خاں بہادر کے نسبتی بھائی نواب احمد بخش خاں بہادر، والیٔ فیروزپور جھرکہ، کے خزانے سے ملتی تھی - لیکن اُن کے جانشین، نواب شمس الدین احمد خاں بہادر، کو ولیم فریزر، ریزیڈنٹ دہلی، کے قتل کرانے کے الزام میں پھانسی دے دی گئی، اور فیروزپور کی جاگیر ضبط ہو گئی، تو میرزا صاحب اور دیگر ورثای نصراللہ بیگ خاں کی پنشن خزانۂ کلکٹری، دہلی سے تقسیم ہونے لگی اور اپریل سنہ ۱۸۵۷ء تک میرزا صاحب کو ملتی رہی -

اپنی اس "دیرینہ نمکخواری" کے متعلق نواب فردوس مکاں کو تحریر کرتے ہیں:

"حالی رای جہان آرای باد کہ دیرینہ نمکخوار سرکارِ انگریزم، و از سرِ آغازِ سال یکہزار و ہشت صد و شش کہ دران نگاہ شمارِ سنینِ عمرِ من از دہ نگذشتہ بود، بعوضِ جاگیرِ عمِ حقیقیِ نسبیِ خود، نصراللہ بیگ خاں بہادر، کہ با جمعیت

(۱) تاریخ سلطنت انگلشیہ (ص ۵۸ طبع مراد آباد سنہ ۱۸۶۷ء) میں لکھا ہے کہ "سنہ ۱۸۰۵ء میں سونک سونسا سہار متصل آگرہ تعینۂ سرکار میں آیا"

رسالۂ چہار صد سوار بمعیت جرنیل لارڈ لیک بہادر در فتح ہندوستان کوششہای نمایان کردہ، و پرگنہ سونک سونسا بقید حیات جاگیر یافتہ، و ہم دران عہد بمرگ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمان جرنیل لارڈ لیک بہادر منظوری گورنمنٹ، مشت زری شامل جاگیر عم بسبیل من، نواب احمد بخش خان بہادر، بر وجہ معاش من منجملۂ زر استمراری سرکاری کہ بذمۂ نواب احمد بخش خان بہر دوام واجب الادا بود، قرار یافت۔ چون جانشین احمد بخش خان کیفر کردار یافتہ و جاگیر بسرکار باز یافت شد، رسیدن آن وجہ مقرری از خزانہ کلکٹری دہلی صورت پذیرفت، چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۷ء از کلکٹری دہلی یافتہ ام۔" (۱)

دربار اور خلعت

پنشن خوار کی حیثیت سے میرزا صاحب اہم شخصیت کے مالک نہ تھے۔ انھیں ساڑھے سات سو روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار کا معمولی وظیفہ ملتا تھا۔ نواب خلد آشیاں کو ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء کے عریضے میں لکھا ہے:

"میں پنسن بیبا انگریزی سرکار سے بعوض جاگیر پاتا ہوں۔" (۲)

دراصل ان کا حقیقی اعزاز یہ تھا کہ گورنر جنرل کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ، سرپیچ و مالای مروارید پاتے تھے۔ نواب فردوس مکاں کو یہ تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست دو دمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے، مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورنمنٹ کے دربار میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالای مروارید خلعت مقرر ہے۔" (۳)

غدر اور تصویر خدمت

سرکار انگریزی سے میرزا صاحب کے تعلقات مئی سنہ ۵۷ء تک خوشگوار

(۱) مکاتیب: ۸ (۲) ایضاً: ۷۳ (۳) ایضاً: ۱۵۔

تھے۔ جب دہلی اور دیگر اطراف ملک میں انگریزوں کے خلاف فوج اور رعایا نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا، اور بہادر شاہ ظفر مطلق العنان حکمران قرار دے گئے، تو میرزا صاحب کے لیے گوشہ گیری کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ کیونکہ اگر اپنی محسن سرکار کا ساتھ دیتے، تو باغی گھر بار لوٹ لیجاتے، اور اہل قلعہ کی کھلم کھلا حمایت کرتے، تو بصورتِ ناکامی انگریزوں کی طرف سے بدسلوکی کا خوف تھا۔ نصیب کی تائید سے میرزا صاحب کی تدبیر کارگر ہوئی اور وہ دہلی کے اندر باغیوں کے ساتھ "بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا" ایام گزاری کرتے رہے۔ جب انگریزی فوج نے شہر فتح کیا، اور اُن اشخاص کی دار و گیر شروع ہوئی، جنھوں نے باغیوں کی جنبہ داری کی تھی، تو بہت سے شہری خوف کے مارے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ میرزا صاحب اس وقت بھی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ شہر میں تحقیقات شروع ہوئی، مخبروں نے اطلاعیں بہم پہنچا کر باغیوں کی تلاش میں گورمنٹ کی مدد کی۔ میرزا صاحب بھی قلعہ کے وظیفہ خوار تھے۔ چاہیے تھا کہ حکام اُنھیں بھی بلاتے اور پرسش و جو کرتے، مگر ایسا نہ ہوا خود میرزا صاحب نے کسی حاکم سے اس لیے ملنا مناسب نہ جانا کہ موجودہ اصحاب میں اُن کا کوئی شناسا نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لیے اُن کے تعلقاتِ انگریزی منقطع ہو گئے۔ دورانِ بغاوت میں، نواب فردوس مکاں نے انگریزوں کی بڑی امداد کی تھی۔ میرزا صاحب اس حقیقت سے واقف تھے۔ جب غدر کی آگ بجھ گئی، تو اُنھوں نے ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ کو اپنی روداد نواب صاحب کو لکھ کر آخر میں عرض کیا:

"راستی اینکہ دریں فتنہ و آشوب بہ خدمتی بجا نیاوردہ ام۔ لیکن مقام شکر است کہ بہ تقدیم نرسیدنِ خدمت از راہ بیدستگاہی ست و ذریعہ اخلاص خلوص ہمان بی گناہی ست۔"(۱)

۱۔ مکاتیب: ۹

بعد ازاں ۷ نومبر ۱۸۵۸ء کو تحریر کیا ہے:

" خدا کا شکر ہے کہ باوجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔"(۱)

اسی سلسلے میں ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں:

" اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بیگناہ ہوں یا گناہگار، مقبول ہوں یا مردود، مانا کہ کوئی خیرخواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں، لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستور قدیم کو برہم مارے۔"(۲)

مسدودیٔ دربار و خلعت و پنشن

میرزا صاحب نے ایام غدر میں جو رویہ اختیار کیا تھا، اس کی بنا پر حکومت انگلشیہ کی نظر میں مجرم ثابت نہ ہوے کہ سزا دیجاتی، لیکن کسی خاص خدمت کے انجام نہ دینے کے سبب سے اس کے بھی مستحق خیال نہ کیے گئے کہ پنشن، دربار اور خلعت بحال رکھا جاسے۔ چنانچہ یہ تینوں اعزاز بند ہو گئے۔ نواب فردوس مکاں کو ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کے عریضے میں دربار و خلعت کے ذکر کے بعد لکھا ہے:

" لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوسی یہاں آئے نہیں۔ اب یہ نواب معلی القاب آتے ہیں۔ زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدردان جناب اڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر نہیں، لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے، تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔" ۳

پنشن کی مسدودی کے بارے میں ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کے محولۂ بالا عریضے میں لکھتے ہیں:

" چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۷ء از کلکٹری دہلی یافتم۔ دارئی

۱- مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۵ (۳) ایضاً: ۱۵

خود آشکارا ست کہ حال چیست ؟" ۱

اس کے بعد ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو تحریر کرتے ہیں:

"جنابِ عالی، طرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے، اور اپنی قسمت کا گلہ ہو ..... قسمت کا گلہ یہ کہ عطائی پنشن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ اُنیسواں مہینا ہے۔ گویا پن کھا کے جینا ہے۔" ۲

<u>پنشن کی بحالی کی کوشش</u>

مئی سنہ ۱۸۰۶ء سے اپریل سنہ ۵۷ء تک میرزا صاحب کو خاندانی وظیفہ ملتا رہا۔ مئی میں غدر ہو گیا اور چند ماہ تک اہلِ دہلی اور گورنمنٹ کے تعلقات منقطع رہے۔ فتحِ دہلی کے بعد، جنوری سنہ ۵۸ء تک میرزا صاحب نے اس سلسلے تجدیدِ راہ و رسم کی سعی نہ کی۔ شناساحاکموں میں سے اب کوئی نہ رہا تھا، اور نئے حکام سے ملاقات کی تقریب کوئی خدمت ہوتی چاہیے تھی، جو ازراہِ احتیاط اُنھوں نے انجام نہیں دی تھی۔ چنانچہ ۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے عریضے میں نواب فردوس مکاں کو لکھا ہے:

"و از سرِ آغازِ سال ۱۸۰۶ ... بعوضِ جاگیرِ عمِ حقیقی نسبیِ خود ... منشورِ زری ... در وجہِ معاشِ من .... قرار یافتہ .... چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۷ء از کلکٹریِ دہلی یافتہ ام۔ و از سعیِ خود آشکار است کہ حال چیست .... می بایست کہ خود سلسلہ جنبان گشتمی و با حکام پیوستمی دریں بارہ سخن کم نشست، کہ دریں زمانہ ہا ان با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم۔ و معہذا موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم و خواہشِ ملاقات میان آورم۔ راستی اینکہ دریں فتنہ دآشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام۔" ۳

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ جنوری اور ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء کے درمیان ہی مرزا نے پنشن کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی۔ اس لیے کہ نواب فردوس مکاں کی بالواسطہ

۱۔ مکاتیب: ۸ (۲) ایضاً: ۱۱ (۳) ایضاً: ۸ و ۹

دعوتِ رامپور کے جواب میں، صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کو ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء کو لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنر شہر کے وہ درخواست حوالے ہوئی۔ صاحب کمشنرِ دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔ پس اگر وہ کیفیت پنشن کی ہے، تو یہاں کی کلکٹری کا دفتر اگر نہیں رہا نہ رہے، ریونیو بورڈ کے دفتر اور لفٹننٹ گورنری آگرہ اور نواب گورنر جنرل کلکتہ کے دفتر اس پنشن کی کیفیت سے خالی نہیں ہیں۔ اور اگر میری کیفیت مطلوب ہے، تو میرا بے جرم اور بری اور الگ ہونا فسادے، از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مخبرین ظاہر ہے۔ بہر حال صاحب کمشنر شہر کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعد ملاحظۂ کیفیت کیا حکم دیں۔" [۱]

مدّاحوں میں نام

اس عرصے میں میرزا صاحب نے بقولِ خود "مدّاحانِ حکومتِ انگلشیہ میں اپنا نام درج کرا کے وزرای ملکۂ دارا دربان کے دو سارٹیفکٹ" حاصل کر لیے تھے۔[۲] اس کے باوجود نومبر سنہ ۵۸ء تک پنشن جاری نہ ہوئی، اور جب شہر میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء میں پنشنداروں کو روپیہ ملے گا، تو

۱۔ مکاتیب: ۸۶ (۲) نومبر سنہ ۱۸۵۸ء سے پہلے ہی غالب نے ملکۂ وکٹوریا کی مدح میں ایک قصیدہ "نظم گشت از فرشتہ خون چکان داد" لکھ کر لارڈ ایلن برا، سابق گورنر جنرل، کو لندن بھیجا کہ وہ اسے بارگاہِ شاہی میں پیش کریں۔ جواب آیا کہ قصیدہ بھیجا، میں نے حکامِ بمبئی کو بھیج دیا کہ گزرانا جائے۔ پھر مسٹر ہیملٹن کی تحریر آئی کہ جو قصیدہ لارڈ ایلن برا نے بھیجا تھا، اس پر حکم ہوا کہ قصیدہ گزار حاکمِ ہند کے توسط سے اپنے مطالب گزارش کرے۔ غالب نے عرضداشت لکھ کر لارڈ کیننگ کو بھیجی، تو انھوں نے اس کی رسید اور اس کے انگلستان بھیجے جانے کی اطلاع لکھی۔ چار مہینے پیچھے مسٹر رسل کلرک نے عرضداشت کا جواب بھیجا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا کہ پہلی نومبر کو اعلان ہوا کہ آج سے ہندوستان میں ملکۂ وکٹوریہ کا عمل ہو گیا۔ اس صورت میں "مدّاحوں میں نام لکھوانا عبارت ہے، قصیدہ لکھ کر ممدوح تک پہنچانے سے اور سارٹیفکٹ" اُن خطوں کو کہا ہے، جو قصیدے اور عرضداشت کی رسید اور غالب کی سفید نہندی اور وفاداری کے گویا اعتراف میں ان گورنر جنرلوں نے انھیں بھیجے تھے۔ (رسالہ ہندوستانی: ۳۵۸، بابت جولائی سنہ ۱۹۳۸ء)

۷ نومبر سنہ ۵۸ء کو میرزا صاحب نے ازراہ شکایت نواب فردوس مکاں کو لکھا:

"قسمت کا گلہ یہ کہ عطائی پنشن قدیم کا حکام کو خیال ہی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ اکیسواں مہینا ہے۔ گویا پنشن کھا بیٹھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری ہی شروع سال میں پنسداروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھیے کیا نیا گل کھلے گا۔ پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہوگیا ہے، کہ اب قلمرو ہندستان میں عمل ملکۂ معظمہ عالی مقام ہوگیا ہے۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور وزرائے ملکۂ دارا دربان کے دو سارٹی فکٹ پا چکا ہوں۔"[1]

اس کے جواب میں نواب صاحب نے رامپور آنے کی دعوت دی۔ میرزا صاحب نے ۳ دسمبر کو جواباً تحریر کیا:

"میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، بھئی وہاں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا۔ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغاز سال ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پاوے۔ جس کو روپیہ ملتا ہے اس کو روپیہ، جس کو جواب ملتا ہے اس کو جواب مل جاتا ہے۔"[2]

عرضی کی روداد

جنوری سنہ ۵۹ء پر دو مہینے اور گزر گئے، مگر ہنوز مقدمہ پنشن فیصل نہ ہوا۔ سرکار نے ۱۳ اپریل کو پھر دعوت آمد رامپور دی، تو میرزا صاحب نے لکھا:

"مجموع پنسداروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میرے پنشن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتے کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے

۱۔ مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۲۔

حکمِ منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔"[1]

راہِ چارہ مسدود

جب مہینے پر مہینا گزرنے لگا، اور پنشن کا تصفیہ نہ ہوا، تو میرزا صاحب نے ، نومبر سنہ ۵۹ء کو مجبوراً لکھا:

"اب تک میں اپنے آپ کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بےگناہ ہوں یا گنہگار، مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیرخواہی نہیں کی، جونئے انعام کا مستحق ہوں، لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔ بہر حال راہِ چارہ مسدود اور دُکھ موجود۔ عرفی خوب کہتا ہے:

مرا زمانۂ طناز دستِ بستہ و تیغ زند بفرقِ گوید کہ "ہاں" سری میخارؔ"[2]

نواب فردوس مکاں کی سفارش

نواب فردوس مکاں اپنے اُستاد کی پریشانی سے کما حقہ واقف تھے۔ آپ نے ازراہِ نوازش بعض انگریز حکام سے اس لیے میرزا صاحب کی اکثر تعریف کی کہ اُن کے سابقہ مدارجِ عزت بحال ہو جائیں، اور جب میرزا صاحب کا پاس نامہ مورخہ ، نومبر سنہ ۵۹ء مطالعہ فرمایا، تو تسکینِ خاطر کے لیے لکھا:

"مشفقا، ہنگامِ ملاقات کے اکثر بعضے صاحبانِ بہادرِ ذیشان سے تذکار محامد اوصافِ ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدر دانی سرکارِ دولتمدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارجِ عزت آپ کے قدیم سے ہیں، پیشگاہِ گورنمنٹ بہادر سے بھی اُسی مطابق ظہور میں آوے گا، کس واسطے کہ اہالیٔ سرکار ابد قرار قدرداں و قدرشناس ہیں"[3]

اقبال کی نا امید

سرکار کی سفارش بارآور ہوئی، اور پنشنداروں کا نفتا، بعدِ صدور یہ حکم

۱- مکاتیب ۱۳ (۲) ایضاً ۱۵ (۳) ایضاً ۱۶، ح ۲-

صدر سے واپس آگیا۔ میرزا صاحب نے ۱۲ اپریل سنہ ۶۰ء کو ان الفاظ میں سرکار کو اطلاع دی:

"عالم دو ہیں: ایک عالم شہادت، ایک عالم غیب۔ جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے، عالم غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہ نقشا پنشنداروں کا، جو یہاں سے صدر کو گیا تھا، وہ اب صدر سے بعد صدور حکم آگیا۔ حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت ہے، سو روپے مہینے والے کو چھتیس بھی ہیں اور پچیس بھی ہیں اور دس بھی ہیں۔ اب فرمائیے میرے واسطے کیا احتمال گزرتا ہے۔ یاس کلی ہے۔ لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگزاشت کا حکم۔ طرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے، کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا حکم منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے عملے میں اور وکلا اور اہلِ شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔ بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔ سو یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہو جائیں گے اور جو معلوم ہوگا وہ عرض کیا جاوے گا۔"[1]

خدا ساز بات

میرزا صاحب نے ۴ مئی سنہ ۶۰ء کو زرِ پنشن وصول کر لیا۔ اہلِ دہلی نے اس امر کو نواب فردوس مکاں کی سعی و کوشش کا نتیجہ قرار دیا۔ میرزا صاحب ان مراتب سے بخوبی آگاہ تھے، اور جنوری سنہ ۶۰ء میں رامپور آتے وقت بعض احباب کو یہ لکھ بھی چکے تھے کہ اس سفر کا مقصد یہ ہے کہ نواب صاحب کے ذریعے سے گورنمنٹ سے میری صفائی ہو جائے۔ لیکن اس کے

۱۔ مکاتیبِ غالب ۱۷

باوجود، جب یوسف میرزا صاحب نے لکھا کہ خواجہ جان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ والیِ رامپور کی کوشش سے آپ کی پنشن جاری ہو گئی، تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے اجرای پنشن کو مسبب الاسباب کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا:

"خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والیِ رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خداساز ہے، بعلی بن ابی طالب علیہ السلام۔"[1]

بحالیِ دربار اور خلعت کی کوشش

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ میرزا صاحب گورنر جنرل کے دربار میں خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقوم جواہر لارڈ ہارڈنگ صاحب کے وقت تک حاصل کرتے رہے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی نے دلی آکر دربار نہیں کیا، اس لیے سنہ ۱۸۴۸ء سے غدر سنہ ۱۸۵۷ء تک میرزا صاحب کو شرکتِ دربار اور حصولِ خلعت کا کوئی موقع میسر نہ آیا۔ غدر کے بعد، لعذرِ اشتباہ، پنشن بند ہوئی، تو دربار و خلعت کی امید بھی جاتی رہی۔ لیکن اجرای پنشن کے بعد میرزا صاحب نے بحالیِ دربار کی درخواست کی، جس پر عرصے تک تحقیقات ہوتی رہی۔

گورنر کا دربار اور خلعت

آخر ماہِ فروری سنہ ۱۸۶۳ء کو سر رابرٹ منٹگمری، لفٹننٹ گورنر پنجاب نے دلی میں دربار کیا۔ میرزا صاحب کو دربار میں نہ بلایا گیا، لیکن ۳ مارچ کو دن کے بارہ بجے گورنر نے یاد کر کے اپنی طرف سے خلعت دیا اور فرمایا کہ گورنر جنرل بہادر کا دربار انبالے میں ہونے والا ہے۔ آپ وہاں دربار میں شریک ہو کر خلعتِ معمولی حاصل کیجیے۔ میرزا صاحب نے غالباً ۴ مارچ کو

۱۔ اردوی: ۱۳۳(۲)، اردوی: ۱۸۱، ۳۸۳۔ یہاں دو باتیں ظاہر کرنے کی ہیں۔ پہلی یہ کہ جس خط میں اردوی ۱۳۳ کے اندر شنبہ ۴ فروری طبع ہوا ہے، جو اندر روی حساب غلط ہے۔ دوسری یہ کہ میرزا صاحب کو مولوی اظہار حسین خاں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ گورنر جنرل دربار نمبر وار و خلعت کی بحالی کا حکم لکھانے سے ۴ یا ۵ دن بعد اس طرف کو روانہ ہوئے تھے۔ اس صورت میں حکم بحالی فروری میں جاری ہونا چاہیے، نہ کہ مارچ میں، جیسا کہ مہر صاحب نے لکھا ہے۔

سرکار سے زادِ راہ کے لیے عطیے کی درخواست کی۔ ۱۱ کو سرکار نے ۲۰۰ روپے بھیجے ۱۶ مارچ کو میرزا صاحب رسید کے ساتھ نواب فردوس مکاں کو لکھتے ہیں:

"اب سنیے اپنے دعاگو کی داستان۔ منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا، اور فرمایا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا ہے" میں نے عرض کیا کہ "میں انبالے جاؤں؟" فرمایا "البتہ انبالے جانا ہوگا۔"

بعد جناب نواب صاحب کے جانے کے شہر میں شہرت ہوئی کہ دلی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں۔ گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ آپ خط اپنا دے آیا، زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔ پھر خط کے جواب میں خط محررۂ ۷ مارچ آیا۔ چنانچہ لفافہ ملحاظِ گرانیٔ وزن رہنے دیتا ہوں، اور خط بجنسہٖ حضرت کو بھیجتا ہوں۔ کل سے ایک اور خبر اڑی ہے کہ بنصیبِ اعدا لاٹ صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی ہے۔ انبالے میں دربار نہ کریں گے، اور شملے کو چلے جائیں گے۔ اب میں دو وجہ سے بین السفر والسکون متردد ہوں: پہلی وجہ خاص اور دوسری وجہ عام۔ دو سو میں سے سو کے کرسازو سامان درست کیا ہے۔ اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرچِ راہ کے واسطے رہنے دیے ہیں۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگواؤں گا۔ جو حکم آئے گا، آپ سے عرض کرکے اس کی تعمیل کروں گا۔"[1]

گورنر جنرل کے دربار میں نہ جاسکے

نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب کے عریضۂ مورخہ ۱۶ مارچ کے جواب میں کمشنر صاحب کے خط کا جس قدر مضمون دہرایا ہے[2] اس سے معلوم ہوتا ہے

۱۔ مکاتیب: ۳۴ (۲) ایضاً: ۲۵، ح ۱۔

کہ صاحب نے انبالے میں گورنر جنرل سے ملاقات نہ ہونے کا امکان ظاہر کیا تھا۔ اتفاقاً اُسی زمانے میں میرزا صاحب کے پھنسیاں بھی نکل آئیں۔ مجبوراً خود انبالے جانے کے بجائے اپنا نذر کا قصیدہ، بسبیلِ ڈاک بھیج کر شکریے کے جوابی فرمان پر قناعت کر لی، اور ۴ اگست سنہ ۱۸۶۳ء کو نواب فردوس مکاں کو تحریر کیا:

"جب انبالے میرا جانا نہ ہوا، تو میں نے قصیدۂ مدح، جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نواب معلی القاب کی نظر سے گزرانیں۔ اور یہ دستورِ قدیم تھا کہ جب میں قصیدۂ مدحیہ بھیجتا، تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بے واسطۂ حکامِ ماتحت مجھ کو آتا تا۔ اب جو میں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لنڈن گیا۔ صدائے برنخاست۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا۔ بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسمِ تحریرِ خطوط نہ رہی، تو دربار و خلعت کہاں؟ ناگاہ، کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا۔ وہی افشانی کا نذ، وہی القاب۔ جی چاہتا تھا کہ اصل خط مع سرنامہ بھیج دوں، تاکہ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مگر برسات کا اندیشہ مانع آیا۔ نقل سرنامے اور خط کی بھیجتا ہوں۔"[۱]

گورنر کا دوسرا دربار اور خلعت

سر ڈانلڈ میکلوڈ، گورنر پنجاب، نے ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو دلّی میں دربار کیا۔ میرزا صاحب دربار میں شریک ہوئے اور خلعتِ ہفت پارچہ و سہ رقومِ جواہر سے مشرف ہوئے۔ رامپور اُس زمانے میں نواب خلد آشیاں کے زیرِ حکومت تھا۔ دربار کے دوسرے دن میرزا صاحب نے سرکار کو لکھا:

"حضرت کی توجہِ باطنی، جو ہمیشہ میری مصلحِ حال اور افزایشِ قدر و وقار کی جویاں

۱۔ مکاتیب: ۲۵۔

باعث بغیر سہارے کے چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب
شریک دربار تھے۔ انھوں نے سہارا دیا۔ بروقت ملاقات میکلوڈ صاحب نے
پوچھا کہ یہ تمھارا بیٹا ہے۔ میرزا صاحب نے کہا کہ "نہیں" مگر بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔"
سالک نے خلعت ہفت پارچہ[۱] سے ۱۸۶۶ سنہ عیسوی، اور آل محمد مارہروی
نے "در خلعت زیبا وہمایوں آمد"[۲] سے ۱۲۸۳ سالِ ہجری نکالا ہے۔

---

(۱) ضمیمہ خانہ: ۱۶۱۸ (۲) دیوانِ سالک: ۱۸۲، دیوان تواریخ: ۷۴، مگر موخرالذکر میں عنوان قطعہ [illegible]
میں اس خلعت کو گورنر جنرل ...... کا عطیہ قرار دیا ہے، جو حقیقتاً مصنف کا سہو ہے۔

تعلقاتِ قلعۂ معلّٰی

تاریخ نویسی

دلی کے لال قلعے سے میرزا صاحب کے تعلقات اکبر شاہ ثانی کے وقت سے تھے۔ اُن کا ایک فارسی قصیدہ اور دو ایک قطعے اُن کی مدح میں موجود ہیں لیکن یہ تعلقات تقریباً آمد و رفت اور قصیدہ خوانی تک محدود تھے۔ شاہ ظفر کے عہد میں مولانا نصیر الدین عرف کالے صاحب، مرشدِ شاہ، اور احتشام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر کے توسط سے رشتۂ ملازمت بھی پیدا ہو گیا

جمعرات کے دن ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۶۶ھ (۴ جولائی سنہ ۱۸۵۰ء)(۲) کو بادشاہ کے حضور میں باریابی حاصل ہوئی۔ خلعتِ شش پارچہ ملازمانِ دربار نے پہلے سے پہنا دیا تھا۔ بادشاہ نے دستِ خاص سے جیغہ اور سرپیچ سر پر باندھا اور مالائے مروارید گلے میں ڈالی اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب عطا کیا۔ خدمت یہ قرار پائی کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر تاریخوں سے چن چن کر مستند واقعات میرزا صاحب کو دیتے رہیں اور یہ اپنے طرزِ خاص میں اُن واقعات کو لکھیں۔ اس خدمت کے صلے میں ۵۰ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی۔ میرزا صاحب اس کتاب کا صرف ایک حصہ مرتب کر سکے، جو مہر نیم روز کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اصلاحِ اشعار

میرزا صاحب کے تعلقِ خدمت کو کچھ اوپر چار برس ہوئے تھے کہ ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۶ نومبر ۱۸۵ء) کو شیخ ابراہیم ذوق، استادِ شاہ ظفر کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ نے اصلاحِ اشعار کی خدمت بھی میرزا صاحب کے سپرد کر دی

---

(۱) مکاتیب: ۲۵، مہر نیم روز: ۱، کلیاتِ نثر فارسی: ۱۱۶، غالب: ۲۰۲، غالب نامہ: ۵۷، ذکرِ غالب

(۲) میرزا صاحب نے سہواً انگریزی تاریخ ۴ جون لکھدی ہے جو از روئے حساب ۴ جولائی ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب نے ان دونوں خدمتوں کے متعلق نواب فردوس مکاں کو لکھا ہے

"مرا تعلق با بادشاہ جم جاہ آں بود کہ از ہفت ہشت سال تحریر تاریخ سلاطین
تیموریہ و از دو سہ سال باصلاح اشعار شہریار می پرداختم"[1]

۹ جون سنہ ۱۸۶۶ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں تحریر کیا ہے:

"جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمت تاریخ نگاری
سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا
یہ ہے:

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے، جو کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

مجروح کے ایک خط میں شاہِ ظفر سے اپنے تعلقات کی نوعیت کا تذکرہ اس
طرح کیا ہے:

"بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے یعنی، ناظر، حکیم، کسی سے
توقیر کم نہیں، مگر فائدہ وہی قلیل"[2]

سنہ ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب حادثے نے اس تعلق کو ختم کر دیا۔ اور میرزا صاحب
انگریزوں کے خوف سے اپنے نام کی شاہی خطاب والی مہر کی جگہ دوسری مہر
جس میں "غالب ۱۲۷۳ھ" کندہ تھا، خطوں پر لگانے لگے۔[3] ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء کو تفتہ
کے خط میں اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "اجزای خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ
مضر ہے۔"

---

(۱) مکاتیب ص: ۹۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ۷-۸ برس تک تاریخ نویسی اور دو تین برس تک
اصلاح کی خدمت انجام دیتے رہے لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ بلکہ کل تعلق خدمت ۷ برس رہا، جن میں
سے آخری دو ڈھائی سال اصلاح اشعار میں گزرے

(۲) مکاتیب ص ۲۳ (۳) اردوی (۱۲۰) لاہور ایڈیشن (۴) مکاتیب میں جگہ جگہ یہ مہر استعمال کی گئی ہے
ان خطوں میں پہلا ۱۰ ستمبر ۵۸ء کو شفتہ کے نام ہے (۵) اردوی: ۱۳۹، فاروقی دہلی [illegible]

تعلقاتِ رامپور

ریاستوں سے تعلق کی نوبت

میرزا صاحب کو اپنی عالی نسبی پر ہمیشہ فخر رہا۔ وہ اس زمانے میں بھی جبکہ سر پر مصائب کے بادل منڈلا رہے تھے، اور چاروں طرف نفسی نفسی کا عالم تھا اپنی نسبی انفرادیت کے گیت گاتے رہے، اور رزادشم اقرباحباب کو نہ بھولے لیکن سنہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں شیخ فیض الحسن خاں، کوتوال دہلی، کے ہاتھوں قماربازی کے الزام میں گرفتار ہوئے، اور چھ مہینے کی بامشقت قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا پائی (۱) اس واقعے کی جزئیات بہت افسوسناک

---

(۱) میرزا صاحب کی قید کا پورا قصہ یادگار غالب: ۲۹، غالب: ۱۸۳، غالب نامہ: ۲۰ھ، اور ذکر غالب: ۸۰ میں ملاحظہ ہو۔ یہاں صرف اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ حادثہ سنہ ۱۸۴۷ء میں پیش آیا تھا جو از روئے حساب ۱۲۶۳ھ کے مطابق ہے، لہٰذا خواجہ حالی مرحوم کا سنہ ۱۲۶۴ھ تحریر کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ شاہ نصیر کے ایک شاگرد گھنشیام لال عاصی دہلوی (متوفی ۱۲۸۰ھ) نے مرتبہ دیوان سنہ ۱۲۷۹ھ بقول خمخانۂ جاوید ۵: ۲۰ ایام غدر سنہ ۱۸۵۷ء نے اس واقعے سے متعلق ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے اور قطعے کے ساتھ نثر میں واقعے کی جزئیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مادہ ہائے تاریخ سے بھی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء نکلتے ہیں۔ عاصی کی عبارت یہ ہے۔

مرزا نوشہ شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب، متخلص اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق کی عداوت پیدا ہو گئی، اور اس نے بعلت قماربازی ان کو قید کرا دیا جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی:

ستم ایجاد سے فصلی ہیں تو سب اظہار طوریاں ہے
اور اٹھارہ سو سینتالیس میں یہ عجیب غریب سال ہے

ظلم فلک ہے نہ کیونکر موسٹن اور گریہ سے دل پر ہو
دہلی کی کٹا فی مکان جو ہوں سے بدنال ہے

رہائی، وزیر سے میرزا نوشہ کی کیسے نکتہ ہو
روشن مختصر اس وان بن کے فیض الحسن خاں ہے

سرباز دیکھ کر شفقت لقد بولنے عاصی
اسد کو جو ۱۷ تکبیر پہنچا ل ہے گیر کر ڈالا بہ زنداں ہے

بہ وقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھکر موقعہ پر گئے۔ اور ظاہر کیا۔ سواریاں زنانی آئی ہیں اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینہ کے اندر جمعیت بہت تھی اور کچھ امادی برقنداز پہنچ گئے، گرفتار کر کے قید کرا دیا بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برات کے ساعی ہوئے مگر قید ہو ہی گئے

(باقی صفحہ ۷۰ پر)

شخصیں، کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں اُن کی وجاہت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا۔ پولیس اور عدالت کے اس نامناسب سلوک سے ان کی حسِ غیرت سخت مجروح ہوئی۔ خود اپنی نظر میں شرافت خاندان پر دھبّا آ گیا، اور وہ اپنے آپ کو رؤسائی ہندوستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی، قیدیان جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس پہنچ گئے۔ درحال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا:

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔" (کلام حالی ۲۲۳)

مولانا مہر کا بھی یہ ارشاد صحیح نہیں کہ سنہ ۱۲۶۳ھ کی عید الفطر ۱۳ اگست سنہ ۱۸۴۷ء کو تھی اور عید الفطر ۸ نومبر سنہ ۱۸۴۷ء کو ہوئی کیونکہ ۱۲۶۴ھ کی عید ۱۳ اگست سنہ ۱۸۴۸ء کو ہوئی تھی۔ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء میں جو عید الفطر آئی، وہ اولاً تو سنہ ۱۲۶۴ھ کی تھی، اور ثانیاً ۲ ستمبر کے مطابق تھی۔ مہر صاحب کے بیان میں ایک اور تسامح بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کو ۲۵ جون سنہ ۱۸۴۷ء یا اس سے چند روز قبل گرفتار کیا گیا۔ اس خیال کی بنیاد، خود مصنف کے بیان کے مطابق، احسن الاخبار بمبئی کی ۲۵ جون کی اشاعت میں اس خبر کا شائع ہونا ہے۔ پہلے تو یہی باور کرنا مشکل ہے کہ آج سے تقریباً سو برس پہلے دیسی اخباروں کو اتنے دور دراز مقامات سے ہمہ روزہ خبریں مل جاتی تھیں لیکن اس سے قطع نظر کر کے بھی ۲۵ جون کو یا اس سے چند روز قبل گرفتاری کا واقع ہونا محلِ تامل ہے۔ اس لئے کہ محمد اکرام صاحب نے احسن الاخبار کا جو اقتباس دیا ہے وہ فقرہ "دہلی ۱۵ جمادی الثانی" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ بیان ہونے والی خبر دہلی سے ۱۵ جمادی الآخرہ کو بھیجی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس خبر سے متعلق واقعہ اسی تاریخ کا یا اس سے قبل کا ہوگا۔ بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۶۳ھ کی پندرھویں تاریخ ۳۱ مئی سنہ ۱۸۴۷ء کے مطابق ہے۔ لہٰذا مرزا صاحب کی گرفتاری ۳۱ مئی سے پہلے ہونا چاہیے۔ اخبار فوائد الناظرین جلد ۲ نمبر ۹ مورخہ ۳۱ مئی سنہ ۱۸۴۷ء صفحہ ۸ میں دہلی کی خبروں کے تحت یہ عبارت درج ہے۔ "۲۵ ماہ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پا کر وہاں گئے، اور جناب مرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کر کوتوالی میں لے گئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں۔" یہ واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ مرزا صاحب کی گرفتاری ۲۵ مئی سنہ ۱۸۴۷ء (مطابق ۹ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۶۳ھ) کو عمل میں آئی تھی۔

حالی کے بیان سے یہ امور بالتصریح معلوم ہو جاتے ہیں (۱) کوتوال کا نام (بقیہ صفحہ ۸۱ پر)

سنہ ۱۸۵۲ء میں ریاست جیپور سے اتفاقاً رابطہ پیدا ہوا۔ میرزا تفتہ نے اس کی تفصیلات دریافت کرتے ہوئے لکھا کہ میرا بھی خیال رہے۔ اس کے جواب میں جمعہ دہم دسمبر سنۂ مذکورہ کو میرزا صاحب نے لکھا:

جیپور کا امر محض اتفاقی ہے، بے قصد و بے فکر در پیش آیا ہے۔ ہوس نا کا نہ ادھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بہرا ہو گیا ہوں۔ سرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں۔ بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔۹؎

چونکہ استاد یا پیر بن کر ملتے ہیں ان کا درجہ کم از کم والی ریاست کے مساوی ہونا یقینی تھا، اور بصورت مداحی، ممدوح سے مساوی برتاؤ کی آرزو نہیں پیدا ہوتی، اس لئے ان صورتوں میں میرزا صاحب کو اپنے اخلاقی

ادبیت۸؎ (۱) گرفتاری کی تدبیر (۲) میرزا صاحب اور ان کے رفقا کے ساتھ پولیس کا غیر منصفانہ سلوک (۳) رہائی کی سفارش کرنے والے کا نام (۵) اور جس سے سفارش کی گئی تھی اس کا تعین (۶) میرزا صاحب کے ایک شعر کی وجہ تنظیم۔ اور چونکہ یہ معاصر بیان ہے اس بنا پر ہم اس سے خود میرزا صاحب کے بعض بیانوں کی تائید اور بعض کی تصحیح کر سکتے ہیں۔
ڈاکٹر راس صاحب کے دہلی کے تعین، مدت قیام اور رہائی کے سلسلے میں فوائد الناظرین، ج ۹ نمبر ۱۸ مورخہ جولائی سنہ ۱۸۵۱ء صفحہ ۹۵ یہ اقتباس دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔
"واضح ہو کہ بتاریخ ماہ حال کو اکثر افسران انگریزی ملازم گورنمنٹ متعینہ ضلع دہلی نے ڈاکٹر راس صاحب سول سرجن دہلی کو ایک کاپی جس میں کچھ الفاظ یا عبارت بھی تھی درباب توصیف ڈاکٹر صاحب موصوف کندہ ہے مع ایک چٹھی شکریہ وغیرہ کی پیش کی کہتے ہیں کہ یہ صاحب بارہ برس کے عرصے سے دہلی میں مامور تھے اور ان کی توجہ اور مہربانی کے سبب کیا انگریز کیا ہندوستانی، رعیّت اور احسان مند اور شکر گزار ہیں۔ چونکہ ان ڈاکٹر صاحب کے عہدہ اور رتبہ کی ترقی ہوئی ہے اس لئے عنقریب یہاں سے تشریف لیجانے کو ہیں۔ اور سنا جاتا ہے کہ بجائے صاحب موصوف کے غالباً ڈاکٹر بالفور صاحب مقرر ہوں گے" (اردو ادب ۱۱۳)۔

دیکھنے کے احساس کا خطرہ نہ تھا، اور اب وہ ہر ریاست سے اسی قسم کے تعلقات کے خواہاں تھے۔

رامپور سے ابتدائی تعلق

نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نور اللہ مرقدہ، کے صاحبزادے اپنے والد ماجد کی تخت سے دست برداری کے بعد، حکومت انگلشیہ کی زیر حمایت رامپور سے باہر اقامت گزین ہونے پر مجبور ہوئے تھے، اور سابقہ تعلقات کی بنا پر پہلے لکھنؤ اور بعد ازاں دار السلطنت دہلی کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ میرزا صاحب جس زمانے میں دلی تشریف لائے، یہ خاندان وہاں فروکش تھا۔ چونکہ یہ حضرات صاحب علم و فضل تھے، اس لیے ان سے میرزا کے روابطِ خلوص و اتحاد پیدا ہو گئے۔

ایک عریضے میں میرزا صاحب نے ان روابط کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

همدرین کنج، که مسکن من است، شنیده‌ام که والاشان زین العابدین خان بہادر بشہر آمده اند۔ نیازمندی من با مرحوم نواب عبید اللہ خان بہادر، و مہرورزی من با جعفر علی خانِ مرحوم، و محبت و خلت من با نواب عبد الرحمٰن خان بہادر مغفور، کسانی دیده اند، و آن مدارج کی در نظر دارند، که ایشان را در ضمیر میگذشت که گدای گوشہ نشین ما باید دید[1]

نواب فردوس مکاں کی شاگردی

نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکاں، نے سنِ شعور میں قدم رکھ کر، اپنی خاندانی روایات کے ماتحت طلب علم کی راہ پر گامزنی کی، دلی کے اساتذہ میں، مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور مولوی فضلِ حق

(۱) مکاتیب: ۹۔

خیرآبادی عربی میں، اور مرزا صاحب فارسی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے ان سبب سے خاندان رامپور کی دلبستگی تھی اس لئے نواب فردوس مکاں کی تعلیم انھیں حضرات کے سپرد کی گئی، اور حسنِ اتفاق سے مرزا صاحب ایک ایسے طالب علم کے استاد قرار پائے جس کو قضا و قدر ریاست رامپور کا تاج و تخت سونپنے والی تھی۔[۱]

نواب جنت آرامگاہ کی مداحی

سنہ ۱۸۴۰ء میں، نواب سید محمد سعید خاں بہادر، جنت آرامگاہ، وارث

---

(۱) نواب فردوس مکاں کا مرزا غالب سے فارسی پڑھنا بزرگانِ شہر کی روایات پر مبنی ہے خواجہ حالی مرحوم نے بھی یادگارِ غالب (ص ۲۳) حاشیہ میں ذکر کیا ہے کہ نواب یوسف علی خاں بہادر نے مرزا صاحب سے دہلی میں فارسی پڑھی تھی۔ اس کی زبانی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ مرزا صاحب باوجود معلمی پیشہ نہ ہونے کے اعزا اور مخصوص احباب کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے خاندان رام پور کے افراد سے ان کے تعلقات مخلصانہ تھے۔ ان حالات میں بعید نہیں کہ انھوں نے نواب فردوس مکاں کو فارسی پڑھائی ہو۔

مرزا صاحب نے نواب فردوس مکاں سے اپنے قدیم تعلقات کا جن لفظوں میں ذکر کیا ہے ان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ تفتہ کو لکھا ہے: "... نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رامپور ... میرے آشنائے قدیم ہیں" (اردوی: ۲۸۲) مرزا صاحب تفتہ کے خط میں صراحت کرتے ہیں کہ "نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس سے میرے دوست ...... ہیں" (اردوی: ۵۴) اردوی معلیٰ کے نسخۂ مطبوعہ کی رو سے یہ خط سنہ ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا تھا مگر اس میں مرزا صاحب نے رام پور کے پہلے سفر کی روداد لکھی ہے، اس لئے اس کو سنہ ۱۸۶۰ء کا نوشتہ ہونا چاہیئے۔ اور سنہ ۶۲ء میں دوستی پر ۳۰ سال گزرنے کے یہ معنی ہیں کہ سنہ ۱۸۳۲ء میں یہ رشتہ پیدا ہوا۔ نواب فردوس مکاں سنہ ۱۸۱۶ء میں متولد ہوئے، اور ۱۸۴۰ء میں اپنے والد ماجد کی تخت نشینی پر رامپور تشریف لائے تھے۔ بنابریں سنہ ۱۸۳۲ء میں ان کو مرزا صاحب کا دوست نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ شاگرد ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس لئے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۶ سال کی ہوگی، جو طلب علم کا موزوں تر زمانہ ہے۔

یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ میں نے "تیس بتیس ...... میں" سے "بتیس" کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ "تیس" کے پیش نظر آغاز تعلقات کا سنہ ۱۸۲۷ء قرار پاتا ہے، جو اس لئے صحیح نہیں کہ اگست سنہ ۱۸۲۷ء سے نومبر سنہ ۱۸۲۹ء تک مرزا صاحب سفرِ کلکتہ کے سلسلے میں دہلی سے باہر رہے تھے۔

تخت رامپور قرار پائے۔ نواب سید عبداللہ خاں بہادر برادر خُرد جنت آرامگاہ نے، جو میرزا صاحب کے بہت گہرے دوست اور اس وقت میرٹھ کے صدر الصدور تھے، سابقہ تعلقات کی بنا پر میرزا صاحب سے نواب جنت آرامگاہ کی مدح میں قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میرزا صاحب نے معذرت کرتے ہوئے لکھا،

"خدام بلند مقام کہ سرانجام قصیدہ بقصدِ نام آوری از غالب بینوا چشم داشتہ اند، مگر آں فرسودہ روان افسردہ دل را کہ ہنوز نمردہ است، زندہ پنداشتہ اند۔ . . . کاش، گشایش این کار، چوں صنعت لفاظی و گلدستہ بندی، تنہا بکوشش دست و بازو صورت بستی، تا چشم از خستگی دل پوشیدہ می و فرمان پذیرانہ در پردازش کار کوشیدی میکنم، چوں سر این رشتہ در دست دل است، تا دل بجای نباشد، زبان سخن سرای نباشد۔ دیدہ وران صاحبدل دانند کہ چہ قدر با دیدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشی بدین نغزی کہ بالغ نظراں پسندند، انگیختہ شود۔ این دلِ شکستہ بہم نہ پیوستہ کہ در سینۂ من و ہما نا دشمن دیرینۂ منست، زنہار بکار سخن گستری نیاید، و معنی آفرینی را نشاید۔ . . . اگر دانند کہ فلانی، با این ہمہ پریشانی، سخن گفتن میتواند، و من نیز دانم کہ میتوانم، در مدح بندگان سپہر آستان، امیر المسلمین قبلۂ دنیا و دین، سرور سلطان نشان، نواب سید محمد سعید خاں بہادر بالقابہ چرا سخن نرانم؟ تا اگر درین گیتی لعل و گہر سودہ بہ دہ باشم، خود در آن گیتی دین و ایمان زیان نکردہ باشم۔ امید کہ در بارۂ گزارش بدان ستایش نظماً و نثراً نامہ نگار را از اموات شمارند، و بدعای سلامت ایمان، کہ حسنِ خستگی انجام بہمان تواند بود، یاد آرند۔"[1]

لیکن میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۵۴ء میں جس کام کے سرانجام نہ پانے کا عذر کیا تھا، چند سال کے بعد قدرت ان سے وہی کام لینے والی تھی۔

۱۔ کلیات نثر فارسی: ۲۱۹

نواب فردوس مکاں کی تخت نشینی اور رشتۂ استادی کی تجدید

چنانچہ اس مراسلت کے پندرہ سال بعد اپریل سنہ ۱۸۵۵ء میں نواب جنت آرامگاہ نے وفات پائی[۱] اور نواب فردوس مکاں تخت نشین ہوئے۔ میرزا صاحب نے شاہ دہلی سے رابطے کو مدنظر رکھ کر قطعۂ تاریخ جلوس ارسال کیا۔ دربار رامپور سے اس کا کوئی جواب نہ گیا[۲] اور تقریباً دو سال تک تجدید تعلقات کی یہ کوشش بار آور نہ ہوئی۔

حسن اتفاق سے مولانا فضل حق خیرآبادی رامپور میں فروکش تھے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً سرکار کے روبرو میرزا صاحب کے اشعار پڑھے، جس سے سرکار اُن سے مراسلت اور مشورۂ سخن کے مشتاق ہو گئے۔

مولانا نے میرزا صاحب کو لکھا کہ سرکار کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جائیے اور اصلاحِ اشعار کا کام انجام دیجیے۔ مولانا کا نامۂ گرامی میرزا صاحب کو ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۵۷ء کو موصول ہوا۔ ۲۸ جنوری کو انھوں نے بتعمیل ارشاد نواب فردوس مکاں کی خدمت میں پہلا عریضہ ارسال کیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ فروری کو اپنے کچھ اشعار بغرض اصلاح بھیجے اور ان کے ساتھ تحریر فرمایا:

"نمیقۂ انیقۂ بلاغت آگین مشتمل بر رسیدِ خط مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضل حق صاحب با دیگر مراتب محبت و اشفاق بعبارات رنگین و دلنشین در حینِ انتظار سرمہ کشِ عیون، وصولِ نشاط مشمول گردیده، با طلاعِ خیریتہا سرمایۂ سرور نامحصور افزوده، از مزیدِ شفقت و ائتلافِ قلبی مسرور شد۔"[۳]

۱۔ مکاتیب: ۷۴

۲۔ میرزا صاحب کے شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مہر نیمروز کا غالباً مطبوعہ نسخہ شوال ۱۲۷۱ھ و جون سنہ ۱۸۵۵ء میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں تحفۃً ارسال کیا تھا۔ نواب صاحب ۱۳ رجب سنہ ۱۲۷۱ھ (دیکم اپریل سنہ ۱۸۵۵ء) کو تخت نشین ہوئے تھے۔ شیفتہ کا تخت نشینی کے چند ماہ بعد میرزا صاحب کی تصنیف کا تحفے میں بھیجنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ انھوں نے خود میرزا صاحب کے اشارے سے ایسے کیا تھا۔ شیفتہ کے خط کے لیے ملاحظہ ہو رجسٹر صیغۂ احباب جس میں مثل نمبر ۹۸ بستہ نمبر ۳۳ کا خلاصہ درج ہے۔

۳۔ مکاتیب: ۳، ۴ ج ۳۔

اس فرمان نے میرزا صاحب میں نیا ولولہ پیدا کیا، اور انھوں نے ۱۱ فروری کو سرکار کی مدح میں قصیدہ لظم کر کے بذریعہ ڈاک ارسال کیا۔ اس کی ایک نقل میرزا صاحب نے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجی تھی، جو انھیں آگرہ میں موصول ہوئی۔ وہاں سے ۱۱ ماہ اپریل کو مولانا نے سرکار کو تحریر فرمایا :

" بجز عرض میرساند کہ خیرسگال با فضال ایزد بیچال بصحت و اعتدال یا ور رسیدہ ملاطفہ مرزا صاحب مشفق نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب متخلص بغالب مع قصیدہ بہیہ کہ در مدح حضور فیض معمور منظوم کردہ اند، از ڈاک خانہ یافتہ۔ مرزا صاحب موصوف در ثنا و ستائش موزونی طبع اقدس و توصیف غزلہای گوہر نشان شرف ارسال یافتہ بودند، و شکر و سپاس عطائی مبلغ پانصد روپیہ کہ بردو دفعہ بمرزا صاحب موصوف عنایت شدند، اسہاب در تحریر فرمودند، حالانکہ طبع اقدس در علوم عقلیہ و فنون حکمیہ آنچناں دقیقہ رس کہ عدیل آں در مملکت ہندوستان کہ حال علمای آں تفصیلاً معلوم است، کمتر بلکہ معدوم است۔ نظم شعر و فہم آں و ابداع معانی تازہ و مضامین مبتکرہ و سرد الفاظ فصیحہ و تراکیب بلیغہ بحسب اوزان عروض نسبت بعلو طبع اقدس و بلندی افکار صائبہ ازادنی مراتب است۔ مرزا صاحب ازیں حال لا علم اند۔ طبع عالی و فکر صائب در دقائق حکمیہ و معضلات فلسفیہ بجائی میرسد کہ رسیدن افہام علّام اعلام تا آں مقام معلوم الانتفا ست۔ دریں سخن ہیچ مبالغہ و اغراق نیست۔ حضور را مع الوزشفیق نفیس امتحانات فرمودہ اند، و مکرر ہم امتحان ہم سہل است۔ و نظر ہمت والا در جود و سخا بذل الاف الوف را قلیل تواں پنداشت۔ مرزا صاحب حق سپاسگزاری ادا کردہ اند۔ نظم قصیدہ مدحیہ در غایت بلاغت و انسجام است۔ غالباً شرف اندوز ملاحظہ والا شدہ باشد" [۱]

۱۔ مثل نمبر ۹۰ صیغہ انشاء عہد نواب فردوس مکان، محکمہ دارالانشاء

مولانا کی اس تحریر نے میرزا صاحب کے سابقہ تعلقات از سرِ نو استوار کر دیے اور ایک مخلص دوست کی کوشش سے میرزا صاحب کی یہ تجویز کہ "آیندہ ریاستوں میں پیر یا استاد بن کر رسوخ حاصل کرنا چاہیے" ریاست رامپور میں کامیاب ہو گئی۔

نواب فردوس مکاں کا سالِ شاگردی

نواب فردوس مکاں کے سالِ تلمذ کا تذکرہ میرزا صاحب نے متعدد خطوط میں کیا ہے۔ لیکن تقریباً ہر خط میں اُن کا بیان دوسرے خط سے مختلف ہے۔ مارچ سنہ ۶۰ء میں مجروح کو لکھا ہے:

"سنہ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رامپور، کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال یعنی سنہ ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم اُن کو تخلص دیا گیا۔ ہمیشہ غزلیں اردو کی بھیجتے۔ میں اصلاح دے کر بھیج دیتا، گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، پنشن کھلا ہوا، اُن کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں، تو زندگی کا مدار اُن کے عطیے پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے، میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔"[1]

اسی مہینے میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی سنہ ۵۹ء سے سو روپے مہینا ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔"[2]

اس تخمینے کی رو سے، نواب فردوس مکاں کا سالِ شاگردی سنہ ۵۴ یا ۵۵ء

۱۔ اردوی، ۲۸۳ و عود: ۱۳۶۔ عود میں "پنشن کھلی ہوئی"، بصیغۂ مونث ہے (۲) اردوی: ۵۱۱

قرار پاتا ہے، لیکن ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء کو سیاح کو تحریر کیا ہے:

"ایک قرن ۱۲ برس سے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں، والی رامپور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے، اور سو روپیہ مہینا ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے"۔[1]

اس حساب سے نواب فردوس مکاں کو سنہ ۵۳ء میں مرزا صاحب سے مشورۂ سخن شروع کرنا چاہیے۔ لیکن ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب نے ۲۸ جنوری سنہ ۵۷ء کو اپنا پہلا عریضہ ارسال کیا تھا، اور اس میں یہ لکھا تھا کہ سنہ ۵۵ء میں قطعۂ تاریخ جلوس کا ارسال ربط شاہ و گدا کی بنا پر تھا، اب یہ عریضہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ارشاد کی تعمیل میں لکھ رہا ہوں۔ اس کے جواب میں ۵ فروری سنہ ۵۷ء کو نواب فردوس مکاں نے گرامی نامہ تحریر فرمایا، جس کا ضروری حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ارادۂ تلمذ پر دال ہیں:

"مشفقا، ہرچند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم نشدہ بود، لیکن محض بجہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چوں سبیلی بہ ازیں بنظرم نرسید، لہذا چند ابیات واہیات موزوں نمودہ، بغرضِ اصلاح بخدمت آں یگانۂ آفاق مرسل گشت۔ چشم داشت کہ بعد اصلاح غزلہای مذکور مع کدام طرح جدید لطف فرمودہ شوند"۔[2]

اس کے جواب میں مرزا صاحب نے ۱۲ فروری کو عریضہ تحریر کیا، اور اس میں غزلیات اور ہنڈوی کے پہنچنے کی اطلاع کے بعد عرض کیا کہ "اشعار خود بہنگام خویش خواہد رسید"۔ نیز ۱۵ فروری کو اصلاح شدہ غزلوں کے ساتھ جو عریضہ بھیجا اس میں تخلص کے متعلق لکھا:

۱۔ اردوی: ۱۲ (۲)، مکاتیب: ۳، ح ۳۔

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں، ان میں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیجیے، مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو، تو بہت مبارک ؛" ۱

سرکار نے یکم مارچ کو جواباً تحریر فرمایا:

"منجملہ الفاظ تخلص لفظ ناظم مطبوع طبع نیاز گشت" ۲

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ نواب فردوس مکاں ۵فروری سنہ ۵۷ء کو میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے، ۱۵ فروری کو میرزا صاحب نے انھیں تخلص کے لیے چند الفاظ لکھے، اور یکم مارچ سنہ ۵۷ء کو سرکار نے ناظم تخلص پسند آنے کی میرزا صاحب کو اطلاع تحریر فرمائی ۳

۱۔ مکاتیب: ۲، ۲۔ ایضاً: ۳، ۳۔ امیر مینائی مرحوم نے نواب فردوس مکاں کے ذکر میں تحریر فرمایا ہے: "طبیعت ازل سے موزوں پائی تھی سخن گوئی کا ذوق، اردو شعر فرمانے کا شوق تھا۔ پہلے مومن خاں صاحب دہلوی سے مشورہ رہا، پھر میرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ ہوا۔ آخر بوضع استادان لکھنؤ موزوں فرمانے لگے۔ منشی مظفر علی صاحب اسیر کو، جو آج لکھنؤ میں سحبان عصر و یکتائے دہر ہیں، کلام دکھانے لگے" (انتخاب یادگار: ۲)

جہاں تک حکیم مومن خاں مرحوم کی شاگردی کا تعلق ہے، بظاہر سرکار کے اس ارشاد کے بعد کہ "کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم نرسیدہ بود" اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مومن خاں کے کلیات فارسی (نسخۂ قلمی کتاب خانہ رامپور ورق ۷۰ الف) میں دو بیت کا ایک قطعہ ملتا ہے، جس میں نواب فردوس مکاں کے ورود دہلی کی تاریخ نظم کی ہے۔ مگر تلمذ کی طرف ہی نہیں نفس شعر گوئی کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس کا عنوان یہ ہے: "تاریخ آمدن یوسف علی خاں بہادر بہ دہلی" مذکورہ اشعار یہ ہیں: عمر خضر و نیز رشک زلیخا یہ جوان سالی یوسف علی خاں بہادر، رساند گردا با دنج عزیزی بدر رو مال یوسف علی خاں بہادر برو گدیہ نقد حصول آرزو یا دزکال یوسف علی خاں بہادر، ظفر درکاب و کرم گرد راہش و خوشحال یوسف علی خاں بہادر تو ان یافتن سال ورود ش بدہلی ز اقبال یوسف علی خاں بہادر۔

بظاہر یہ ماننا دشوار ہے کہ امیر نے نواب صاحب کے والد ماجد کے متعلق کوئی خلاف واقعہ بات اپنی طرف سے نواب صاحب کی لاعلمی میں درج کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ مگر نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد امیر اللغات کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اس کے دیباچے میں امیر مرحوم نے لکھا کہ نواب ناظم مجھ سے بھی مشورۂ سخن فرماتے تھے۔ ان کے اس بیان کو احسن اللہ خاں ثاقب نے خطوط امیر صفحہ ۱۹ میں، مہکش حیدرآبادی نے یادگار امیر صفحہ ۸ میں، جناب جلیل نے سوانح امیر صفحہ ۲ میں اور آغا مینٹھوی نے حیات امیر (صفحہ ۷) میں دہرایا ہے

میرزا صاحب کی خیر خواہی

میرزا صاحب کے چند فقرہ استادی کے ابہام پر چند ماہ گزرے تھے کہ غدر سنہ ۵۷ء کے آثار پیدا ہونے لگے۔ میرزا صاحب نے اپنے محسن شاگرد کی خدمت میں کچھ خطوط لکھے، جو ان کی حسب ہدایت چاک کر دیے گئے۔ اس ہدایت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ان تحریروں کا مضمون سیاسیات سے متعلق تھا۔ اس لیے کہ جب آتش غدر بھڑک اٹھی، اور نواب فردوس مکاں کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ اپنا رویہ متعین کریں، تو انھوں نے انتہائی ہوشمندانہ طریق کار اختیار کیا۔ دستنبو میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

"دو چشم بد دور! فیروز مندیٔ مہر، نواب یوسف علی خاں بہادر فرمانروای رامپور کہ از دیرباز درون سرزمین بہ زبانی و شاہنشاہی نیاکان خویش را جانشین است با جہانبانان انگلند در مہرورزی و یکدلی استواری پیمانش بدان آئین ست کہ دست روزگار در ہزار سال چہار گونہ کشاکش آن را نتواند گسست، چہ ناچار بفرستادن پیام خشک، زبان ہم سایگان از گفتگو بست۔"

یہ رویہ، جسے میرزا صاحب نے پیام خشک سے تعبیر کیا ہے، اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، جب تک حالات کا صحیح علم اور ان کے پیدا ہونے

(بقیہ صفحہ ۷۹) اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر کا استاد ناظم ہونا واقعہ تھا تو انھوں نے اس کا ذکر انتخاب یادگار میں کیوں نہ کیا، اور بصورت دیگر دیباچہ امیر اللغات میں کیوں بیان فرمایا؟ چونکہ اس کا کوئی مسکت جواب نہیں ملتا، اس لیے ہم نواب ناظم کے اپنے بیان پر امیر مرحوم کے بیان کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ ہاں امیر لکھنوی کی شاگردی کا ثبوت سرکار کے فرمان بنام امیر مورخہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۶۳ء سے بھی ملتا ہے (نقل ۵۰۸ صحیفۂ احباب)۔ اس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آخر سنہ ۶۰ء میں میرزا صاحب نے ضعف پیری و غلبۂ امراض کے باعث سرکار سے استدعا کی تھی کہ آئندہ انھیں خدمت اصلاح سے معاف رکھا جائے (اردوی ۱۳۹) غالباً سرکار نے اس استدعا کو منظور فرما کر امیر مینائی کے مشورے سے آپ کے پاس بھی اپنا کلام بھیجنا شروع کر دیا تھا مگر میرزا صاحب سے بھی رشتۂ شاگردی منقطع نہیں فرمایا، چنانچہ مرض الموت میں بھی ایک سلام لکھ کر ان کے پاس بغرض اصلاح ارسال کیا تھا جو بعد انتقال واپس آیا۔ (مکاتیب: ۲۰۶، ۱۱۲؛ کلیات نثر فارسی: ۳۰۸)

کے واقعی اسباب قبل از وقت نہ معلوم ہو چکے ہوں

ترکِ مراسلت

غدر کے ساتھ حکومت ہند کے سلسلۂ نامہ رسانی میں اختلال واقع ہو گیا، نیز دہلی سے خط و کتابت کرنے میں کاتب و مکتوب الیہ کے لیے لال قلعے یا حکومت ہند کی نظر میں مشتبہ قرار پانے کا خطرہ تھا، اس لیے قاصد کے ذریعے سے خیریت گوئی دعائیت جوئی بھی سہل اور بےخطر نہ رہی۔ ادھر نواب فردوس مکاں روہیلکھنڈ کی بغاوت فرو کرنے میں منہمک تھے۔ ان حالات کا نتیجہ نکلا کہ میرزا صاحب اور سرکار میں اگست سنہ ۵۷ء سے جنوری سنہ ۵۸ء تک مراسلت نہ ہو سکی۔ ساتویں عریضے میں میرزا صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"در زمان چیرہ دستی گورنمکان سپاہ و روسیاہ، سررشتہ پیام از ہم گسست ناچار
لب فرستادن نامہ بر، رساندن نامہ و پیام صورت نبست۔ درین روزگار
کہ فرمان داور دادگر روائی و سلسلۂ آمدشد نامہ رسانی یافت، نامہ
و پیام روان داشتہ شد، و نارسیدن پاسخ از چنان پنداشتہ شد
کہ مگر آن نیایش نامہ نرسیدہ باشد، یا فرط اعتنا مانع تحریر جواب
گردیدہ باشد . . . . . بہ نگاشتن این نامہ زحمت افزای قامت ملازمان
والا رو دادہ وشتہ ام، کہ اگر فرستادن نامہ محض از روی اعتنا است
ہیچ پیدا گردد کہ بہ نہایت تقریظ و در رعایت افراط است۔"

میرزا صاحب کی مالی پریشانی اور تقرر وظیفہ

میرزا صاحب کو خزانۂ کلکٹری سے ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار پنشن ملا کرتی تھی، جسے غدر کے بعد تعلق قلعہ کے سبب سے گورنمنٹ نے مسدود کر دیا۔ ان کے بعد میرزا صاحب نے بیگناہی ظاہر کی، لیکن مدت تک شنوائی نہ ہوئی۔ غدر سے قبل نواب فردوس مکاں نے وقتاً فوقتاً کچھ عطیات بھیجے تھے میرزا

صاحب نے تیجر کو ان عطیات کے بارے میں لکھا ہے [1]

"نواب یوسف علی خان بہادر والیٔ رامپور ...... بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجیں میں اصلاح دے کر بھیج دیا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔"

لیکن ایامِ غدر میں وہ بھی امداد نہ کر سکے۔ غدر کے بعد ستمبر ۱۸۵۸ء میں میرزا صاحب نے ایک قصیدے کے توسط سے سالانہ امداد کی درخواست کی۔ فردوس مکاں نے متعدد بار ڈھائی ڈھائی سو روپے نقد عطا کیے۔ میرزا صاحب کو اوقات بسر کرنے کے لیے ماہوار امداد کی ضرورت تھی۔ انھوں نے نواب صاحب کے حضور میں مزید پرورش کی درخواست ارسال کی۔ سوءِ اتفاق سے مثل میں یہ درخواست موجود نہیں۔ البتہ عریضہ مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۵۹ء میں ایک حسنِ طلب پر مشتمل نیاز نامے کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"اسی نیاز نامے میں کچھ حسنِ طلب بھی تھا۔ افسوس کہ ایسا خط ضروری نہ پہنچا [2]"

چونکہ اول الذکر عریضہ سرکار کو موصول نہ ہوا، اور دوسرے میں اس حسنِ طلب کی تصریح نہ تھی، اس لیے مجبوراً ۱۰ جولائی سنہ ۵۹ء کو میرزا صاحب نے ایک اور عریضہ ارسال کیا۔ مثل میں یہ عریضہ بھی موجود نہیں ہے، لیکن سرکار کے جوابی فرمان مورخہ ۱۴ ذیحجہ سنہ ۱۲۷۵ھ (۱۷ جولائی سنہ ۵۹ء) سے اس کے مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔ سرکار نے ارشاد فرمایا ہے:

"...... سابق صحیفہ الفت آگین مورخہ دسویں اس مہینے جولائی سنہ حال کا بعین انتظار کے غازہ آرائی چہرہ وصول، نشاط شمول کا ہوا۔ اور اوپر مراتب مرقومہ کے مطلع کیا۔ اور ان غزلوں کی اصلاح سے مخلص کو کمال مسرت ہوئی۔ اور بنظر آپ کی زیر باری کے اس مہینے جولائی سے سو روپیہ مہینہ مقرر کیا گیا۔ اور دفتر میں نام آپ کا مندرج کیا گیا۔"

۱۔ اردوی: ۳۸۳ و عود: ۱۳۴۔ ان عطیوں کی تفصیل آیندہ صفحوں میں ملاحظہ ہو۔ (۲) مکاتیب: ۱۴

ہر مہینے تنخواہ مقرر پہنچے گی۔ یقین ہے کہ آپ بھی اس کو محمول کمال محبت پر فرمائیں گے"۱

اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میرزا صاحب کسی وجہ سے خط نہ لکھ سکے تھے، سرکار ان کے خط کے منتظر تھے۔ ۱۰ جولائی کے عریضے میں انھوں نے اپنی زرباری کا ذکر کیا، تو سرکار نے ازراہ پرورش سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر فرما دی۔ سرکار کار و بکار تقرر وظیفہ ۱۷ جولائی کو صادر ہوا اور میرزا صاحب کو پہلی تنخواہ کی ہنڈوی ۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۵۹ء کو روانہ کی گئی۔

اپریل سنہ ۱۸۶۰ء میں میرزا صاحب نے مجروح کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے تنخواہ جاری ہونے کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں"۲

ہنڈوی بھیجنے کا طریقہ

چونکہ میرزا صاحب رامپور میں فروکش نہ تھے، اس لیے انھیں ہر مہینے کی

۱۔ نقل نمبر ۳ مجموعہ ۳ حساب ۲۱، اردوی ۱۶۲، ۷ و ۵۔ میرزا صاحب کی تنخواہ کے تقرر کے سلسلے میں مولانا مہر فرماتے ہیں: "غدر کے بعد جب قلعے کی تنخواہ جاتی رہی، اور خاندانی پنشن بند ہو گئی، تو غالب نے ایک فارسی قصیدہ نواب یوسف علی خاں کے پاس بھیجا جس میں گہرے دوستانہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب کے تغافل کا شکوہ کیا گیا تھا...... اس قصیدے پر نواب یوسف علی خاں مرحوم نے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ غالب کے لیے مقرر فرما دیا، جو ماہ بماہ نواب صاحب خود غالب کو بھیجتے تھے" (ص ۱۶۱)، لیکن معاملہ بالا دستاویزوں کے پیش نظر مجھے مولانا کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ سرکار نے اس قصیدے پر میرزا صاحب کی تنخواہ مقرر کی، اور نہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس کے بعد نواب صاحب کو ترجیع بر لی کی معیار کیا دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں مفتی یا قاضی یا منشی یا عامل کے عہدے کا طلبگار نہیں، بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا حصہ مجھے ماہ بماہ پہنچتا رہے (۱۲۲، ۱۳)۔ پھر قصیدے میں میرزا صاحب نے ماہانہ کی جگہ سالانہ امداد کی درخواست کی ہے۔ فرماتے ہیں:

ہر سال ازان شہر بمن دایہ روانی دہ

کز بہر ہمیں گشتہ ام از قطاع تو شامل

دسویں بارھویں تاریخ تک سو روپے کی ہنڈوی سرکار کے گرامی نامے کے ساتھ ملفوف بھیجی جاتی تھی۔ بعض عرائض میں میرزا صاحب نے لکھا ہے کہ پہلی دوسری تاریخ تک روپیہ بھیج دیا جایا کرے۔ سرکار نے اس کو منظور بھی فرمایا ہے، اور دفتر کو حکم بھی ہو گیا ہے۔ لیکن بالعموم ان تاریخوں کے بعد ہی روانہ کیا گیا۔ میرزا صاحب کے مکتوب مورخہ ۳ جولائی سنہ ۶۵ء بنام سیاح سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار میرزا صاحب سے روپے کی رسید نہیں لیتے تھے میرزا صاحب لکھتے ہیں:

"ایک قرن" ۱۱برس سے فردوس مکان، نواب یوسف علی خاں والی رامپور ... سو روپے مہینا ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس منفور کی اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اس روپے کی رسید نہیں لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے۔ میں خط کا جواب لکھ بھیجتا ۱۔

اس مکتوب میں رسید سے میرزا صاحب کی مراد باضابطہ ٹکٹ چسپاں رسید ہوگی، ورنہ سرکار کے ہر فرمان میں روپے کی وصولیابی سے مطلع کرنے کی خواہش اور میرزا صاحب کے تمام ماہانہ عرائض میں روپے کی رسید کی اطلاع درج ہے

اصلاح میں تاخیر

میرزا صاحب کی طرف سے نواب فردوس مکان کے کلام پر اصلاح دینے میں تاخیر بھی ہو جاتی تھی، چنانچہ متعدد فرامین میں تعجیل کا تقاضا اور بعض میں تاخیر کا شکوہ نظر آتا ہے۔ اس کا سبب میرزا صاحب کی علالت طبع تھی۔ ۲۰ نومبر کے ایک مکتوب میں میرزا صاحب نے سیاح کو لکھا ہے:

اندنوں ضعف دماغ، دوران سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ والی رامپور کا بھی بہت سا کلام یوں ہی دھرا ہوا ہے، دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی، تمہاری

۱۔ اردوی: ۱۲۰

بھیجی ہوئی غزلیں سب محفوظ دھری ہوئی ہیں۔ خاطر جمع رکھو
جب نواب صاحب کی غزلیں دیکھوں گا تو یہ بھی دیکھی جائیں گی"[1]

ایک بار تفتہ کے کلام پر اصلاح دینے میں دیر ہوئی۔ انھوں نے تقاضائی خط لکھا۔ اس پر ۱۴ اکتوبر سنہ ۶۲ کو مرزا صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

بھائی تم سچ کہتے ہو کہ بہت سے مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں
مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں
بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے۔۔
اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔۔۔
۔۔۔۔ میں ناتوان بہت ہو گیا ہوں گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا
تکلف کی ملاقات کا آجائے، تو اٹھ بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں
لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ! اللہ! اللہ!"[2]

اس جواب پر ایک سال گزر گیا، لیکن تفتہ کو اصلاح شدہ قصائد نہ ملے تو انھوں نے پھر شکایت آمیز خط لکھا۔ اس کے جواب میں ۲۷ نومبر سنہ ۶۲ء کو مرزا صاحب نے معذرت کرتے ہوئے نواب صاحب کی غزلوں پر اصلاح نہ دینے کا بھی ذکر کیا۔ فرماتے ہیں:

"مرزا تفتہ، جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ یہ بیہودہ ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ!
تم سے اور آزردگی۔ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک
دوست صادق الولا رکھتا ہوں۔ جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے
۔۔۔ بھائی، مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی
لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا
اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔۔۔۔ لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل ہے کہ اس کو

۱۔ اردوی ، ، (۲) ایضاً ص

بہت دن ہوئے، آجتک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب، نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے"[۱]

ترکِ وظیفہ جاری

لیکن اس ناخبر کے باوجود نواب فردوس مکاں وظیفہ برابر دیتے رہے تاکہ سنہ ۱۸۶۴ء میں میرزا صاحب کے اصلاح سے انکار پر بھی سرکار نے وظیفہ بند نہ کیا۔ سرکار کی اس مہربانی کا میرزا صاحب نے ایک خط میں ذکر بھی کیا ہے۔ واقعہ یہ درپیش آیا کہ ایک بار تفتہ کے کلام پر اصلاح دینے میں دیر ہوئی تو ان لوگوں نے تقاضا کیا۔ میرزا صاحب نے عذرِ ضعف کیا، جسے تفتہ نے باور نہ سمجھا۔ اس پر میرزا صاحب نے تحریر فرمایا:

میرا عجب حال ہے۔ حیران ہوں کہ تمہیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا۔۔۔ سامعہ مر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔۔۔۔۔ رئیسِ رامپور سو روپے مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوضِ خدماتِ سابقہ میں شمار کیجیے، تو میں سکھ لبر ہی، ورنہ خیرات خوار ہی، اور اگر یہ عطیہ بشرطِ خدمت ہے، تو جو آپ کی مرضی ہے۔ وہی میری قسمت ہے۔

برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوحِ مظفری نومبر تک آئی۔ اب دیکھیے، آگے کیا ہوتا ہے۔ آجتک نواب صاحب از راہِ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔"[۳]

[۱] اردوئے معلیٰ: ۹۹۱۔ [۲] یہ انگریزی کے لفظ "سِک" یعنی مریض کی بگڑی ہوئی صورت ہے آج کل رامپور کے عام بچوں کی زبان پر "سیک" ہے اور جب کوئی سپاہی اچھا ہو کر شفاخانے سے اپنی پلٹنی میں جاشامل ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ "جین" ہو گیا۔ یہ لفظ انگریزی کے لفظ "جوائن" کی تصحیف ہے۔ [۳] اردوی: ۳۶۷ و ۴۶۔

یہ خط میرزا صاحب نے ۱۴ رجب کو لکھا تھا۔ اس کے آخر میں سنہ درج نہیں ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء تاریخ کتابت ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں میرزا صاحب نے نومبر کی تنخواہ موصول ہونے کی اطلاع دی ہے، لہٰذا خط لکھتے وقت دسمبر کا مہینا ہونا چاہیے، اور جیسا کہ خود میرزا صاحب کے اٹھائیسویں عریضے سے معلوم ہوتا ہے، رجب سنہ ۱۲۸۱ھ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کے ساتھ شروع ہوا تھا۔

اس خط میں میرزا صاحب نے اس عریضے کا مضمون دہرایا ہے، جو نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال کیا تھا، گو [illegible] مثلوں میں موجود نہیں ہے، لیکن دوسری مثلوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا یہ ارشاد کہ دو برس دن سے ان کا کلام نہیں آیا، حقیقی عذر ہے۔ کیونکہ دسمبر سنہ ۶۲ء سے دسمبر سنہ ۶۴ء تک نواب فردوس مکاں نے تقریباً ہر ماہ خط بھیجا ہے، مگر کسی میں اشعار کے ارسال کی اطلاع یا مرسلہ کلام کی واپسی کا تقاضا درج نہیں ہے۔ ان کا آخری کلام وہ دو اسوخت تھا جو میرزا صاحب نے آخر اکتوبر سنہ ۶۲ء میں [illegible] بھیجا اور یہ ۲۹ اکتوبر سنہ مذکورہ مطابق ۱۵ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۷۹ھ کو موصول ہوا۔ اس کے بعد اکتوبر سنہ ۶۴ء کے آخر یا نومبر کے آغاز میں سرکار فردوس مکاں مرض سرطان میں مبتلا ہو گئے، اور غالباً سنہ ۶۵ء کے شروع میں محرم سنہ ۱۲۸۲ھ کی مجالس کے لیے صرف ایک سلام لکھ کر بھیج سکے۔ جو ان کے انتقال کے بعد میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں واپس ارسال کیا تھا۔[1]

رامپور کا پہلا سفر اور سرکار کے پانچ دعوت نامے

مملکت ہند میں امن و اماں قائم ہوتے ہی، سرکار نے میرزا صاحب کو رامپور تشریف لانے کی دعوت دی۔ نواب صاحب کا پہلا دعوت نامہ مثل میں

۱۔ مکاتیب، ۳۶۔

موجود نہیں ہے۔ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام کے مکتوب مورخہ ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء میں میرزا صاحب نے اپنے رامپور نہ آسکنے کے وجوہ تحریر کیے ہیں، اس لئے یقیناً پہلی دعوت ابتدائی سنہ ۵۸ء میں گئی ہوگی۔ خود میرزا صاحب کے الفاظ "بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے، میں عذر کرتا تھا"[۱] سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ۲۵ نومبر سنہ مذکور کو سرکار نے پھر تحریر فرمایا:

"مشفقا، چونکہ مخلص کو اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجۂ کمال ہے، اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے، اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فیض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمایئے"[۲]

اس کے بعد ۲ فروری سنہ ۱۸۵۹ء کو سرکار نے سہ بارہ تحریر فرمایا:

"اور بھی حال وصول بخشش سے اور یہ کہ آپ کا ارادہ تشریف آوری کا اس طرف کو کب ہے مطلع فرمانا موجب مزید سرور خاطر محبت ناظر کا متصور ہے"[۳]

بعد ازاں ۱۳ ماہ اپریل سنہ ۵۹ء کو چوتھی بار تحریر فرمایا:

"حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا، اور دل صفا منزل مشتاق اور منتظر دریافت سرور ملاقات کا ہے۔ اس واسطے حوالۂ خامۂ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ آپ براہ عنایت کے نوید تشریف فرمائی اس سمت سے کہ کب تک ممکن الوقوع ہے، مطلع اور مطمئن فرمایئے"[۴]

۲۰ مئی کو پانچویں بار لکھا:

"مشفقا، عرصہ ممتد ہوا کہ اب تک نوید تشریف فرمائی آپ کی اس طرف

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۲۸۳ (۲) مکاتیب: ۱۱ ح ۵ (۳) مثل نمبر ۱۵۳ صحیفۂ احباب عہد نواب فردوس مکان (۴) مکاتیب: ۱۱ ح ۳۔

کو سامعہ نواز نہیں ہوئی۔ اور آپ کہ انتظار مقدمۂ پنشن کا تحریر فرماتے ہیں،
کیا خبر گیری مقدمۂ پنشن کی تشریف رکھنے آپ کے سے یہاں پر مختار آ
نہیں ہو سکتی؟ آپ براہِ لطف اور مہربانی کے حالِ قصد تشریف
آوری سے جلد مطلع اور مسرور فرمایئے گا کہ رفعِ انتظار ہو۔"[1]

میرزا صاحب کا عذر

میرزا صاحب، مطلع سیاست صاف ہو جانے کے بعد، اپنی انگریزی پنشن کے اجرا کی سعی میں مصروف تھے، اور اپنے آپ کو جرم بغاوت سے قطعاً بری پاتے تھے، اس لیے حکام کی ہر دفتری حرکت ان کی امید کو پیامِ کامیابی نظر آتی تھی۔ بسا اوقات احباب کو کامیابی کی منزل قریب آجانے کی اطلاعیں تک دے بیٹھتے تھے۔ ایسی حالت میں کس طرح ممکن تھا کہ دلی سے باہر چلے جاتے۔ چنانچہ یہی امر فردا دلی چھوڑ کر رامپور آنے سے مانع رہے، اور انھوں نے ہر دعوت نامے کے جواب میں عذر کیا کہ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آگیا ہے، اس کو ادھورا چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کو تحریر کرتے ہیں:

"جناب نواب صاحب میرے محسن اور میرے قدردان اور میری امیدگاہ ہیں۔ میں اگر رامپور نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تجھ کو آنے میں تردد کیا ہے، تردد کچھ نہیں، توقف ہے۔ وجہ توقف کی یہ کہ میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو عرضی دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنر شہر کے وہ درخواست حوالے ہوئی۔ صاحب کمشنر دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔۔۔۔ بہر حال صاحب کمشنر شہر کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کے چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعد ملاحظہ کیفیت

[1] مثل نمبر ۵ ۲ صحیفۂ احباب ۲ ۲ اردوئے معلی اور عود ہندی میں اس مضمون کے متعدد خطوط موجود ہیں۔

کیا حکم دیں۔ مگر تا صدورِ حکم میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ ہاں بعد ملنے حکم کے، خواہی دلخواہ ہو خواہی مخالف مدعا، دونوں صورتوں میں رامپور آؤں گا۔"[۱]

نواب فردوس مکاں کے دعوتنامۂ مورخہ ۲۵ نومبر سنہ ۵۸ء کے جواب میں بھی اسی عذر کا اعادہ کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ پنسن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے، اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغازِ سال ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اس کو جواب مل جائے۔"[۲]

لیکن جنوری سنہ ۵۹ء کا مہینا بھی یونہیں گزر گیا، تو انھوں نے اپنے حسنِ عقیدت میں اور وسعت پیدا کر لی، اور جب سرکار نے ۱۳ ماہِ اپریل سنہ مذکورہ کو چوتھی بار مرزا کو رامپور کی دعوت دی، تو اس کے جواب میں لکھا:

"پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموعہ پنسنداروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میرے پنسن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتے کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور باربرداری مانگی۔ آج سواری اور باربرداری پہنچی، اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔"[۳]

۱۔ مکاتیب: ۸۲۔ ۲۔ ایضاً: ۱۳۔ ۳۔ ایضاً: ۸۶۔

چھٹی دعوت

اس عذر کو سرکار نے اپنے محولہ بالا فرمان مورخہ ۲۰ مئی میں تسلیم فرمایا اور برابر اشتیاق ملاقات ظاہر فرماتے رہے، تاآنکہ سنہ ۱۸۵۹ء ختم ہونے کے قریب آگیا، اور پنشن کا معاملہ ہنوز لیت و لعل میں پڑا رہا۔ آخر سرکار نے ۱۲ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو پھر ارقام فرمایا:

سابق میں چند مرتبہ درباب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں، لیکن اب تک آپ نے سرور ملاقات بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔

اب لازم اشفاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی فرمادیں اور مخلص کو مشکور الطاف کا کریں۔[۱]

میرزا صاحب اس عرصے میں نواب فردوس مکاں کے اخلاص اور اعانت کے بدل معترف ہو چکے تھے، اور یہ عزم کر کے کہ مقدمۂ پنشن کے منفصل ہوتے ہی رامپور روانہ ہو جائیں گے، یوسف مرزا کو لکھا تھا:

" میں تو پنشن کے باب میں حکم اخیر سن لوں، پھر رامپور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے، اور پھر محرم سے سنہ ۱۲۷۷ سال شروع ہوگا اس سال کے دو چار، حد دس گیارہ مہینے، غرض کہ اٹھیں بیس مہینے ہر طرح بسر کرتے ہیں۔ اس میں رنج و راحت و دولت و عزت جو مقسوم میں ہے وہ پہنچ جائے، اور پھر "علی، علی" کہتا ہوا ملک عدم کو چلا جاؤں جسم رامپور میں اور روح عالم نور میں۔ یا علی! یا علی! یا علی!"

میرزا صاحب کا عزم سفر اور اس کا مقصد

جب آغاز سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ نے مقدمۂ پنشن کا فیصلہ میرزا صاحب کی خواہش اور امید کے خلاف صادر کیا، نواب صاحب نے حسب وعدہ سفر رامپور کا

۱۔ مکاتیب ۱۷ ج ۲ (۲۲)، اردوی: ۳۴۵

کی تیاری کی۔ اس سلسلے میں تجمّل کو لکھتے ہیں

بعد فتح دہلی وہ (نواب فردوس مکاں) ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا"۔۱

نواب فردوس مکاں ایام غدر میں گورنمنٹ کے وفادار اور معاون رہے تھے انگریز حکام کی نظر میں ان کی بڑی عزت و منزلت تھی۔ میرزا صاحب سے بھی اُن کے تعلقات بےحد پرخلوص تھے۔ مقدمہ خلاف فیصل ہونے کے بعد میرزا صاحب نے مناسب جانا کہ رامپور جائیں اور سرکار کے توسط سے اپنا معاملہ گورنمنٹ سے صاف کرائیں شیونرائن کو ۳ مارچ سنہ ۶۰ء کو رامپور سے لکھا ہے،

میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ یہاں آیا ہوں، اور اپنی صفائی گورنمنٹ سے بذریعہ اُن کے چاہتا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے"۔۲

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ، جو قیام رامپور کے زمانے میں پیش آیا، اس امر پر شاہد ہے کہ سفر رامپور سے میرزا صاحب کا مقصد "گورنمنٹ سے اپنی صفائی" تھا۔ ۱۴ فروری سنہ مذکورہ کو حکیم غلام نجف خاں کو تحریر کیا ہے۔

"یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ مرادآباد آیا چاہتے ہیں۔ مرادآباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر ان کی ملاقات کو مرادآباد جائیں گے، میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں، مگر دیکھوں، کیا گفتگو درمیان آتی ہے"۔۳

اگر میرزا صاحب کے پیش نظر گورنمنٹ سے صفائی نہ ہوتی، تو یہ جانتے ہوئے کہ غرب و شمال کے گورنر کو دلی سے کچھ واسطہ نہیں، سرکار کے ساتھ مرادآباد جانے کا تہیا نہ کرتے

۱۔ اردوئے معلیٰ ۳۲؍ ۲۔ ایضاً: ۱۳۸ ۳۔ ایضاً: ۲۲۹۔

دلّی سے روانگی

میرزا صاحب نے ارادہ کیا کہ آخر جمادی الآخرہ میں دلی سے روانہ ہوں اور رجب المرجب کا چاند رامپور آ کر دیکھیں۔ حسین مرزا کو سہ شنبہ ۳۱ دسمبر سنہ ۵۹ء کو لکھتے ہیں:

رامپور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ جب تم لکھتے ہو کہ "للہ تم وہاں جاؤ!" تو مجھ کو ہنسی آتی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہلال ماہ رجب المرجب رامپور میں دیکھوں"[1]

اس خط کی تحریر سے ۱۹ دن بعد میرزا صاحب دلّی سے روانہ ہوئے۔ دلّی سے روانگی کی تاریخ کا ذکر متعدد خطوں میں پایا جاتا ہے مثلاً بیخبر کو جملاً لکھدیا ہے:

جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا"[2]

رامپور سے واپس جا کر شیو نراین کو چھپنے کے ساتھ تاریخ بھی لکھی ہے فرماتے ہیں:

۱۹ یا ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کر کے رامپور گیا ہوں"[3]

لیکن آخر عمر میں میرزا صاحب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اس لیے انھیں صحیح تاریخ یاد نہیں رہی۔ دراصل وہ جنوری سنہ ۶۰ء کو دلی سے روانہ ہوئے تھے۔ چنانچہ ۲۰ جنوری کو میرٹھ پہنچکر تفتہ کو لکھا ہے:

بھائی، میں نے دلّی کو چھوڑا، اور رامپور کو چلا ...... ۱۹ کو مرادنگر اور جمعے ۲۰ کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفےٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا یہاں سے یہ خط تمکو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہاں پور، پرسوں گڈھ مکتیشر ہوں گا پھر مراد آباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا"[4]

۱۔ اردوی : ۲۹۳ (۲) ایضاً : ۲۸۳ (۳) ایضاً: ۳۸۳ (۴) ایضاً: ۸۶۔

اسی تاریخ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

میاں میں تم سے رخصت ہو کر اُس دن مراد نگر میں رہا۔ دوسرے دن یعنی جمعے کو میرٹھ۔۔۔ پہنچا۔ نواب مصطفےٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲ جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں مفت کا کھانا ملتا ہے۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا کل شاہجہاں پور، پرسوں گڑھ مکتیشر رہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تمکو خط لکھوں گا۔"[۱]

ان تمام تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعرات کے دن صبح کے وقت ۱۹ جنوری سنہ ۶۰ء کو میرزا صاحب دلی سے روانہ ہوئے۔

اخفای حال

روانگی سے پہلے میرزا صاحب نے کسی مصلحت کے ماتحت احباب سے مختلف مقامات کے سفر کا اظہار کیا تھا میرٹھ پہنچکر اخفا کی ضرورت نہ سمجھی اور وہیں سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا:

ہاں بھائی میں از روی مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں اب جو شخص تم سے پوچھا کرے، اس سے پردہ نہ کرنا اور صاف کہہ دینا کہ رام پور گیا ہے۔ یعنی سب کو معلوم ہو جائے، اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔"[۲]

اس مکتوب میں میرزا صاحب نے اس مصلحت کو ظاہر نہیں کیا، جو مقام سفر کے اخفا کی بنا تھی۔

منازل سفر

۱۹ جنوری کی صبح کو دلی سے روانہ ہو کر میرزا صاحب نے شام کو مراد نگر میں قیام کیا۔ دوسرے دن یعنی جمعے کو میرٹھ پہنچے۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں بہادر شیفتہ کے یہاں ٹھہر کر اتوار کو شاہجہانپور اور پیر کو گڑھ مکتیسر میں اترے۔ یہاں

۱۔ اردوی: ۲۳۲ ۲۔ ایضاً: ۲۳۳۔

سے مراد آباد تک کے منازل کا پتا نہیں، جو منگل اور بدھ دو دن میں طے کیے ہوں گے، لیکن یہ یقینی ہے کہ آخری منزل مراد آباد تھی۔ یہ تمام تفصیل مرزا تفتہ اور حکیم غلام نجف خاں کے نام کے مکاتیب میں آ بھی گزر چکی ہے۔

رفقای سفر

اس سفر میں عارف مرحوم کے دونوں لڑکوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے علاوہ کلو خانساماں[1]، عنایت اللہ خادم، اور غالباً دو ملازم اور میرزا صاحب کے ہمرکاب تھے[2]۔ لڑکوں کا ذکر متعدد خطوط میں کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اس خط کا اقتباس کافی ہوگا، جس میں تمام ہمراہیوں کا ذکر ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کے خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا۔"[3]

درود رامپور کی تاریخ

غالباً میرزا صاحب جمعرات کے دن مراد آباد پہنچے، اور وہاں ..... رات کو آرام کر کے دوسرے دن جمعے کو رامپور ..... وارد ہوئے۔ جمعہ ۳ فروری کو رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچنے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا۔"[4]

اس سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب جمعے کے دن رامپور پہنچے۔ مرزا تفتہ اور حکیم غلام نجف خاں کو میرٹھ سے جو خطوط لکھے ہیں، ان میں میرزا صاحب نے جمعے کو ۲۰ اور شنبے کو ۲۱ جنوری کی تاریخ تحریر کی ہے۔ اس حساب سے جس جمعے کو میرزا صاحب نے سرزمین رامپور پر قدم رکھا، ۲۷ جنوری

۱- میرزا صاحب نے ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء کو ۱۰۰ سو روپے کی ایک رسید لکھ کر دی تھی۔ اس کے پچھلے گوشے میں خزانچی نے لکھا ہے: "حوالہ کلو خانساماں خود توسیعہ صفا نمودہ شد" یہ رسید کل مالی امداد کی بحث میں حاشیے کے اندر نقل ہو گی (۲) دو اور ملازموں کا قیاس اس وجہ سے ہے کہ سفر میں ۳ ملازموں کے ساتھ ہونے پر بھی بنی ہے (۳) اردوی: ۲۲۹ (۴) ایضاً: ۲۲۸۔

سنہ ۶۰ء تاریخ انگریزی ہونی چاہیے۔

قیام گاہ

رامپور پہنچ کر میرزا صاحب نے سرکار کی خاص کوٹھی میں قیام کیا باقر علی خاں اور حسین علی خاں میرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ یہاں چار دن گزارنے کے بعد اردوی اجتناط جداگانہ مکان کی خواہش کی سرکار نے ایک مکان جو تین چار حویلیوں پر مشتمل تھا، قیام کے لیئے عطا فرمایا۔ میرزا صاحب نے تفتہ کے پتہ پوچھنے پر جو خط لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں:

" پہلے تو یہ تنباؤ کہ رامپور میں مجھ کون نہیں جانتا۔ کہاں مولوی وجیہہ الزماں صاحب کہاں میں؟ ان کا مسکن میرے مسکن سے دور، پھر مدد واشت رئیس کہاں اور میں کہاں؟ چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا میں نے مکان جداگانہ مانگا دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اس میں رہتا ہوں بسبب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام محلے کی اور عرف کی حاجت نہیں بلکہ درد مند اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔

حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

" مکان کا پتہ ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس۔ ڈاک منشی میرا آشنا۔ . . . . . . ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے۔"[۲]

مجروح کو تحریر کیا ہے:

تمہارا خط پہنچا تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے۔"[۳]

۱۔ اردوی: ۱/۷۳ لاہور ایڈیشن ۲) ایضاً: ۲۲۸ و ۳) ایضاً: ۱۹۹۔

مکان کی تحقیق

بزرگان شہر سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ محلہ راجدوارہ کی اس شاہراہ پر، جو خاص باغ کو جاتی ہے " شیخ احمد یار خاں صاحب کے مکان کے محاذ میں ڈاک خانہ تھا، اور میرزا صاحب نے اس کے متصل مکان میں قیام کیا تھا۔ چونکہ یہ مکان اردو ادب کے نیّرِ درخشاں کی فرودگاہ رہ چکا تھا، عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر بہادر کے حسب الحکم ۲۱ فروری سنہ ۴۴ ۱۹ء کو اس پر یادگاری پتھر لگایا گیا، اور ۲۲ فروری کو بندگان ہمایون اعلیٰحضرت شہریار رامپور دام اقبالہم وملکہم نے ایک نمائندہ ادبی مجمع کے روبرو اس کی نقاب کشائی فرمائی۔

مہمانداری

میرزا صاحب کے لیے ابتداءً سرکاری باورچی خانے سے کھانا آتا رہا حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے، اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلافِ طبع نہیں" [۱]

مجروح کے خط میں بھی سرکاری مہمانداری کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہاں کا حال سب طرح خوب ہے۔ اور صحت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں" [۲]

چند دن کے بعد کھانے کے سو روپے ماہوار مقرر کر دیے گئے۔ دلی جا کر میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا ہے:

"اب جو میں وہاں گیا، تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپے مہینا پاؤں، اور دلی رہوں تو سو روپے" [۳]

۱۔ اردوی: ۲۸۰ (۲) ایضاً: ۲۲۹ (۳) ۱۶۲۔

آب و ہوای رامپور

رامپور کی آب و ہوا میرزا صاحب کے مزاج کے موافق ثابت ہوئی آمدِ رامپور کے ۸ دن بعد حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

"پانی کا شکر کس منھ سے ادا کروں! ایک دریا ہے کوسی سبحان اللہ! اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے، صاف، سبک، گورا، ہاضم، سریع النفوذ، اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو خوب بھوک لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں، ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا۔"[1]

رامپور ہی سے مجروح کو تحریر کیا ہے

"یہ رامپور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے، وہ اور کہاں ہے! پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے، اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے، تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے، اتنا شیریں کہاں ہوگا؟"

ملاقات اور تعظیم اور توقیر

نواب فردوس مکاں کا اخلاق میرزا صاحب کی امید کے مطابق ثابت ہوا۔ سرکار نے بروقت ملاقات احباب کی طرح معانقہ کیا، اور احباب میں تعظیم و توقیر کی جو رسم ہے اس کو ملحوظ رکھا۔ میرزا صاحب نے دونوں لڑکوں سے نذر دلوائی۔ سرکار کے اس برتاؤ کے بارے میں مجروح کو لکھتے ہیں:

"تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے"[2]

بعد ازاں دلی جا کر لکھا ہے:

"ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے

۱۔ اردوئ: ۲۲۲ ۲۔ ایضاً ۱۹۲۔

وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوادی تھی، بس۔"۱

اسی سلسلے میں رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو تحریر کیا ہے:

"اب میرا حال سنو۔ تعظیم و توقیر بہت۔ ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔" ۲

ابھی گفتگو نہیں ہوئی

نواب فردوس مکاں نے جولائی سنہ ۵۹ء سے میرزا صاحب کو سو روپے ماہوار عطا فرمانا شروع کر دیے تھے، جو انھیں بذریعہ ہنڈوی ماہ بماہ ارسال ہوا کرتے۔ میرزا صاحب رامپور تشریف لائے، اور چند روز تک خدمت اور معاوضے کے بارے میں سرکار سے رو در رو گفتگو نہیں ہوئی، تو انھیں مختلف خطرات پیدا ہوئے۔ خدمت اور دربار کے خطرے کو حکیم غلام نجف خاں کے نام کے مکتوب میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

"ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود اُن سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہہ نہ کہیں گے، مگر بواسطۂ کار پردازانِ سرکار دیکھوں کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں۔" ۳

یہ خط ۳ فروری کو لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۲ فروری کو پھر لکھتے ہیں:

"یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا، اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا۔"

مجروح کو بھی ذیل کے الفاظ میں لکھا ہے:

"اس وقت تک مہمان ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔" ۴

رامپور کی اقامت کے خطرے کو تفتہ کے خط میں ظاہر کیا ہے فرماتے ہیں:

"دوسری بات جو تم نے لکھی ہے وہ بھی مطابق واقع و مناسب حال نہیں اگر اقامت قرار پائی، تو تم کو بلا لوں گا۔" ۵

۱۴ فروری کو تفتہ کے خط کے جواب میں پھر لکھا ہے:

۱۔ اردوی: ۱۶۲ (۲) ایضاً: ۸ - ۲۴ (۳) ایضاً: ۲۱۳ (۱) ایضاً: ۱۲۹ (۵) ایضاً ۲ ۴۳ لاہور ایڈیشن۔

میری جان! آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بشرط اقامت بلا لوں گا۔ اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری، تو بے تمہارے نہ رہوں گا، تمہارے نہ رہوں گا۔

سہ بارہ پھر مارچ کو لکھتے ہیں:

"در بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مرادآباد اور وہاں سے رامپور آئیں گے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا، تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔"[۲]

تعیین خدمت و اقامت

آخر کار یہی طے پایا کہ میرزا صاحب رامپور کی اقامت اختیار کرنے پر مجبور نہیں۔ البتہ رامپور آ کر رہیں گے، تو دعوت کے سو روپے ماہوار مزید عطا ہوں گے، اور وہاں رہیں گے، تو صرف سو روپے تنخواہ ملے گی اس تصفیے کے متعلق میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا ہے:

"قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی سنہ ۱۸۵۹ سے، کہ جس کو یہ دوسرا مہینا ہے، سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینا بنام دعوت اور دیا یعنی اگر رامپور رہوں تو دو سو روپے مہینا پاؤں، اور دلی رہوں تو سو روپے۔ بھائی، سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ . . . . بہرحال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا۔"[۳]

تفتہ کو تحریر کیا ہے:

۱۔ اردوی: ۳۶۳ (۲) ایضاً: ۱۶۷ (۳) ایضاً: ۱۹۴۔

دہ سو روپے مہینا یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔"۱

جنون بریلوی کو لکھا ہے:

"حق تعالیٰ والیِ رامپور کو صد و سی سال سلامت رکھے! اُن کا عطیہ ماہ بماہ مجھ کو پہنچتا ہے۔ کرم گستری اور استاد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنج سفر اٹھانے کی اور رامپور جانے کی حاجت نہیں۔"۲

علائی کو قدرے تفصیل سے لکھتے ہیں:

"رئیس کی طرف سے بطریق نوکری ملازم نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاحِ نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں، چاہوں اکبرآباد، چاہوں لاہور، چاہوں بہار۔"۳

لڑکوں کی شرارت

رامپور کی آب و ہوا کی موافقت اور سرکار کی تعظیم و توقیر کے باعث سے مرزا صاحب زیادہ قیام کرنا چاہتے تھے لیکن باقر علی خاں اور حسین علی خاں ساتھ تھے۔ مرزا صاحب نے ان کا دل بہلنے کے خیال سے طفلانہ کھیل کود کے تمام لوازم مہیا کر دیے تھے اس پر بھی یہ برابر اُن کے سکون و آرام میں خلل ڈالتے رہے۔ ۱۳ فروری کو مرزا صاحب نے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

"لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، پتنگ، کنکوا سب سامان درست ہے۔"۴

اپنے ارادۂ قیام اور اُن کی شرارت کے متعلق یوسف مرزا صاحب کو تحریر کرتے ہیں:

"مجھ کو لڑکوں نے بہت تنگ کیا ورنہ چند روز اور رامپور میں رہتا۔"۵

۱۔ اردوئے معلی ۵۲ ۲۔ ایضاً ۱۱۲ ۳۔ ایضاً ۳۰۴ ۴۔ ایضاً ۲۷۲ ۵۔ ایضاً ۳۹۴

مجروح کو لکھا ہے:

"لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا تنہا بھیجنے میں وہم آیا، کہ خدا جانے، اگر کوئی امر حادث ہو، تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا، ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا، اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔"۱

دلی کو واپسی

لڑکوں کی شرارت سے تنگ آکر میرزا صاحب نے برسات تک کے ارادۂ قیام رامپور کو فسخ کر دیا۔ سرکار نے ہر چند روکا اور آموں کا لالچ دیا لیکن میرزا صاحب نہ رکے، اور آخر مارچ مطابق آخر شعبان میں دلی کو روانہ ہو گئے رامپور سے روانگی کی تاریخ بھی میرزا صاحب نے متعدد خطوط میں تحریر کی ہے جنون بریلوی کو لکھتے ہیں:

"سال گذشتہ ان دنوں میں رامپور تھا، مارچ سنہ ۶۰ء میں یہاں آگیا ہوں"۲

تفتہ کو لکھتے ہیں

"میاں! میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں، تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں"۳

مجروح کو تحریر کرتے ہیں:

"میر مہدی، تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی جامع مسجد کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے، اور بہت منع کرتے رہے، برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی! میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبے کو غرۂ ماہ مقدس ہوا"۴

۱۔ اردوئے معلی: ۱۶۱ (۲) ایضاً ۲۱۱، عود: ۱۲۶ (۳) ایضاً ۵۹ (۴) ایضاً: ۱۲۱۔

قدر بلگرامی کو سہ شنبہ ۱۳ مارچ سنہ ۶۰ء کو لکھا ہے:

"اب جو خط بھیجئے، دلی کو بھیجیے گا، کہ میں اس مہینے میں اُدھر کو جاؤں گا۔ رویت ماہِ صیام، اغلب ہے کہ دلی ہی میں ہو۔"[1]

ان خطوط سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب آخر شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ مطابق آخر مارچ سنہ ۱۸۶۰ء میں رامپور سے روانہ ہو کر ۳۰ شعبان کو دلی پہنچے، اور وہاں پہنچکر رمضان المبارک کا چاند دیکھا۔ ابھی انگریزی ہجری تاریخوں کا تعین باقی ہے۔ انگریزی تاریخ کے بارے میں شیو نراین کو رامپور سے لکھتے ہیں:

"اب میں شنبے کے دن، ۱۷ مارچ کو دلی روانہ ہوں گا۔"[2]

یوسف میرزا کو ۹ رمضان مطابق ۲ ماہ اپریل کو ہجری تاریخ کے متعلق تحریر کیا ہے:

"میں ۲۳ شعبان کو رامپور سے چلا اور ۳۰ شعبان کو دلی پہنچا۔ اسی دن چاند ہوا۔"[3]

میرزا صاحب نے اس خط میں رمضان کی نویں تاریخ کو اپریل کی دوسری تاریخ کے مطابق لکھا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس سال رمضان کا چاند ۳۰ کا ہوا تھا۔ اس حساب سے ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ کا تطابق ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء کے ساتھ، اور ۳۰ شعبان سنہ مذکورہ کا ۲۴ مارچ سنہ ۶۰ء کے ساتھ ہوگا۔ لہٰذا میرزا صاحب کی رامپور سے روانگی کی تاریخ ۲۳ شعبان ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء اور دلی میں ورود کی تاریخ ۳۰ شعبان ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۴ مارچ سنہ ۶۰ء قرار پاتی ہے۔

مراد آباد میں قیام

خواجہ حالی مرحوم نے حیات جاوید میں لکھا ہے کہ سر سید کہتے تھے کہ جب

۱۔ اردوی: ۴۰۰ لاہور ایڈیشن (۲) ایضاً: ۴۰۲ (۳) ایضاً: ۸۴۳۔

ہیں مراد آباد میں تھا، اس وقت میرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم
سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی، مگر جب دلی
کو واپس جاتے تھے، میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ میں
در آ سرائے میں پہنچا اور میرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان
لے آیا۔ ظاہرا جب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا، وہ میرزا سے
ور میرزا اُن سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا
تھا، اور اس لیے میرزا نے مراد آباد آنے کی
ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب میرزا سرائے سے
سید کے مکان پر پہنچے، اور پالکی سے اترے، تو ایک بوتل ان کے ہاتھ
ا تھی، انھوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک کی آتے جاتے
نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری
ار رکھ دیا۔ میرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا، تو بہت گھبرائے۔ سرسید
نے کہا: "آپ خاطر جمع رکھیے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔"
رزا نے کہا: "بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے؟" انھوں نے کوٹھری میں لیجا کر
تل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی، اور مسکرا کر
ہنے لگے کہ "بھئی، اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ کس نے
ا ہے۔ شاید اسی لیے تم نے کوٹھری میں لا کر رکھی تھی۔ حافظ نے
کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سید ہنس کے چپ ہو رہے، اور اس طرح وہ رکاوٹ، جو کئی برس سے چلی
ا تھی، رفع ہو گئی۔ میرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دلی چلے آئے۔"

حیات جاوید: ۱۱، صح۔ مگر از روی حسابِ منازل، میرزا صاحب نے سرسید کے پاس دو ایک
قیام نہیں کیا تھا بلکہ اسی دن وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

زر نہ سہ پہر کو عام طور پر لوگوں سے ملاقات کرتے۔ ریاست میں جس قدر اہلِ علم و فن تھے، میرزا صاحب کی موجودگی کو مغتنم تصور کرتے، اور بالالتزام آیا کرتے۔ شب کی صحبت خاص ہوتی تھی، کیونکہ یہ اُن کے کیف و سرور کا وقت تھا۔ صرف اُنھیں لوگوں کو حاضری کا موقع دیتے، جن سے کسی طرح کا تکلف نہ ہوتا۔"(۱)

واپسی پر دلّی میں چہ میگوئیاں

میرزا صاحب نے دلّی سے روانہ ہوتے وقت اپنی واقعی منزلِ سفر ظاہر نہیں کی تھی۔ جب رامپور سے واپس دلّی پہنچے، تو حسّاد نے اس اخفا کا انتقام لیا، اور واپسی پر خوب رای زنی کی گئی۔ میرزا صاحب نے شکایت آمیز لہجے میں تفتہ کو لکھا:

"میاں، میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ "یہ شخص والئ رامپور کا اُستاد تھا، اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا۔ تو بھی پانچ چار ہزار روپیے سے کم نہ دیا ہوگا۔" ایک جماعت کہتی ہے" نوکری کو گئے تھے، مگر نوکر نہ رکھا۔" ایک فرقہ کہتا ہے کہ "نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپیے مہینا کر دیا تھا۔ لفٹننٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے، اور اُن کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا، تو اُنھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو، تو اس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف کر دیا۔"(۲)

یہ اربابِ دہلی کی خیال آرائیاں تھیں۔ اصلِ حقیقت کے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ تو سب سُن لیا۔ اب تم اصلِ حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد

---

(۱) غالب (۱۹۳۶ء) طبع ثانی - (۲) اردوی : ۵۴

ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیجدیا کرتے تھے۔ اب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے بروپیہ ماہ ماہ بھجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرطِ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا دو سو روپیہ مہینا، یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔"[۱]

نواب فردوس مکاں کی علالت اور میرزا صاحب کا تردد

ماہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ء کے آخر یا نومبر کے آغاز میں نواب فردوس مکاں عارضۂ سرطان میں مبتلا ہوئے۔ میرزا صاحب کو کسی ذریعے سے اس کی اطلاع ملی، تو انھیں اپنے سخی داتا شاگرد کی علالت سے تردد لاحق ہوا۔ نواب صاحب اُن کے پورے خاندان کے مربی تھے۔ اس لیے میرزا صاحب کی بی بی اور حسین علی خاں بھی اس خبر سے پریشان ہوئے۔ اُس وقت تک میرزا صاحب کو یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ سرکار کو کیا مرض لاحق ہوا ہے اس امر کی تحقیق کے لیے اُنھوں نے ۵ نومبر سنہ ۱۸۶۴ء کو انتہائی احتیاط کے ساتھ تحریر کیا:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبر وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا، اور قطعۂ تاریخ غسلِ صحت لکھ بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں اور حقیقتِ مرض سے آگہی حاصل ہو۔"[۲]

---

(۱) اردوی: ۲۵۴ (۲) مکاتیب: ۲۷

۱۲ نومبر کو سرکار کا نامۂ مبارک موصول ہوا غالباً اُس میں نوعیت کیفیتِ مرض کا ذکر نہ تھا، جس سے تشویش رفع ہوتی، اس لیے اُس کے جواب میں ۱۳ نومبر کو میرزا صاحب نے پھر لکھا:

"ابتدائے یکم نومبر سے ۱۱ نومبر تک عرض نہیں کر سکتا کہ لیل و نہار مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ راہ دور، میں رنجور، معہذا بے مقدور۔ اگر دلی سے رامپور تک شکرم کی ڈاک جاری ہوتی، تو میں یہاں ایک دم نہ ٹھہرتا، اور خدمت میں حاضر ہوتا۔ تار برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہِ اضطرار ۸ ماہِ حال یعنی نومبر کو عریضہ روانہ کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشدِ کامل، یعنی حضرت کی ہمت نے اُس خط کے جواب آنے کی مدت سے پہلے مجھے گردابِ اضطراب سے نکالا۔ کل ۱۲ نومبر کو نوازش نامہ آگیا۔ گویا میری جان بچ گئی، بلکہ ایک اور نئی جان میرے بدن میں آگئی۔ اب استدعا یہ ہے کہ حالِ ناسازیِ مزاجِ اقدس مفصل معلوم ہو۔"[۱]

اس عریضے کے جواب میں ۱۹ نومبر کو سرکار کی جانب سے پھوڑا نکل کر افاقہ ہو جانے کی اطلاع دی گئی۔ میرزا صاحب اس خبر سے بےحد مسرور ہوئے اور ۲۷ نومبر کو اس کے جواب میں لکھا:

"کس زبان سے کہوں، اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے! ہر روز شام تک جانبِ در نگراں رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے، اور حضرت کا نوازش نامہ لائے۔ بارے خدا کی مہربانی ہوئی، اور میری زندگانی ہوئی، کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ ملاطفت نامۂ عالی دیا، جس کو پڑھ کر

[۱] مکاتیب ۵۵

روحِ تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیند کس کی؟ سونا کس کا؟ روشنی کے
سامنے بیٹھا، اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سارے شعر مع مادہ حصولِ
صحت جب لکھ لیے تب سویا۔"(۱)

غسلِ صحت کی تہنیت

سرکار کے خط سے صحت و افاقتِ مرض کی اطلاع مل گئی، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ غسلِ صحت ہو چکا ہے یا نہیں، اور بصورتِ دیگر کونسی تاریخ اس تقریبِ سعید کے لیے مقرر ہوئی ہے۔ اس تحقیق کے لیے میرزا صاحب نے منشی سیلچند کو ۲۵ دسمبر کو لکھا:

"اگرچہ از روئے خطوطِ حضور صحت و عافیتِ حضور معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ کہیں سے نہیں سُنا کہ غسلِ صحت کیا، یا کس دن کریں گے۔ آپ سے یہ فقیر کا سوال ہے کہ مجھ کو لکھیے کہ حضرت غسلِ صحت کس دن فرمائیں گے اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکے ہوں، تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔"(۲)

منشی صاحب نے جواباً لکھا کہ غالباً رمضان المبارک میں یہ تقریب عمل میں آئے گی۔ میرزا صاحب کو ۱۴ جنوری سے قبل سرکار کا نامۂ صحت مل چکا تھا، اور وہ اس عرصے میں قصیدۂ تہنیت بھی ارسال کر چکے تھے۔ البتہ تاریخ غسل پر ۱۹ جنوری سنہ ۶۵ء کو پھر منشی صاحب کو لکھا:

"یہ جو میں نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر بھیجا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ شاہ کبیر الدین صاحب رامپور سے آئے، اور اُنھوں نے کہا کہ نواب صاحب جمعے کے دن ساتویں تاریخ شعبان کو نہائیں گے۔ اب تمہاری تحریر سے معلوم ہوا، کہ ماہِ آیندہ، یعنی رمضان، میں نہائیں گے۔ خیر، وہ کاغذ تو حضور کی نظر سے گزرے گا۔ اگر موقع

(۱) مکاتیب: ۲۹ قطعہ تاریخ اسی صفحے کے حاشیہ ۱۱ میں ملاحظہ ہو (۲) ایضاً: ۱۱۰

باؤ، تو حضور میں یہ ماجرا عرض کر دینا کہ میں نے بموجب روایت شاہ کبیر الدین کے اس کے ارسال میں جلدی کی ہے"۔(۱)

تجویز یہ تھی کہ غسلِ صحت کا جشن ماہ عید میں منایا جائے، لیکن ابھی مرض قدرے باقی تھا، اور رامپور سے جس قدر سرکاری تحریریں جاتی تھیں، اُن میں مزاج کی کیفیت کا مذکور نہیں ہوتا تھا، اس لیے میرزا صاحب نے ۱۴ مارچ سنہ ۶۵ء کو منشی صاحب سے پھر استفسار کیا:

"منشی صاحب، عجب اتفاق ہے کہ حضور اپنے خط میں اپنے مزاجِ مبارک کا حال کچھ نہیں لکھتے، اور میرا دھیان لگا ہوا ہے۔ خدا کے واسطے تم مفصل حال لکھو کہ کیا عارضہ باقی ہے، اور صورت کیا ہے! دربار بدستور ہوتا ہے یا نہیں؟"

منشی صاحب کا جواب مثل میں موجود نہیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے مرض کے متعلق کیا لکھا۔ میرزا صاحب کے فارسی تہنیت نامے سے جو ۲۳ شوال سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء) کو لکھا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ مذکور تک میرزا صاحب کو سرکار کی صحت ہی کی اطلاع تھی۔

عودِ مرض اور وفات

سرکار کا مرض بالکل اچھا نہیں ہوا تھا۔ کسی بے احتیاطی سے دوبارہ اتنا شدید حملہ ہوا کہ اطبا عاجز ہو گئے، اور حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ جمعے کے دن ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو سرکار کا انتقال ہو گیا۔

خلد آشیاں کی تخت نشینی اور میرزا صاحب کا وظیفہ

نواب فردوس مکاں کے بعد، نواب خلد آشیاں نے مسندِ آبائی پر

(۱)۔ مکاتیب: ۱۱۰

قدم رنجہ فرمایا۔ میرزا صاحب کا تعلق سرکار کی ذات سے تھا، اس لیے دورِ جدید میں اس کے ختم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس خطرے کا میرزا صاحب کو احساس ہوا اور انھوں نے فوراً تہنیت نامہ لکھا۔ سوءِ اتفاق سے یہ مکتوب مثل میں موجود نہیں، لیکن نواب خلد آشیاں نے یکم مئی سنہ ۶۵ء کو اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"مشفقا، آنچہ مشاہرۂ آن کرم فرما از عہدِ نواب صاحب قبلہ فردوس مکان مقرر است، انشاء اللہ تعالیٰ، بدستور جاری ماند و حسبِ ضابطہ بخدمتِ سامی رسیدہ خواہد ماند"۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے تہنیت کے ساتھ اپنے وظیفے کے متعلق بھی کوئی درخواست کی تھی۔ یہ خواہش معرضِ قبول تک پہنچی، اور وظیفہ بدستور جاری رہا۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے ۳۰ جولائی کو سیاح کو لکھا ہے:

"اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا"۲

اس مکتوب سے ۲۴ روز قبل تجیر کو قدرے تفصیلاً تحریر فرمایا تھا:

"والیِ رامپور کو خدا سلامت رکھے! اپریل مئی ان دونوں مہینوں کا روپیہ موافقِ دستورِ قدیم آیا۔ جون ماہِ گزشتہ کا روپیہ خدا چاہے تو آ جائے۔ آج چھٹی جولائی ہے۔ معمول یہ ہے کہ دسویں بارھویں کو رئیس کا خط مع ہنڈوی آیا کرتا ہے"۳

تہنیت نامے کا امید افزا جواب پا کر میرزا صاحب نے قصیدۂ مبارکباد ارسال کیا، جسے عودِ ہندی سے چھبیسویں عریضے کے حاشیے میں نقل کر دیا گیا ہے۔ اس قصیدے کی پذیرائی حسبِ موافق امید ہوئی، اور میرزا صاحب کو بڑھاپے کی تمام مجبوریوں کے باوجود سفرِ رامپور کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔

(۱) مکاتیب ۱۲۶ ح (۲) اردوی: ۱۷۰ (۳) ایضاً: ۲۸۰۔

نواب خلد آشیاں کا دعوتنامہ

میرزا صاحب نے اپنے ارادۂ سفر کی اطلاع مرزا داغ کو دی۔ انھوں نے کسی مناسب موقع پر سرکار کے حضور میں ذکر کیا۔ سرکار نے ۱۱ جون سنہ ۶۵ء کو قصیدے کے ذکر کے بعد تحریر فرمایا:

"دریں ولا زمانی نواب مرزا عزم سامی بایں طرف مصروع گشتہ، موجب کمال مسرت ما است، چراکہ راقم نیز متمنی ملاقات شریف است۔ اللہ تعالیٰ شب یلدای فراق را بزودی ہرچہ تمامتر بایام وصال مبدل گرداند"[۱]

سرکار نے جشن تخت نشینی کے لیے دسمبر کا پہلا ہفتہ مقرر فرمایا تھا۔ میرزا صاحب نے اسی زمانے کو سفر کے لیے مناسب خیال کیا، اور سرکار کو لکھا:

"حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور رستے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورتوں میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، وہیں میں نے احرام بیت المعمور رامپور باندھا۔ انشاء اللہ العلی العظیم"[۲]

چنانچہ ماہ اکتوبر سنہ ۶۵ء میں، جب کہ ہنگامۂ آتش و آب رفع ہو چکا تھا، "احرام بیت المعمور رامپور" باندھنے کی نوبت آگئی۔

سفر کی غرض

میرزا صاحب کے اس سفر کی غرض و غایت نواب فردوس مکاں کے انتقال کی تعزیت اور نواب خلد آشیاں کی مسند نشینی کی تہنیت تھی۔ شاکر کو سفر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

۱۔ مکاتیب: ۳۲ ح ۳ (۲) ایضاً: ۳۰

"قبلہ و کعبہ، فقیر پا بہ رکاب ہے۔ سہ شنبہ چہار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رامپور ہو گے کہ تقریب وہاں جانے کی رئیس مرحوم کی تعزیت اور رئیس عالی کی تہنیت۔ دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔"(۱)

مجنون بریلوی کو رامپور سے تحریر فرمایا تھا:

"پیر و مرشد، نواب صاحب کا وظیفہ خوار، گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رامپور آیا۔"(۲)

لیکن اس تعزیت و تہنیت کی تہ میں جو غرض پنہاں تھی، اس کا اظہار مرزا تفتہ کے خط میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔"(۳)

تاریخ روانگی

شاکر کے خط کے مطابق میرزا صاحب کا ارادہ منگل یا بدھ کو رامپور روانہ ہونے کا تھا۔ اس کے بعد کسی وجہ سے رائے بدلی، تو علائی کو یکم اکتوبر سنہ ۶۵ء کے خط میں لکھا:

"میاں تم جانتے ہو کہ میں عازم رامپور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بشرطِ حیات جمعہ کو روانہ ہوں گا۔"(۴)

لیکن ثاقب کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کو دو تین گھڑی دن چڑھے دلی سے روانہ ہوئے۔ فرماتے ہیں:

"ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ مگر وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی۔"(۵)

---

(۱) اردوی: ۲۱۶ عود: ۱۶۰ مؤخرالذکر میں "عازم رامپور ہوں گا" ہے۔ (۲) اردوی: ۲۰۸ عود ۱۹۹ (۳) اردوی: ۹۸ (۴) ایضاً: ۳۹۵ (۵) ایضاً ۲۹۲

حکیم غلام نجف خاں کو مراد آباد پہنچ کر جو خط لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کو ماہِ اکتوبر کی ۷ تاریخ تھی۔ فرماتے ہیں:

"بدھ کا دن پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔
۱۰ جمادی الاول کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے۔"(۱)

حکیم احمد حسن مودودی کو صراحت سے لکھا ہے کہ
"ہفتم اکتوبر کو دلی سے رامپور کو روانہ ہوا۔"(۲)

رفقائے سفر

اس سفر میں میرزا صاحب کے ساتھ باقر علی خاں، حسین علی خاں کلو خانساماں، نیاز علی اور دو آدمی اور تھے۔ میرزا صاحب نے پالکی میں اور دونوں لڑکوں نے کبھی رتھ اور کبھی گھوڑوں پر راستہ طے کیا۔ بقیہ چار آدمیوں اور سامانِ سفر کی کے لیے دو گاڑیاں ہمراہ تھیں۔ حکیم غلام نجف خاں کو محولۂ بالا خط میں لکھا ہے:

"میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا... دونوں لڑکے، دونوں گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔"

ثاقب کے خط میں لکھا ہے:

"دونوں گھوڑے کوتل آگئے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔"

آدمیوں کے بارے میں رامپور سے روانگی کے وقت علائی کو لکھا ہے:

"آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی... دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی، یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔"(۳)

کیفیت منازلِ سفر

میرزا صاحب نے دلی سے رامپور تک ۶ منزلیں طے کی تھیں۔ حکیم

(۱) اردوئ: ۳۳۳ (۲) ایضاً: ۲۴۳ (۳) ایضاً: ۳۴۹۔

احمد حسن مودودی کو تحریر فرمایا ہے:

"ہفتم اکتوبر کو دلی سے رامپور کو روانہ ہوا۔ بعد قطعِ منازلِ سفر
وہاں پہنچا"(۱)

ثاقب کو ان منازل کی تفصیل بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہوگا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی
دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکھوے
رہوں، وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں
برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں
ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں
کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا ... آج میں نے تمہارے
والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔
سورج نکلے باؤ گڈھہ کی سرائے میں آ پہنچا۔ چارپائی بچھائی، اس پر
بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں، اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دونوں گھوڑے
کوتل آ گئے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آ لے
اور کھانا کھا لیا اور چلے"(۲)

حکیم غلام نجف خاں کو ہاپوڑ سے مراد آباد پہنچ کر لکھا ہے:

"بدھ کا دن پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔
۱۰ جمادی الاول کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے ... رات بخیر گزرے، بشرطِ
حیات کل رامپور پہنچ جائیں گے"(۳)

منازلِ سفر کے متعلق حکیم غلام رضا خاں کو تحریر کرتے ہیں:

"تم سے رخصت ہو کر اور تمہیں خدا کو سونپ کر روانۂ رامپور ہوا۔ موسم
اچھا تھا۔ گرمی گزر گئی تھی۔ جاڑا ابھی چمکا نہ تھا۔ عالمِ اعتدالِ آب و ہوا"

(۱) اردوی: ۲۳۳ (۲) ایضاً: ۲۹۳ (۳) ایضاً: ۲۳۳

سایہ و سرچشمہ جا بجا۔ آرام سے رامپور پہنچا۔"(۱)

توشۂ راہ

ثاقب کے خط میں میرزا صاحب نے ہاپڑ کی سرا سے کے کھانے اور لڑکوں کے اتحاد کے متعلق لکھا ہے :

"میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اُس میں ڈال دیے رات ہو گئی تھی۔ شراب پی لی، کباب کھائے، لڑکوں نے ادھر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی، اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا، ترکاری نہ ڈلوائی۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے۔ آپس کی صلاح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اُتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی مل کر کھا لیتے ہیں۔"(۲)

ناسازیٔ طبیعت

اوقاتِ غذا میں اختلال اور راستے کی تھکن سے میرزا صاحب کو قبض کی شکایت ہو گئی تھی۔ حکیم غلام نجف خاں کو مراد آباد سے تحریر کیا ہے :

"گھبرایا ہوا ہوں، تیسرا دن ہے پاخانہ پھرے کو۔"(۳)

تاریخِ ورودِ رامپور

مذکورہ چھ منزلیں طے کر کے، میرزا صاحب جمعرات کے دن ۱۲ اکتوبر سنہ ۶۵ء کو رامپور تشریف لائے۔ جنون بریلوی کو رامپور سے تحریر فرمایا ہے:

"۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرطِ حیات آخرِ دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔"(۴)

حکیم غلام نجف خاں کے محولۂ بالا خط میں بھی، جو ۱۱ اکتوبر کو مراد آباد سے لکھا تھا، یہی تحریر کیا ہے کہ کل ۱۲ اکتوبر کو رامپور پہنچ جاؤں گا۔ حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام کے خط سے بھی یہی تاریخ مستنبط ہے۔ فرماتے ہیں :

---

(۱) اردوی : ۲۸۲ (۲) ایضاً : ۲۹۲ (۳) ایضاً : ۲۳۳ (۴) ایضاً : ۳۰۸، ۳۰۸ عود : ۱۶۹ ـ

"ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رامپور کو روانہ ہوا۔ بعدِ قطعِ منازلِ ستہ وہاں پہنچا۔"(۱)

نواب خلد آشیاں کی تواضع

نواب خلد آشیاں نے میرزا صاحب کی خوب خاطر و تواضع کی۔ قیام کے لیے جرنیلی کی کوٹھی(۲) اور باورچی خانے سے کھانا مقرر ہوا۔ حکیم غلام نجف خاں نے اپنے خط میں غذا کے متعلق تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے صبح شنبہ ۲۱ اکتوبر سنہ ۶۵ء کو لکھا ہے:

"تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم! میں یہاں خوش اور تندرست ہوں! دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، اچار۔ میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلو اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔"(۳)

۲۴ اکتوبر کو میرزا صاحب نے پھر حکیم صاحب کو خط لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں سرکار نے کھانے اور جانوروں کے گھاس دانے کی نقدی مقرر فرما دی تھی۔ فرماتے ہیں:

"آج منگل کا دن ۴ جمادی الثانی کی اور ۲۴ اکتوبر کی ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی۔ لیکن اس میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔"(۴)

تعظیم و توقیر اور اخلاص

نواب خلد آشیاں قدر دانیٔ علم و ہنر میں اپنے والدِ مرحوم کے سچے

(۱) اردوی: ۳۴۳ (۲) یہ عمارت قلعۂ معلی کے مشرقی دروازے کے باہر واقع تھی۔ نواب جنت مکاں نے قدیم عمارتیں منہدم کرا کے نئی عمارات تعمیر کراتے وقت بعدِ ترمیم مناسب اسے قلعے کے اندر داخل کر لیا ہے۔ (۳) اردوی: ۲۱۹ و ۲۲۰ (۴) ایضاً: ۲۲۳

جانشین تھے۔ اُنھوں نے میرزا صاحب کی تعظیم و توقیر اور خاطر تواضع کا بیحد لحاظ کیا۔ میرزا صاحب ۲۱ اکتوبر کو حکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

"آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع، اخلاق؛ کسی بات میں کمی نہیں۔"(۱)

سرکار کا التفات روز افزوں دیکھ کر میرزا صاحب نے ۲۴ ماہِ مذکور کو پھر حکیم صاحب کو تحریر کیا ہے:

"اب روداد سنو۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔"(۲)

اُس بات کی کچھ اصل نہیں

رامپور کے سفر سے قبل میرزا صاحب نے کوئی مخفی بات اپنی بیوی سے کہی تھی۔ یہاں آکر اُس کی تغلیط ہو گئی، تو حکیم صاحب کے خط کے آخر میں اُن کے صاحبزادے کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

"ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحب پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور اُن سے یہ کہدو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی، وہ غلط ہے۔ اُس کی کچھ اصل نہیں ہے۔"(۳)

نواب خلد آشیاں سے متعلق میرزا صاحب کی رائے

میرزا صاحب، سرکار کے حُسنِ صورت و سیرت کے اس قدر گرویدہ ہوے کہ اُنھیں بعض شیوہ و روش میں نواب فردوس مکاں پر ترجیح دینے لگے۔ اُس زمانے میں سرکار نے بعض عُمالِ ریاست کو سرکاری مطالبات اور عام رعایا کو غلّے کا محصول معاف کر دیا تھا۔ ان تمام واقعات نے میرزا صاحب کے دل پر اچھا نقش کیا۔ حکیم غلام رضا خاں کے خط میں اُن کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"نواب صاحب حال بمقتضائے 'اَلوَلدُ سِرٌّ لِاَبِیہ' حُسنِ اخلاق میں

(۱) اردوی: ۲۲۳ (۲) ایضاً: ۲۲۳ (۳) ایضاً: ۲۰۹ و ۲۲۰

نواب فردوس آرام مکان کے برابر بلکہ بعض شیوہ و روش میں اُن سے بہتر ہیں۔ بعد مسند نشینی کے غلّے کا محصول یک قلم معاف کیا۔ علی بخش خاں خانساماں کو ۳۰ ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکاری بخش دیا۔ مفصل حالات بذل و نوال عند الملاقات زبانی کہوں گا۔"(۱)

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نواب صاحب از روئے صورت روح مجسم، اور باعتبار اخلاق آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اُس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلّے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہل کار پر ساٹھ ہزار کا مطالبہ معاف کیا، اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سُن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ بتقریب شادی سبیہ تجویز ہوا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔"(۲)

علائی کے خط میں نواب صاحب کی تصویر کھینچی ہیں:

"رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، ڈیل، شکل، شمائل بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفاوت۔ حلیم، خلیق، باذل، متواضع، متشرّع، متورّع، شعر فہم، سینکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائی طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سُن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اَللّٰھُمَّ دَامَ اِقْبَالُہٗ وَزَادَ اِجْلَالُہٗ۔"(۳)

نواب خلد آشیاں جشنِ تخت نشینی سے قبل اضلاعِ ریاست کے معائنے کو تشریف لے گئے تھے۔ میرزا صاحب نے بھی رضوان کے ۴ نومبر ۱۸۶۵ء کے

(۱) اردوی: ۲۵۲ (۲) ایضاً: ۹۸ و ۹۹ (۳) ایضاً: ۱۴۱۔

خط میں اُن کے سفر کے پروگرام کی ان لفظوں میں اطلاع دی ہے :

"آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورے کو گئے ہیں فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ آکر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمائش گاہِ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔ وہاں سے پھر کر جب آئیں گے، تو کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ وہ پنجم دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن جشن رہے گا۔ اس کے دو چار روز بعد غالب رخصت ہوگا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جاے۔"(۱)

جب سرکار سوار ہونے لگے، تو مشایعت کے لیے میرزا صاحب بھی سواری تک ساتھ آئے۔ سرکار پا برکاب ہوئے، تو حاضرین کے ساتھ میرزا صاحب نے بھی آداب و کورنش ادا کی۔ سرکار نے میرزا صاحب کے آداب پر تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا: "خدا کے سپرد" میرزا صاحب کی شوخیِ طبع نے گدگدایا اور آپ قدرے حزیں صورت بنا کر بولے: "حضرت، خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔"(۲)

جشنِ جمشیدی

دسمبر کا پہلا ہفتہ جشنِ تخت نشینی کے لیے مقرر ہوا تھا، اور اس تقریب کا اس درجہ شاندار اہتمام کیا گیا تھا کہ میرزا صاحب نے اس کو "جشنِ جمشیدی" سے تعبیر کیا ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :

"نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے۔ جشنِ جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"(۳)

۲۴ اکتوبر کو تاریخ جشن کے متعلق لکھتے ہیں :

"دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہوگا۔ ہفتے دو ہفتے کی مدت اُس کی ہے بعد جشن کے رخصت ہوں گا۔ خدا چاہے، تو آخر دسمبر تک تم کو آ دیکھنا ہو۔"(۴)

---

(۱) اردوی : ۳۲۰ (۲) یادگارِ غالب : ۴۲ (۳) اردوی : ۲۳۱ (۴) ایضاً : ۲۲۴

مرزا تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔"(۱)

۶ دسمبر سنہ ۶۵ء کو علائی کے خط میں اس جشن جمشیدی کی روداد لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا، تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے، اور خیموں میں اترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے، سب سرکار رامپور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پرنور بہ تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار روپیے سے کم نہ اںثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ "پلٹن" شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ لوا تعت کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہئے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر مع صاحبان عالی شان کے کل جائیں گے، کوئی کہتا ہے پرسوں۔"(۲)

مبارکبادِ خلعت

میرزا صاحب نے اس تقریب پر ایک فارسی نثر اور ۳۰ شعر کا ایک قصیدہ خلد آشیاں کے حضور میں پیش کیا۔ نثر کے انجام میں لکھتے ہیں:(۳)

(۱) اردوی: ۹۹ (۲) ایضاً: ۱۴۲ (۳) یہ نثر کلیاتِ نثر فارسی: ۹۱ میں چھپ چکی ہے۔

رخصت طلب کریں، اور آخر دسمبر تک دلی جا پہنچیں۔ حکیم غلام نجف خاں کے خط میں اس کا ذکر آچکا ہے[1]۔ علائی کو ۶ دسمبر کو تحریر کرتے ہیں:

"بعد اختتام محافل طالب رخصت ہوں گا۔ بعد حصول رخصت دلی جاؤں گا۔"[2]

اسی طرح جنون بریلوی کو بریلی کی دعوت قدوم کے جواب میں لکھا ہے:

"پیر و مرشد، نواب صاحب کا وظیفہ خوار، گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رامپور آیا۔ میں کہاں اور بریلی کہاں! ۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرط حیات آخر دسمبر تک دلی جاؤں گا۔"[3]

لڑکوں کی روانگی

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اب نوجوان تھے۔ میرزا صاحب نے دونوں کو جمعے کے دن ۲۲ دسمبر کو روانہ کرکے علائی کو لکھا:

"آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں، ۱۴ مرغ، ۲ بڑے اور آٹھ چھوٹے (لے) کے دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی، یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے وقت رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔"[4]

میرزا صاحب کی تاریخ روانگی

اسی خط کے آخر میں اپنی روانگی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی ہفتے میں چلوں گا۔"

۲۶ دسمبر کو پھر تحریر فرماتے ہیں:

"جانا! جانا! ایک خط میرا تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہوگا۔ آج پنجشنبہ ہے ۷ شعبان کی اور ۲۴ دسمبر کی۔ دونوں بھتیجے

(۱) اردوئے معلیٰ: ۴۲۴ (۲) ایضاً: ۲۳۳ (۳) ایضاً: ۱۲۸، ضمیمہ ۱۲۶ (۴) اردوئے معلیٰ: ۳۹۴

تمہارے جمعے کے دن ۲۲ دسمبر کو روانۂ دہلی ہوئے۔ میں پرسوں یوم الخمیس کو مرحلہ پیما ہوں گا۔"(۱)

اس حساب سے میرزا صاحب جمعرات کے دن ۲۸ دسمبر سنہ ۶۵ء کو رامپور سے رخصت ہوئے۔

احباب رامپور سے آخری ملاقات

سرکار سے رخصت حاصل کر کے میرزا صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے۔ رامپور کے بعض احباب الوداع کہنے کے لیے پہلے سے جمع تھے۔ صاحبزادہ سید نجابت علی خاں بہادر نے حقیر عرشی سے بیان کیا کہ جب میرزا صاحب سرکار سے رخصت ہو کر قیام گاہ پر واپس آئے، تو میں اپنے والد سید ہدایت علی خاں بہادر کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔ میرزا صاحب نے احباب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "بھئی! ہم نے ابھی یہ شعر کہا ہے:

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ — آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے"(۲)

رخصتانے کی رقم

میرزا صاحب نے ۲۸ نومبر کو رامپور سے تفتہ کو لکھا تھا:

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں، روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔"(۳)

---

(۱) اردوی: ۳۹۶ (۲) مولانا نظامی بدایونی نے شرح دیوانِ غالب اردو (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۲۲ء) کے صفحۂ ۲۵۴ پر یہ مقطع اور ایک شعر نقل کر کے حاشیے میں لکھا ہے: "حضرت نواب سے نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس غزل کے شعر ہیں جو رامپور سے رخصت ہوتے وقت لکھی تھی۔ چونکہ دیوان اس وقت مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا، اس لیے دیوان میں شامل نہیں ہوئی۔" اس بیان میں مولانا سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ ایک عینی شاہد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر مراد ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ پچھلے سفر میں میرزا صاحب رامپور سے دیوانِ اردو کی نقل لے گئے تھے جس سے دیوان طبع ہوا، اس لیے نواب فردوس مکاں کے بجائے نواب خلد آشیاں کے عہد کی غزل کا اس میں شامل نہ ہونا قرینِ قیاس اور مطابقِ واقعہ ہو سکتا ہے۔ (۳) اردوی: ۹۸۔

نواب خلد آشیاں ۳۰ اکتوبر سنہ ۶۶ء کو ایک ہزار رُپے عطا فرما چکے تھے؛ تاہم ۲۶[1] دسمبر سنہ ۶۶۵ کو ۲۰۰ رُپے بوجہ زادِ راہ مرحمت فرما کر میرزا صاحب کی اِس آرزو کی بھی تکمیل کر دی[2]۔

نواب ضیاء الدین خاں بہادر کی فرمائش

نیّر نے میرزا صاحب سے فرمایش کی تھی کہ رامپور سے بانس کی غلیل لائیں۔ میرزا صاحب نے فرمائش پوری کی۔ لیکن غلیل پر جو کچھ بیتی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ علائی کے نام رامپور سے ۲۶ دسمبر کو لکھا ہے:

"تو کمان گروہہ کھا کر۔ فارسی بھگار اکر۔ مجھ سے ہندی کی چندی سُن۔ ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے۔ ایک علی اصغر خاں[3] سے اینٹھی دونوں کل آئیں گی"[4]

لیکن سوءِ اتفاق سے فرمائش کی تکمیل میں سعی کے بعض مدارج رہ گئے۔ اور غلیل پر نئی اُفتاد پڑی۔ ۱۳ جنوری سنہ ۶۶ء کو میرزا صاحب علائی کو لکھتے ہیں:

"میاں چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی۔ رامپور پہنچکر وہ بےسعی و تلاش ہاتھ آگئی، بنوا رکھی۔ لڑکوں نے ملازموں نے مجھ سے سُن لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی

(۱) آدار جہ خزانہ سنہ ۶۶-۶۵ء ۱۸۶۵ء، مد انعام و عنایات، ۲ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء (۲) آدار جہ خزانہ سنہ ۶۶-۶۵ ۱۸ء مد انعام و عنایات ۹ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء (۳) صاحبزادہ سید علی اصغر خاں بہادر ولد سید جعفر علی خاں ولد سید نظام علی خاں ولد نواب سید فیض اللہ خاں بہادر عرش منزل مراد ہیں۔ نواب فردوس مکاں نے ۱۸۵۷ء کی شورش میں ریاست کی فوج کے ساتھ مراد آباد و امروہہ کی شورش مٹانے کے لیے بھیجا اور ازاں بعد امروہے کا ناظم بنا دیا۔ بعد غدر خدمات کے صلے میں ۲ ہزار رُپے سالانہ مالگزاری کی ضبط شدہ جاگیر گورنمنٹ سے واگزاشت کرائی، اور ۵ ہزار رُپے کا خلعت دلایا۔ نواب خلد آشیاں کے ابتدائے عہد میں کل افواجِ ریاست کے جنرل مقرر ہوئے اور وجیہ الزماں خاں کے انتقال کے بعد انگریزی گورنمنٹ میں ریاست کی جانب سے سفیر بھی بنا دیے گئے۔ ۴ سو رُپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے ۲۴ شعبان ۱۲۹۵ھ (۲۴ اگست ۱۸۷۸ء) کو انتقال کیا۔ (اخبار الصنادید (۲) ۱۹۷)

جستجو کی؛ کہیں بہم نہ پہنچی۔ دس روپے تک مول کو نہیں ملی۔ نواب
صاحب سے مانگی۔ توشے خانے میں بھی نہ نکلی۔ ایک امیر کے ہاں پتا
لگا، دوڑا ہوا گیا۔ کچھی موجود پائی۔ لیکن کیا کچھی، جیسے نجف خاں
کے عہد میں تورانیوں میں ہماری تمہاری پڑی۔ بنوانے کی فرصت کہاں؟
آج لی، کل چلدیا۔ اس بانس کی قدر کرنا، اور اس کو اچھی طرح بنوا لینا۔"(۱)

سفر کے مصائب

رامپور سے واپسی میں میرزا صاحب کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا
مراد آباد کے نیچے دریای رام گنگا بہتا ہے۔ سرمائی بارش کے سبب
اس میں سیلاب آگیا تھا۔ میرزا صاحب کی پالکی پار ہوتے ہی پانی کے زور
سے کشتیوں کا عارضی پل ٹوٹ گیا۔ اسباب کی گاڑیاں اور ملازم اس پار
رہ گئے، اور میرزا صاحب یکہ و تنہا ایک کمبل ساتھ لیے مراد آباد کی سرائے
میں جا کر اقامت گزیں ہوئے۔ بڑھاپے کی کمزوری سرمائی تکلیفوں کا
مقابلہ نہ کر سکی اور یہ بیمار ہو گئے۔ پانچ دن صدر الصدور مراد آباد کے یہاں
قیام کیا، اور جب قدرے رو بصحت ہوئے، تو دلی کا عزم کیا۔ دلی پہنچ کر
نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:

"بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اتر آنے کے
پل کا ٹوٹ جانا، گاڑی، اسباب یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع
آدمیوں کے اُس پار رہ کے میدان میں رہنا، بغیر بارش کے مجھ کو [illegible]
خیر جو اُن پر گزری وہ جانیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک ٹوٹی سی
حویلی میں ٹھہرا۔ کبھو کا پیا سا کمبل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کے صبح کی۔

گرم فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اٹھا۔ صاحبزادہ [illegible] علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے

(۱) اردوی: ۱۵۱، نسخہ میں "کرتا" اور "بنوا لیتا" ہے۔

دو فرسنگ آئے، اتفاقاً کہ سعید الدین خاں صاحب کے ہاں سے گئے
صاحب زادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین خاں صاحب نے
وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر
صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی
نواب مصطفیٰ خاں وہیں مجھ سے آ کر ملے۔ دوسرے دن وہ راہی اکبر
رامپور اور میں بادہ نوردِ سمتِ آبادِ دہلی ہوا۔(۱)

سرکار کی ہمدردی

یہ عریضہ ۱۰ جنوری سنہ ۶۶ء کو لکھا گیا تھا۔ سرکار کو اس کے پہنچنے سے
پہلے ہی شیفتہ کی زبانی تمام حالات کی اطلاع مل چکی تھی۔ اور انھوں نے
مراد آباد پہنچے مرزا صاحب کو لکھا تھا:

"زبانی نواب مصطفیٰ خاں بہادر کے دریافت ہوا کہ مراد آباد میں کچھ طبیعت
آپ کی علیل ہو گئی ہے۔ باستماع اس امر کے باعث کمالِ تردد کا ہوا۔
اس واسطے حوالہ قاصد خریطہ نگار ہوتا ہے کہ خیریت مزاج سے مطلع کیجیے۔
اور اگر ہنوز طبیعت مائل باعتدال نہ ہوئی ہو اور آپ کا ارادہ قیامِ مراد آباد
کا تا درستیٔ طبیعت ہو تو آپ بلا تکلف یہیں تشریف لائیے یہاں معالجہ
بخوبی عمل میں آوے گا۔"(۲)

مرزا صاحب اسی دن مراد آباد سے روانہ ہو گئے تھے، جس دن شیفتہ
وہاں سے رامپور کو چلے گئے۔ اس لیے یہ فرمان انھیں نہ مل سکا۔ دلی
پہنچ کر ۱۰ جنوری کو مرزا صاحب نے روداد سفر پر مشتمل عریضہ روانہ کیا
تو اس کے جواب میں خلد آشیاں نے تحریر فرمایا:

"الحمد للہ کہ وصولِ خبرِ خیریت آگیں باعثِ اطمینان ہوا۔"
اس فرمان کے جواب میں مرزا صاحب نے ۲۱ جنوری کو لکھا:

(۱)۔ مکاتیب: ۸۴ (۲) ایضاً: ۴۷

"اس سفر کا حال کیا عرض کروں۔ دلی سے رامپور تک ذوقِ قدمبوسی میں جو انا نہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہوا و تفرقۂ اوقاتِ غذا کو ہرگز نہ مانا۔ اور رنج راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقتِ معاودت اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا کہ جوہرِ روح گداز پاکر ہر بُنِ مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید نہ ہوتی، تو دلی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، بینہ، قبض و انقباض، فقدانِ جوع، فاقہ ہائے متواتر، منزلہائے ناما نوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوائے زمہریر کا چانگڑا رہنا۔ بارے ہاپوڑ سے چل کر نیر اعظم کی صورت دکھائی دی۔ دھوپ کھاتا ہوا دلی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا ہی روٹا لوا لی ہوں، جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اس در پہ پہنچوں۔"(۱)

لٹ گئے

اس سفر میں میرزا صاحب کی تکالیف اس حد کو پہنچ گئی تھیں کہ وہ اُسے حسنِ فکر کی بربادی سے تعبیر کرتے تھے۔ رضوان کو لکھتے ہیں:

"رامپور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطفِ طبیعت، یہ اسباب لٹ گیا۔"(۲)

رہ آورد

ان جسمانی اذیتوں نے میرزا صاحب کی صحت پر بہت برا اثر کیا، اور انھیں رعشہ و ضعفِ بصر کی شکایت زیادہ ہو گئی۔ ۱۲ مئی سنہ ۶۶ کو ذکا کو تحریر فرماتے ہیں:

"تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے

(۱) مکاتیب: ۴۹ (۲) اردوئے: ۳۲۱

رعشہ و ضعفِ بصر جہاں چار سطریں لکھیں، اُنگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔"[1]

وقت و تاریخ ورودِ دلی

عناصر کی اس بے رخی کا مقابلہ کرتے ہوئے میرزا صاحب ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو دوشنبے کے دن گیارہ بجے دلی پہنچے۔ مرزا تفتہ کو ورود کی اطلاع دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"لو صاحب! کھچڑی کھائی دن بہلائے، کپڑے پہنے گھر کو آئے۔ ۸ جنوری ماہ و سالِ حال دوشنبے کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمہارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مرادآباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ اُنھوں نے بیمارداری اور غمخواری بہت کی۔"[2]

حکیم احمد حسن مودودی کو لکھا ہے:

"ہشتم جنوری کو دلی پہنچا۔ عرض راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مرادآباد میں صاحبِ فراش رہا۔ اب جیسا فرسودہ روان و ناتوان تھا، ویسا ہوں۔"[3]

مجروح کو لکھتے ہیں:

"بندۂ گنہگارِ شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اُٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر مثل بلائے ناگہانی نازل ہوا ہوں۔

باید کہ کنم ہزار نفریں بر خویش || از بانِ حبادۂ راہِ وطن"[4]

شاکر کو لکھا ہے:

"قبلہ یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ۸ جنوری کو فقیر دلی پہنچا، ناتواں و خستہ و رنجور۔ ہنوز افاقتِ کلی نہیں پائی۔"[5]

۱۔ اردوی: ۳۵ رامپور کی ان سوغاتوں کی تحقیق عریضہ ۶۲ و ۶۳ کے حاشیوں میں ملاحظہ ہو

۲۔ ایضاً ۱۰۸ (۳) ایضاً: ۲۲۳ (۴) عود: ۱۷۶ (۵) ایضاً: ۱۶۲

یہی تاریخ نواب خلد آشیاں کو بھی لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

"دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء در غمکدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دلی پہنچا؟"[1]

باہر رہنے کی کل مدت

میرزا صاحب ۷ اکتوبر سنہ ۶۵ء کو دلی سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری سنہ ۶۶ء کو واپس پہنچے۔ اس حساب سے اُن کی دلی سے باہر رہنے کی کل مدت تین ماہ ہوتی ہے۔

ارسال ہدایا

حسب ضابطۂ مودت و خلوص، رامپور سے میرزا صاحب کو تحفے تحائف بھی بھیجے جاتے، جو بیشتر رامپور کے آم ہوتے تھے۔ میرزا صاحب کو آم طبعاً مرغوب تھے، اس لیے یہ تحفے انھیں انگریزی خلعت اور سرکاری عطیات سے کم نہ معلوم ہوتے ہوں گے۔ ۱۱ جون سنہ ۶۶ء کو سیاح کو لکھتے ہیں:

"رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔"[2]

سرکاری کاغذات سے پتا چلتا ہے کہ ۸ جون سنہ ۶۰ء کو نواب فردوس مکاں نے آموں کی دو بہنگیاں تحفۂ بہاریہ کہہ کر روانہ کی تھیں[3]۔ اس کے بعد ۲۹ جون کو دو بہنگیاں اور ارسال کی گئیں[4]۔ ۲۱ جون سنہ ۶۳ء کو قلمی آموں کی دو بہنگیاں روانہ کرتے ہوئے سرکار نے "حسب دستور" کے الفاظ سے اس تحفے کو تعبیر فرمایا[5]۔ آغازِ جولائی سنہ ۶۴ء میں بھی سرکار نے دو سو آم بھیجے۔ میرزا صاحب ۵ جولائی کو اس عنایت کی رسید میں لکھتے ہیں:

۱۔ مکاتیب ۲۸: (۲) اردوی ۱۶۷۹ (۳) مثل نمبر ۲۰۶ (۴) مثل نمبر ۳۱۹ (۵) مثل نمبر ۳۴۰

"نوازش نامہ اور اس کے ساتھ دو بہنگیاں دو سو آموں کی پہنچیں۔
سپاس نعمتہائے تو چند انکہ نعمتہائے تو۔"[۱]

فرمایشیں

اس کے علاوہ کبھی کبھی دونوں طرف سے بعض چیزوں کی فرمایش بھی ہوتی تھی۔ ۱۷ اپریل سنہ ۶۰ء کو نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب کو لکھا:

"مشفقا، چونکہ یہ ایام رنگترہای دمرتیزی کے ہیں، اس واسطے حوالے خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ بمقتضای لطف و عنایت فرمائی مخلصانہ کے ایک ایک بہنگی رنگترہای سبز دمرتیزی کی بتفاوت دس دس روز کے تا اختتام فصل روانہ اس سرکار کے فرماتے رہیے، اور قیمت رنگتروں اور اجرت کہاروں بہنگی سے مخلص کو مطلع فرمائیے، تاکہ مطابق اس کے ہنڈوی آپ کی سامی خدمت میں بھیجی جائے۔ اگرچہ آپ کو اس خصوص میں تکلیف ہوگی۔ لیکن آپ کی محبت اور الفت قلبی سے چشمداشت یہ ہے کہ اس باب میں جانب ملازمان سامی سے بخوبی عمل میں آئے گا۔"[۲]

میرزا صاحب نے اس فرمایش کی تعمیل کی۔ سرکار نے ۲۹ اپریل کے مکتوب میں اس کا شکریہ ادا فرمایا۔[۳] اس کے بعد اپریل سنہ ۶۱ میں بھی میرزا صاحب نے رنگترے ارسال کیے۔ ۲۰ اپریل سنہ ۶۱ء کو سرکار نے ان کا بھی شکریہ ادا کیا۔[۴] سنہ ۶۲ء میں نواب فردوس مکاں نے چوب چینی کی فرمایش

۱؎ مکاتیب: ۲۲ (۲) مثل نمبر ۲۵۲ سنہ ۶۰ - ۱۸۵۹ء (۳) مثل نمبر ۲۲۲ [illegible] کے آوارجے میں شاہجہاں آباد سے رنگتروں کی خرید کا حساب درج نہ ہونے کے باعث یہ بتانا دشوار ہے کہ میرزا صاحب کو رنگتروں کی قیمت وغیرہ ملی یا نہیں (۴) مثل نمبر ۲۲۳ آوارجہ خزانہ بابت سلطنت [illegible] (ورق ۵۰ الف) میں ۲ مئی سنہ ۶۱ء کے تحت شاہجہاں آباد سے رنگتروں کی خرید کا حساب درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۰ ٹوکروں کی قیمت پر اور بہنگی کہار کی مزدوری میں صرف ہوئے تھے۔ مگر اس میں میرزا صاحب کے بجائے محمد وزیر علی خانساماں کی معرفت خریدی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ خانساماں صاحب عالی خانے کے افسر ہوں گے اور اس لیے دفتری ضابطہ کی رو سے میرزا صاحب کی جگہ ان کا توسط کاغذات میں ظاہر کیا گیا ہوگا۔

کی میرزا صاحب نے بڑی کوشش سے پانچ سیر رنگین و سنگین دو بے گرہ یا کم گرہ قطعاتِ "چوب چینی" مہیا کر کے سرکاری کہار کے ہاتھ روانہ کیے، اور از راہِ معذرت لکھا:

"دلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کیمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا نہ اطرافِ شہر کے رؤسا۔"[۱]

۱۱ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء (غرّۂ محرم سنہ ۷۸ھ) کو میرزا صاحب نے آموں کی فرمایش کی۔ اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

"در بارہ ترسیلِ انبہ ہای کے کہ زیبِ ترقیم فرمایا ہے، حال یہ ہے کہ امسال بہار انبہ کی باغات اس سرکار میں بہت قلیل اور کم رہی اور علاوہ اس کے عجب کیفیت اُن میں پیدا ہوئی کہ قابل رکھنے دو چار دن کے نہ تھے، یعنی در صورت رکھنے کے خراب اور بوسیدہ ہو جاتے تھے۔ اس سبب سے بھیجنا انبہ ہای کا متصور نہ ہوا۔ ظہورِ اس امر کا بعالمِ مجبوری تصور فرمائیے۔"[۲]

رامپور کے دوسرے سفر میں نیّر کے لیے میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں سے ایک بانس کی غلیل مانگی۔ سرکار نے حکم دیا کہ توشہ خانۂ خاص سے عطا کر دی جائے۔ میرزا صاحب رامپور سے ۷ شعبان سنہ ۸۲ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو علائی کے خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ سے ہنڈی کی چندی سُن۔ ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے۔"[۳]

بعد ازاں اسی غلیل کے متعلق ۲۵ شعبان، مطابق ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھا ہے:

"اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی، کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی کہیں بہم نہ پہنچی، دس روپیہ تک مول کو نہ ملی۔ نواب صاحب

۱۔ مکاتیب: ۳۰ (۲) مثل نمبر ۲ (۳) اردوی: ۹۶۳۔

سے مانگی۔ تو نسخے ثانی میں بھی نہ تھی۔"[۱]

دیگر خدمات

میرزا صاحب سرکار رامپور کی دیگر خدمات بھی بجا لاتے تھے۔ دسمبر سنہ ۶۱ء میں نواب فردوس مکاں نے چوبے گردھاری لال کے لیے حکیم نیاز علی صاحب سے نسخہ تجویز کرا دینے کے متعلق تحریر فرمایا، تو میرزا صاحب نے جواباً لکھا کہ حکیم صاحب مریض کا معائنہ کرنے کے بعد دوا تجویز کریں گے۔ اس کے جواب میں ۱۹ دسمبر کو سرکار نے تحریر فرمایا:

"الحال چوبے معزی الیہ قصد آنجا بضرورت استعلاج از حکیم صاحب می دارند۔ لہذا حوالہ خامہ محبت نگار می شود کہ ہنگام رسیدن چوبے صاحب از حکیم صاحب ملاقات شان بخوبی کنانندہ تجویز علاج بخوبی بعمل آید۔"[۲]

۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۸۱ھ مطابق ۱۴ اگست سنہ ۶۴ء کو نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

"دربیولا لالہ شب سہائی ساہو رہنے والے رامپور کے واسطے معالجے آنکھوں اپنی کے شاہجہاں آباد کو آتے ہیں۔ اور لالہ مذکور متوسل اس سرکار کے ہیں۔ اس ... خامہ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ در بارۂ علاج لالہ معزی الیہ کے اطبای حاذق سے مراتب لطف اور مہربانی کے اُن کے حال پر مرعی اور مبذول فرما دیں۔"[۳]

جولائی سنہ ۶۷ء میں نواب خلد آشیاں نے دلی کے ایک شطرنج باز فاضل نامی کو رامپور بھیجنے کی تحریک کرائی۔ میرزا صاحب نے اُسے روانہ کرکے اطلاعاً نواب صاحب کی خدمت میں لکھا:

"بموجب تحریر میرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ کے، فاضل شطرنج باز

۱- اردوی: ۱۵/۱۲ (۲) مثل نمبر ۹۹ (۳) مثل نمبر ۴۸

کو خرچ دے کر روانہ کیا "۱

سرکار کا طریقِ خطاب

سرکاری فرامین کے القاب، آداب اور خاتمے میں ہر جگہ بزرگی و محبت کا لحاظ پایا جاتا، اور عام طور پر فرمان کا انداز یہ ہوتا ہے:

"نواب صاحب مشفق مہربان کرم فرمای مخلصان سلمہ اللہ تعالیٰ۔
بعد اشتیاق مواصلت موفور المسرت کہ منتہا و ذا التحریر ہے مشہود ضمیر مودت تخمیر کے ہو ۔۔۔ زیادہ جمعیت و نشاط ہو"

اثنای مطالب میں جہاں میرزا صاحب کے خط کا حوالہ آیا ہے، وہاں اُن کے مکتوب کو "سامی صحیفہ لطف آگیں" یا "نمیقہ ابہتہ بالغت مشحون" یا دیگر تعظیمی الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر جگہ لفظ "مشفقا" سے تخاطب ہے۔ ایک مکتوب میں نواب فردوس مکاں نے اپنے تعلقات کی صراحت بھی فرمادی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"چونکہ آپ خفا ہوتا مخلص کا بسبب عدم رسیٔ رقائم اخلاص محتوی رسیدات صحائفِ موصوفہ اپنے تحریر فرماتے ہیں، اسے حضرت، مخلص صمیم تو آپ کو بزرگ اور عنایت فرما اپنا جانتا ہے۔ توقف رسی رقائم نیاز کی باعث خفگی نہ تصور فرمایئے"۲

ان رواسم و آداب سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرکارِ رامپور سے میرزا صاحب کے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔

میرزا صاحب کا طریقِ خطاب

خود میرزا صاحب کے عرائض کے القاب، آداب اور خاتمے بھی اس پر شاہد ہیں کہ اس رشتے کی بنا احسان و عنایت کے ساتھ محبت

۱۔ مکاتیب ۴۳۔ اعادیہ میں ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کے تحت ۲۵ روپیہ کی ایک رقم کا فاضل شطرنج باز کو عطا کیا جانا دریافت ہوتا ہے (۲) مثل نمبر ۱۲۲، صفحہ ۱ عباب

وخلوص پر مبنی۔ تقریباً تمام عرائض میں "ولی نعمت" سے مخاطب کیا ہے، اور بعد "تسلیم معروض ہے" سے مطلب کا اظہار شروع کر کے "زیادہ حدِ ادب" پر عریضے کو ختم کر دیا ہے۔ خاتمے میں بالعموم دو دعائیہ شعروں میں سے ایک اور کبھی دونوں پائے جاتے ہیں۔ دو چار خطوں کے اندر ان شعروں کا ایک ایک مصرع لے کر پورا شعر بھی بنا لیا ہے۔ یہ یکسانی اور تکرار خود تصنع سے پرہیز پر دلالت کرتی ہے۔

رامپور سے کل مالی امداد

میرزا صاحب کو بارہ برس میں دربار رامپور سے جو مالی مدد ملی، اُس کی مجموعی مقدار ۱۲ ہزار ۲ سو ۲۵ روپے ہے[1] اس رقم میں سے کچھ اوپر دس ہزار نواب فردوس مکاں نے اور باقی نواب خلد آشیاں نے عطا فرمائے تھے۔

اس امداد میں وقتی عطیے اور وظیفہ دونوں شامل ہیں۔ وظیفے کا تقرر جولائی سنہ ۵۹ء میں ہوا تھا، جو میرزا صاحب کی تاریخ انتقال ۱۵، فروری سنہ ۶۹ء تک برابر ملتا رہا۔ اس کی کل مقدار ۱۱ ہزار ۵ سو ۵۰ روپے ہوتی ہے۔

عطیات کا سلسلہ ۵ فروری سنہ ۵۷ء سے شروع ہو کر میرزا صاحب کے انتقال کے بعد تک جاری رہا۔ اس مد میں جتنا روپیہ انھیں مرحمت ہوا اُس کی تاریخ وار تفصیل یہ ہے:

(۱) ۵ فروری سنہ ۵۷ء ۲۵۰ روپے بتقریب شیرینیِ شاگردی

(۲) ۲۳ مارچ ؍؍ ؍؍ ۲۵۰ ؍؍ ؍؍ عید نوروز

(۳) ۲۴ جولائی سنہ ۶۶ء (۱۵ ذیحجہ سنہ ۱۲۸۳ھ) ۲۵۰ ؍؍ بغرض امداد مالی

۱۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ تنخواہ کی رقم میں وہ سو روپے ماہوار شامل نہیں کیے گئے ہیں، جو رامپور کے قیام میں بنام دعوت ملا کرتے تھے کیونکہ مصارف مہمانداری سے تعلق رکھنے کے باعث انھیں مالی امداد میں شمار کرنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

(۴) ۳۱ اگست سنہ ۵۸ء ۲۵۰ روپے بغرضِ امدادِ مالی
(۵) ۲۵ نومبر 〃 ۲۵۰ 〃 〃
(۶) ۲۰ مئی سنہ ۵۹ء ۲۵۰ 〃 بغرضِ مصارفِ خدام[۱]
(۷) ۱۶ دسمبر 〃 ۲۰۰ 〃 بغرضِ امدادِ مالی[۲]
(۸) ۱۵ مارچ سنہ ۶۰ء ۳۰۰ 〃 〃 [۳]
(۹) ۲۴ جنوری سنہ ۶۱ء ۲۰۰ 〃 بتقریبِ شادیٔ نواب سید حیدر علی خاں بہادر
(۱۰) ۱۱ جولائی 〃 ۱۲۵ 〃 〃 (نواسے اور جوڑے کے)
(۱۱) ۱۱ مارچ سنہ ۶۳ء ۲۰۰ 〃 سفر خرچ انبالہ برائے شرکتِ دربار گورنر جنرل
(۱۲) ۳ اکتوبر 〃 ۲۰۰ 〃 بغرضِ امدادِ مالی
(۱۳) ۱۹ اگست سنہ ۶۵ء ۲۰۰ 〃 بتقریبِ غسلِ صحتِ نواب خلد آشیاں

۱۔ آوارجہ سنہ ۶۰-۱۸۵۹ء ورق ۲۵۹ ب برماہ اکتوبر ۵۹ء کے تحت ۲۵۰ کی رقم لکھ کر تحریر کیا گیا ہے:
درو جہ عنایت بابت تنخواہ مرزا نوشہ کہ قبل از تقرر تنخواہ بصیغۂ عنایات بذریعۂ ہنڈوی رفتہ بود، بموجب حکم مثبتۂ عرضی منشیان محکومۂ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء۔ (۲) آوارجے میں اس تاریخ کو تین سو روپے کی رقم کا خرچ دکھایا ہے۔ مگر میرزا صاحب اور نواب فردوس مکاں کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سو روپے مانگے اور بھیجے گئے تھے۔ اس صورت میں تین سو کا اندراج لغزشِ وظیفہ ماہواری ہوگا
(۳) اس رقم کی حسب ذیل رسید مثل میں شامل ہے:

رسید مرزا نوشہ صاحب

مبلغ سہ صد روپیہ کہ نصف یک صد و پنجاہ روپیہ می شود، بصیغۂ عنایات از سرکار فیض آثار معرفت لالہ گوکل پرشاد و پورن پرشاد خزانچیان وصول یافتم۔ بنابراں رسید نوشتہ شد۔

تعداد ہنڈوی

حوالۂ کارخانہ ماں مرزا نوشہ صاحب مورد شد۔ مرقوم ۱۵ مارچ سنہ ۶۴ء

اس رسید میں صرف مرزا نوشہ غالب کے قلم کا نوشتہ ہے۔ بقیہ عبارت غالباً کسی اہلکار نے لکھی ہے۔ ۱۷ مارچ کو دیوان نے اس رقم کے باضابطہ حکم عطا کی رپورٹ کی تھی ۱۸ کو حکم عطا نافذ ہوا، اور ۲۸ کو حساب کی مجرائی کا حکم ہوکر بکم اپریل کو آوارجہ سنہ ۱۸۵۹ء (ص ۳۶۰ الف) میں اندراج ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رقم ۱۵ مارچ کو علی بخش خاں خانساماں نے زبانی حکم کے مطابق نزد ایت خزانہ سے دلا دی تھی۔ بعد ازاں رپورٹ کرکے باضابطہ ۱۸ مارچ کو ادا ہوا

(۱۴) ۱۷ نومبر سنہ ۶۵ء ۱۰۰۰ رسمِ تقریبِ جشنِ تخت نشینی نواب خلد آشیاں

(۱۵) ۹ جنوری سنہ ۶۹ء ۲۰۰ ؍؍ نذرِ داروغہ دہلی

(۱۶) ۵ اکتوبر سنہ ۶۵ء اور ۲ جنوری سنہ ۶۶ء (کے درمیان) ۵۰۰ ؍؍ بغرضِ ادائی قرض

(۱۷) ۱ نومبر سنہ ۶۹ء ۴۰۰ ؍؍ بیگم غالب کو میرزا صاحب کا قرض ادا کرنے کے لیے

ان عطیوں کی مجموعی رقم ۵ ہزار ایک سو ۷۵ روپے ہوتی ہے۔ ان میں سے نمبر ۱، ۳، ۵، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۳، اور ۱۶ کا ذکر مکاتیب میں، اور بقیہ کا خزانے کے سنہ وار آوارجوں میں موجود ہے۔

۳ اکتوبر سنہ ۶۳ء کو دو سو روپے کی جو رقم ارسال ہوئی تھی، اس کے متعلق میرزا صاحب نے سرکار سے دریافت کیا تھا کہ تنخواہ میں سے پیشگی تو عطا نہیں ہوئی ہے۔ نواب فردوس مکاں نے اپنے دستِ خاص سے منشی سیل چند کو تحریر فرمایا:

"منشی سیل چند، میرزا نوشہ صاحب کو خط لکھ کر روانہ کر دو کہ یہ دو سو روپیہ تنخواہ سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔ آپ شوق سے صرف کیجیے۔ تنخواہ موافق معمول کے پہنچ جاوے گی۔ یہ علاوہ تنخواہ سے ہیں۔ فقط"۱

منشی صاحب نے سرکار کی طرف سے محولۂ بالا مضمون کا جواب ۱۱ اکتوبر کو روانہ کر کے میرزا صاحب کو اطمینان دلا دیا کہ یہ سراسر فتوح ہے۔

قاطع برہان کی طباعت میں امداد

طباعتِ قاطع برہان کے لیے دو سو روپے کی ایک رقم کا ذکر خود میرزا صاحب نے سیاح کے نام کے خط میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میرے پاس روپیہ کہاں، جو قاطع برہان کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب صاحب نے دو سو روپیہ بھیج دیے تھے۔ تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی [illegible]

۱؎ صحیفۂ احباب ؍ عہد فردوس مکاں۔

کے ساتھ دو سو پہنچیں گے۔ وہ آخر اپریل سنہ ۱۸۶۵ء حال میں مرگئے
اپریل کا روپیہ رئیسِ حال سے میں نے پایا۔ معرفت کتاب کا روپیہ
نہ آیا۔ یاد دلاؤں گا۔ مگر اس مرحوم کا وعدہ سررشتۂ دفتر سے نہ تھا
جو از روی دفتر اس کی تصدیق ہو۔ بہر حال فکر میں ہوں۔"[1]

یہ رقم قاطعِ برہان کی تاریخ طباعت[2] ۲۰ رمضان سنہ ۱۲۷۸ھ (۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء) سے قبل عطا ہونی چاہیے۔ لیکن کسی مثل میں حوالہ نہ ملنے کی بنا پر اس کی صحت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لیے میں نے عطیات کے حساب میں اسے شامل نہیں کیا ہے۔

ہر قصیدے پر انعام

میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے کہ میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں مدحیہ قصیدہ بھیجتا، تو وہ ۲۵۰ روپے کی ہنڈوی بھیجا کرتے تھے، جس کی دفتر سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔[3]

میرزا صاحب نے فردوس مکاں کی مدح میں ۴ قصیدے لکھے تھے، پہلے کا مطلع ہے:

ہمانا اگر گوہر جاں فرستم — بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

یہ ۱۱ فروری سنہ ۱۸۵۷ء کو بھیجا گیا تھا۔[4] دوسرے کا مطلع ہے:

چوں نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل — دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

یہ غالباً اگست سنہ ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا تھا۔[5] تیسرے کا مطلع ہے:

تعظیم غسلِ صحتِ نواب کم مگیر — زان عید کان مضاف بود جانبِ غدیر

یہ ۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۴ء کو روانہ کیا گیا تھا۔[6] چوتھے کا مطلع ہے:

مرحبا سالِ فرخی آئین — عیدِ شوال و ماہِ فروردین

۱- اردوی: ۱۵ (۲) قاطع برہان: ۹۳ (۳) مکاتیب: ۳۸ (۴) ایضاً: ۵ (۵) ایضاً: ۱۸
(۶) ایضاً: ۲۹ —

یہ ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کے درمیان کہا گیا تھا۔[1]

عطیات کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۵۷ء اور سنہ ۵۸ء میں ڈھائی ڈھائی سو روپے کی رقمیں پانچ بار عطا ہوئی تھیں۔ ان میں سے ۲۳ مارچ ۵۷ء کی رقم پہلے قصیدے کا اور سنہ ۵۸ء کی دونوں رقموں میں سے کوئی ایک، دوسرے کا صلہ ہو سکتی ہے، مگر فردوس مکاں نے اول الذکر کو بتقریب تبرید نوشی اور موخر الذکر کو امدادی عطیہ ظاہر کیا ہے۔

تیسرا اور چوتھا قصیدہ علی الترتیب نومبر اور دسمبر سنہ ۶۴ء میں بھیجے گئے تھے، مگر اس سال کے اندر کسی رقم کا عطا ہونا ثابت نہیں۔ اس صورت میں میرزا صاحب کا دعویٰ ہنوز محتاج ثبوت ہے۔

۱۔ مکاتیب: ص ۳۳۔

اصلاحِ غالب

فروری سنہ ۵۷ء سے اپریل سنہ ۶۵ء تک میرزا صاحب "مصدرِ خدمت" بھی تھے، اور "شریکِ دولت" بھی۔ اپریل سنہ ۶۵ء میں نواب فردوس مکاں کا انتقال ہوا، تو صرف شرکتِ دولت باقی رہ گئی، جس کا سلسلہ میرزا صاحب کے انتقال تک جاری رہا۔

یہ خدمت نواب فردوس مکاں کے کلام پر اصلاح تھی۔ میرزا صاحب کی دستگیری میں نواب فردوس مکاں سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں ہوا وہ اُن سے دوستانہ ملتے، اور شاگردانہ وظیفہ مرحمت فرماتے تھے۔ میرزا صاحب نے بھی ان تعلقات کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا، اور تا بمقدور تندہی سے سرکار کی خدمت بجا لاتے رہے۔

<u>مروت</u>

یہ سرکار عالمِ ضعیفی میں میرزا صاحب کی دستگیری کر رہی تھی، اس لیے اُن کا اصلاحِ سخن میں سعی و جانفشانی کرنا ہرگز تعجب انگیز نہیں۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اُنھوں نے دوسرے اہلِ سخن کے کلام پر اصلاح سے بھی کبھی دریغ نہ کی۔ اور یہ مشغلہ اُس وقت بھی ترک نہ ہو سکا: جب کہ اُنھیں کافور و کفن کی پڑی ہوئی تھی۔

۳۱ ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء کو سید احمد حسن قنوجی کو لکھا ہے:

تمھاری نثر کی طرز پسند، تمھاری خواہش مقبول، دیکھیں، سید احمد حسن صاحب کی خدمت گزاری منظور ہے۔

ضعف سے غالب، نکما کر دیا ۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۶۵ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلالِ قویٰ، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ

جو آپ مجھ کو دیکھ گئے ہیں، میں وہ اب وہ نہیں ہوں۔ نظم و نثر کا کام صرف ۵۰ برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہرِ فکر کی رخشندگی کہاں: بوڑھا جلاہا پیچ بتاتا ہے، نور نہیں دو اسکتا بہرحال، حکیم صاحب کو میرا سلام کہیے اور کہیے کہ آپ بے تکلف اپنا کلام بھیج دیا کریں۔ یہاں سے بعد حک و اصلاح خدمت میں پہنچ جایا کرے گا۔"[1]

حکیم احمد حسن مودودی کو ۲۴ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا ہے:[2]

"اب میں اپنی زبان سے یہ کیوں کر کہوں کہ اچھا ہوں۔ مگر بیمار اور عارضے میں گرفتار نہیں ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، بدحواس، ناتوان فلک زدہ آدمی ہوں۔ عہد کرتا ہوں کہ جب آپ کا خط آئے گا، اس کا جواب لکھوں گا۔ جب غزل آئے گی، اس کو دیکھ کر پھر بھیجوں گا۔"[3]

شنبہ ۲ جون سنہ ۶۶ء کو پھر انھیں کو لکھتے ہیں:

"آپ برادر میر ابراہیم علی خاں پر میری جان نثار ہے۔ مضی ما مضیٰ اب ایک ایک غزل آپ تینوں صاحب بھیج دیا کیجیے۔ اسی طرح میں فرداً فرداً بعد اصلاح بھیج دیا کروں گا۔ مگر میرے قبلہ و کعبہ واسطے خدا کے، شجرۂ منظومہ ارسال نہ فرمائیے گا۔ اس کی اصلاح میری حدِ وسع سے باہر ہے۔"

انھیں کو شنبہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو ایک خط لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:[4]

"میں علی کا غلام اور اولادِ علی کا خانہ زاد، لیکن بوڑھا، ناتوان اور مسلوب الحواس اور بے سروسامان۔ خدمت بجا لانے میں عذر کروں گا تو گنہگار۔ درنگ و توقف کا مضائقہ نہیں۔"

۱۔ اردوی: ۱۸۰، طبع لاہور (۲) ایضاً: ۱۸۲ (۳) ایضاً: ۲۴۳ (۴) ایضاً: ۱۸۱

پھر ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں[1]:

"حضرت، یہ آپ کے جدِّ امجد کا غلام تو مر گیا۔ کثرتِ احکام، تواترِ ورودِ اشعار، پھر یہ ہنجار کہ سو روپیہ کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو۔ غزلیں آپ کی برستی ہیں۔ کہاں تک دیکھوں۔ آپ کی غزلوں کے ساتھ اور غزلیں بھی گم ہو جاتی ہیں۔

بہتّر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی۔ غذا ایک قلم موقوف، آٹھ پہر میں ایک بار آبِ گوشت پی لیتا ہوں۔ نہ روٹی، نہ بوٹی۔ نہ پیا ہو نہ کھایا، آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق، رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔ جہاں جو کا غذ رہا، وہ وہیں رہا ۔۔۔۔ مدعا یہ کہ آپ اور دونوں سید صاحب اس کا التزام کریں کہ ایک غزل اپنے خط میں بھیجیں۔ جب وہ غزل اور اس خط کا جواب پہنچ جائے، تب دوسری غزل خط میں ملفوف ہو کر بھیجی جائے۔ اور خط ہر صاحب کا جدا ہو۔"

پھر ۱۷ جولائی سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا ہے:

"یہ جو آپ نے اپنی اور نواب صاحب کی غزلوں کی اصلاح کے واسطے لکھا ہے، مجھے اس حکم کی تعمیل بدل منظور ہے۔ جس مہینے تک میں زندہ ہوں، اس مہینے تک خدمت بجا لاؤں گا۔"

نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر وفا کو ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں[2]:

"بسبب ضعفِ پیری کے خدمت گزاری میں درنگ واقع ہو جائے تو معاف رہوں۔ قاصر کبھی نہ ہوں گا انشاء اللہ العظیم۔

دو غزلوں میں سے ایک غزل بعد اصلاح پہنچتی ہے دوسری غزل ہفتۂ آیندہ میں پہنچ جائے گی۔

ضعفِ اعضا اور دوامِ مرض سے علاوہ، اختلالِ حواس کا کیا

(۱) اردوی: ۱۰۵ (۲) ایضاً: ۱۵۷

حال لکھوں؟ دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں۔ دیکھیے اس سہو کو کہ کس کی غزلیں کس کو پہنچیں۔ مزا اس میں ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آزردہ کا نام کیا ہے اور وہ کون ہے اور کہاں کا ہے۔ شاید اس بندۂ خدا کو حضرت کی غزلیں بھیجی ہوں گی۔ خدا کرے، وہ بزرگ وار میر صاحب کی غزلیں میر صاحب کی طرح میرے پاس بھیج دے، تو میر صاحب کی خدمت میں بھیج دوں۔ اگر ایسا نہ ہوا، تو اُن غزلوں کو جواب آئی ہیں، دیکھوں گا۔"[1]

یہ اکہتر برس کی عمر کی خوبی ہے۔ آپ میر صاحب قبلہ کو خط پڑھوا دیجیے گا۔ میر صاحب ہی کو ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ کو لکھتے ہیں:

"قبلہ، آپ کے بھائی، میر عالم علی خاں صاحب مجھ پر کیوں خفا ہیں کہ اپنی غزل نہیں بھیجتے؟ یہ امر اُن کے خاطر نشان ہو جائے کہ غالب آپ کے دادا کا غلام اور خدمت بجا لانے کو آمادہ ہے۔"[2]

ذکا کو لکھتے ہیں:

"مجموعۂ کلامِ سابق اگر بھیج دو گے، میں بکمالِ طیبِ خاطر اُس کو دیکھ کر بھیج دوں گا۔ استجازت کیا ضرور۔"[3]

تواضع

وہ عام شاگردوں سے بھی تواضع و انکسار کے ساتھ پیش آتے تھے۔ شاکر کو لکھتے ہیں:

"آپ اپنی طرف سے اس کو استصلاح سمجھتے ہیں، اور میں اس کو اپنی جانب سے استفادہ جانتا ہوں۔"[4]

اِنھیں کو پھر لکھا ہے:

۱- اردوی: ۷۸ (۲) ایضاً ۱۸۸ (۳) ادبی خطوط: ۱۷۷ (۴) ایضاً: ۱۵۸

"آپ کا رابطۂ اصلاحِ کلام کے رجوع کرنا میری طرف موجب میری نازش کا ہے۔"[۱]

سہ بارہ تحریر فرماتے ہیں:

"اشعار بعد حک و اصلاح کے پہنچے ہیں۔ یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے کہ میں آپ کے کلام میں دخل و تصرف کروں۔"[۲]

سرور کو لکھا ہے:

"جناب شیخ صاحب کیوں مجھ کو محجوب کرتے ہیں۔ اس باب میں اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتا کہ افادہ مشترک ہے۔ قصیدہ و مثنوی بھیج دیجیے۔ لطف اُٹھاؤں گا، اور جو کچھ میرے خیال میں آئے گا، بے تکلف عرض کر دوں گا۔ میرا سلام کہیے، اور مثنوی اور قصیدہ اُن سے لے کر بھیج دیجیے۔"[۳]

نذر بلگرامی کی استدعای اصلاح کے جواب میں لکھا ہے:

"خواہش آپ کی کیا ممکن ہے کہ مقبول نہ ہو؟ جب مزاج میں آئے، آپ نظم و نثر بھیج دیں۔ میں دیکھ کر بھیج دیا کروں گا۔ اور آرائشِ گفتار یعنی حک و اصلاح میں کوشش دریغ نہ ہوگی۔"[۴]

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا، اور اب اس کے دونوں بچے، کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں، اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں بس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے، کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں،

۱- مجموعہ: ۱۵۵، (۲) ایضاً: ۱۵۶، اردو: ۲۱۴ (۳) اردوی: ۹۶ لاہور ایڈیشن۔
(۴) خطوط: ۱/۱۷۷

کہیں پانی ڈھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ میں نہیں تنگ آتا، تو ان معنوی بچوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا! آپ اُن کو جلد میرے پاس بیرنگ ڈاک بھیج دیجیے کہ میں اُن کو دیکھوں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر اُن کو تمھارے پاس بے بیرنگ ڈاک بھیج دوں گا۔"[۱]

ذکا کو تحریر کرتے ہیں:

اپنے آپ کو ایسا نہیں جانتا کہ تمھارے کلام کو اصلاح دوں قدر دانی کیوں کہوں، قدر افزائی کرتے ہو۔ دوستانہ و استادانہ جو خیال میں آئے گا، کہا جائے گا۔"[۲]

شاگرد کی غلطی پر تنبیہ میں لطف اور تہذیب کا بھی بہت لحاظ رکھتے تھے۔ نواب انور الدولہ بہادر شفق سے ایک غلطی ہوئی۔ اس کی طرف ان لفظوں سے متوجہ کیا ہے:

"ہاں، ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں۔ ای مطرب جادوفن بازم رہ ہوشم زن، دو میم آپڑے ہیں۔ ایک میم محض بیکار ہے۔ دیگر کی جگہ آپ بازم لکھ گئے ہیں۔ ای مطرب جادوفن، دیگرہ ہوشم زن۔"[۳]

نواب فردوس مکاں کے ایک شعر میں "جے دیتے" کی جگہ "جی دیتے" بنا کر لکھتے ہیں:

"میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے۔ ایک بار عرض کر کے پھر نہ کہوں گا۔"[۴]

شاکر کے اس مطلع کے متعلق فرماتے ہیں:

"کوئی آتا نہیں آگے ترے ہٹتا ہو کر   آئینہ جب نظر آتا ہے تو اندھا ہو کر

یہ مطلع دل نشیں ہے، مگر اتنا تامل ہے کہ آئینے کو اندھا کہنا چاہیے یا نہیں۔"[۵]

ذکا کو لکھا ہے:

(۱) خطوط: ۱/ ۸۷ (۲) ادبی خطوط: ۱۴۰ (۳) اردوئے [illegible]: ۳۱۳، عود: ۴۵ (۴) مسودۂ غزلیات ناظم: [illegible] (۵) [illegible]: ۱۵۵

"مقطع میری پسند نہیں۔ میرے سر کی قسم، اس کو دور کرو، اور مقطع لکھ لو۔"[۱]

شرائط اصلاح

مگر میرزا صاحب یہ ضرور چاہتے تھے کہ اُن سے اصلاح لینے والا
(۱) نظم و نثر کو چھدرا چھدرا لکھے،
(۲) سطروں اور مصرعوں کے درمیان فاصلہ زیادہ چھوڑے،
(۳) اتنے باریک کاغذ پر نہ لکھے کہ دوسری طرف سیاہی کے دھبے نظر آئیں،
(۴) تحریر کو پُرپیچ نہ بنائے، اور
(۵) کتابت صاف اور روشن ہو، پھیکی سیاہی سے ہرگز نہ لکھے۔

ان شرائط کو موقع بہ موقع شاگردوں کو بتایا ہے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"دوسرا پارسل، جس کو تم نے بتکلف خط بنا کر بھیجا ہے، پہنچا نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریر سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا؟ اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ دو ورقہ زیادہ ہو جاتا، تو ہو جاتا۔"[۲]

قدر بلگرامی کو تحریر کیا ہے:

"حضرت، میں نے چاہا کہ حکم بجا لاؤں اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر کیا کروں؟ آپ غور کریں کہ اصلاح کی جگہ کہاں ہے؟ اگر بالفرض آپ خود نظرثانی میں کوئی لفظ بدلا چاہیں، تو ہرگز جگہ نہ پائیں۔
جس کاغذ پر اصلاح منظور ہوتی ہے، تو بین السطور زیادہ چھوڑتے ہیں۔"[۳]

۱۔ ادبی خطوط: ۱۲۸ (۲) خطوط غالب: ۱۱۰۲ (۳) ایضاً: ۱۱۴۵

انھیں کو دوسرے موقع پر ہدایت کی ہے:

"حضرت، آپ کے خط کا کاغذ باریک اور ایک طرف سے سراسر سیاہ۔ دوسری طرف اگر کچھ لکھا جائے، تو میری تحریر ایک طرف، تم خود اپنی عبارت کو درست نہ پڑھ سکو گے۔"[1]

جنون بریلوی کے خط میں تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

"دو عنایت نامے آپ کے اوقاتِ مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیے اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حروف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری اچھی ہے اور عینک کا محتاج نہیں، لیکن با ایں ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں.....

واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجیے، اس میں بین السطور اور بین المصرعین فاصلہ زیادہ چھوڑ دیجیے۔ اب کے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے، حروف اس کے روشن ہیں، مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم ہے۔"[2]

تفتہ نے ایک کنجان اور پیچ و تاب سے بھری ہوئی اصلاحی تحریر بھیجی تھی۔ میرزا صاحب نے اسے "اوراقِ طلسمی" کا خطاب دیا اور انھیں لکھا:

"سوالات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کا جواب لکھوا دیا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں۔ خدا کرے، مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو۔ اور تم بھی جب ان اوراقِ طلسمی کو دیکھو، تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔"[3]

میرزا صاحب ان اوراقِ طلسمی سے بہت گھبرائے تھے۔ تفتہ کے محولہ بالا خط میں صاف لکھ دیا ہے کہ "اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا۔ میں

---

(۱) خطوط: ۱، ۱۸۷ (۲) ایضاً: ۱، ۱۱۳ (۳) ایضاً: ۲، ۲۰۱

بہت گھبراتا ہوں"۔ بعض شاگردوں کو ایسی تحریریں واپس بھی کر دی ہیں چنانچہ قدر بلگرامی کے محولہ بالا خط میں فرماتے ہیں:

"جب اس عبارت کو اور کاغذ پر نقل کر دوں، تب ہنگ و اصلاح کا طور سمجھے۔ میرا کام اصلاح عبارت ہے، نہ کتابت"[1]

جنون بریلوی کے محولہ بالا خط کے آخر میں لکھا ہے:

"اس (خط) کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں، تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ اور معہذا میرا اندیشہ آپ کو بدیہی ہو جائے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ اس میں اصلاح کہاں دی جائے"

لیکن بعض اوقات از راہ مروت خود زحمت نقل برداشت کر لیتے تھے جنون بریلوی کی دو تحریروں میں سے ایک کو واپس کر کے دوسری کو خود نقل کیا ہے، اور جواب میں اُنھیں لکھتے ہیں:

"آپ کی خاطر سے رنج کتابت اٹھاتا ہوں، اور ان دونوں غزلوں کو اسی ورق پر بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں۔ مسودہ تو آپ کے پاس ہوگا۔ اس سے مقابلہ کر کر معلوم کر لیجیے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کیا اصلاح ہوئی، اور کونسی بیت موقوف ہوئی"

قدر بلگرامی کی باریک کاغذ والی تحریر کے متعلق لکھا ہے کہ "ناچار جداگانہ ورق پر سوالات کا جواب لکھتا ہوں"

نواب فردوس مکاں خود بہت احتیاط کرتے تھے۔ اُن کی جس قدر غزلیں یہاں سے ملی ہیں، نہایت صاف، روشن اور خوشخط قلم کی لکھی ہوتیں، اور اُن کی اصلاح میں میرزا صاحب کو کوئی دقت پیدا نہیں ہوتی، اسی لیے مکاتیب رام پور میں اس قسم کی کوئی شکایت نظر نہیں آتی

[1] خطوط: ۱/ ۱۰۸

طریق اصلاح

بعض خطوط میں میرزا صاحب نے اپنے طریقِ اصلاح کی بھی صراحت کی ہے۔ جناب رام پوری کو تحریر فرماتے ہیں:

"قبلہ، جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے، اور جس کو کاٹ دیا ہے، وہ معیوب ہے، اور جس پر صاد نہیں، وہ بے عیب اور ہموار؛ اور جس کے معنے میں مجھے تامل ہے، اس پہ نظر، علامت اس کی ہے۔ باقی جا بجا منشاءِ اصلاح اور حقیقتِ الفاظ لکھ دی ہے۔"[1]

شاکر کو مختصراً لکھتے ہیں:

"میرا طریق اس فن خاص میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے، اُس کو بدستور رہنے دیتا ہوں، اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں، اُس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں، تاکہ آیندہ صاحب کلام اُس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔"[2]

جنون بریلوی کو تحریر کیا ہے:

"فقیر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کلام میں اغلاط و اسقام دیکھتا ہوں، تو رفع کر دیتا ہوں اگر سقم سے خالی پاتا ہوں، تو تصرف نہیں کرتا۔"[3]

قدر بلگرامی کو اطلاع دیتے ہیں:

"صاحب، تم نے مثنوی خوب لکھی ہے۔ کہیں املا میں، کہیں انشا میں، جو اغلاط تھے، وہ دیکھے اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے نحو میں لکھ دی۔"[4]

ان اصولوں کی ترتیب حسب ذیل ہے:

(۱) معیوب شعر کو قلمزد کر دینا،

(۲) جس شعر کے معنی میں تامل ہو، اُس کو نظری قرار دینا،

۱۔ مکاتیب: ۸۸ (۲) عود: ۱۵۵ (۳) اردوی: ۱۵۹ (۴) خطوط: ۱: ۱۰۹

(۳) بے عیب اور ہموار شعر کو بدستور رہنے دینا،
(۴) اچھے شعر پر صاد کر دینا، اور
(۵) قابلِ تغیر لفظ کو بدل کر منشاءِ اصلاح اور حقیقتِ الفاظ بتا دینا۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرزا صاحب کا اندازِ اصلاح کتنا دل پسند اور شاگرد کے حق میں کس درجہ مفید تھا۔ وہ شعر میں ایسا دخل و تصرف بہت کم کرتے تھے، جس سے شاعر کے بنیادی خیال میں تغیر ہو جاتے۔ اسی لیے ایسے شعروں کو یا تو یکسر قلمزد کر دیتے تھے، یا نظری قرار دے کر چھوڑ دیتے تھے، تاکہ شاعر خود اس میں مناسب ترمیم کر لے![۱] اسی طرح کسی شعر یا غزل میں اصلاح کی حاجت نہ ہوتی، تو اُسے جوں کا توں واپس کر دیتے تھے۔ قدر بلگرامی کی ایک نظم کے متعلق لکھا ہے:

"حضرت کشفی کے دیوان کے انطباع کی تاریخ اچھی ہے، کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔"[۲]

جنون بریلوی کی غزلوں کو واپس کر کے تحریر کیا ہے:

"قسم کھا کر کہتا ہوں، ان غزلوں میں کہیں اصلاح کی جگہ نہیں۔"[۳]

ذکا کو لکھتے ہیں:

"یہ شعر ہموار ہے، نہ صاد کے قابل، نہ اصلاح کا محتاج ۴ اور ۵ یہ دو شعر، واہ کیا کہنا ہے۔"[۴]

اچھے شعروں پر صاد بنانے سے شاگرد کی خاصی ہمت افزائی ہو جاتی ہے میرزا صاحب نے بعض اشعار پر ایک، بعض پر دو اور بعض پر تین صاد بھی کیے ہیں، تاکہ شعروں کے حسن اور استاد کی پسندیدگی کے مختلف درجے

۱۔ بیتاب اور شاکر کے متعدد شعر قلمزد اور نظری قرار دیے ہیں۔
۲۔ خطوط ۱: ۱۶۹ (۳) اردوی: ۱۵۹۱ (۴) ادبی خطوط ۔۱۰۴

بخوبی ظاہر ہو سکیں۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے، اچھے شعر یا غزل کی جی کھول کر داد بھی دیتے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"ہائے کیا غزل لکھی ہے! قبلہ آپ فارسی کیوں نہیں کہا کرتے! کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرزِ بیان! کیا میں سخن ناشناس اور ناانصاف ہوں، کہ ایسے کلام کی حک و اصلاح پر جرأت کروں؟"[۱]

سیاح کو تحریر کیا ہے:

"فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں اور فنِ شعر میں اگر اس شیوے کی رعایت کی جاوے، تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد رہے، کبھی کوئی غزل تمہاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح نہ ہوتی ہو خصوصاً روزمرہ اردو میں۔ دونوں غزلیں لفظاً اور معناً بے عیب ہیں۔ کہیں اصلاح کی حاجت نہیں، آفریں، ہزار آفریں!"[۲]

نواب فردوس مکاں اور تفتہ کے مسودوں میں بھی اس قسم کے جملے ملتے ہیں۔

منشاءِ اصلاح کے سلسلے میں میرزا صاحب اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ صرف انھیں اصلاحوں کے منشا کو ظاہر کیا جائے، جنھیں شاگرد از خود نہ سمجھ سکے، ورنہ الفاظ یا فقروں کے بدل دینے پر اکتفا کی جائے۔ اسی لیے وہ اس کے متوقع رہتے تھے کہ شاگرد اُن کی اصلاحوں کو غور سے دیکھے گا۔ تفتہ کو لکھا ہے:

"بھائی، ہمارے اوراقِ اصلاحی غور سے دیکھا کرو۔ ہماری محنت تو ضائع نہ جائے۔"[۳]

اس کا انھوں نے التزام کیا ہے کہ منشاءِ اصلاح کو حاشیوں پر درج کریں۔ مگر بدلے ہوئے لفظ اکثر بین السطور میں اور کبھی کبھی حاشیے پر بھی لکھے ہیں

---

(۱) اردوی: ۳۱۳، عود: ۵۴ (۲) اردوی: ۲۸: ۲ (۳) خطوط: ۱۰۶

اصلاح کے باب میں تکرار سے بھی ناخوش نہ ہوتے تھے، اِلّا یہ کہ شاگرد کی طرف سے ہٹ دھرمی کا اظہار ہو۔ تفتہ کو لکھا ہے۔

"یاد رہے، یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا ہوں۔ میری بات کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا، بلکہ خوش ہوتا ہوں، مگر ہاں، ایسی تکرار، جیسی بیش اور بیشتر کے باب میں کی تھی، ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر جو میں آپ لکھوں گا، تم کو اُس کے لکھنے کو کیوں منع کروں گا"۔[۱]

شاگردوں کو اساتذہ کی اُن زمینوں میں طبع آزمائی کرنے سے باز رکھتے تھے جو حسنِ کلام کی انتہا کو پہنچ چکی ہیں چنانچہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کو حکیم احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"غزل کا کاغذ واپس بھیجتا ہوں۔ نہ اُس کو پھاڑ سکوں، نہ پانی میں دھو سکوں، شہیدی کی غزل ان قافیوں میں بہ تغیر ردیف ایسی ہے کہ اب ان قافیوں کا باندھنا ہرگز نہ چاہیے۔ آپ اور غزل لکھیے اس کو ہرگز دیوان میں نہ رکھیے"۔[۲]

اس کو بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ بالالتزام اصلاح لینے والا شاگرد اصلاح سے پہلے کلام کو منظرِ عام پر لائے۔ ذکا کو نصیحت کی ہے:

"اگر آپ نے اس روش کا یعنی استصلاح کا التزام کیا ہے، تو جب تک کاغذ اشعار میرے پاس سے نہ جایا کرے، ما کتب فیہ شہرت نہ پایا کرے"۔[۳]

میرزا صاحب کی اصلاحوں کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک دو لفظ یا فقرے سے زیادہ تغیر و تبدل بہت کم کرتے اور شاگرد کو خود

۱۔ خطوط، ۱: ۲۲۲ (۲) اردو: ۱۸۴، طبع لاہور (۳) ادبی خطوط، ۱۲۲۔

اپنی طبیعت پر زور دینے کی صلاح دیتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:(۱)

"پر جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا
اُس میں ضرور نشستِ معانی بھی ملحوظ رکھا کرو، اور جو کچھ کہو، اُس کو
دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔"(۱)

اسی کا نتیجہ ہے اُن کے شاگردوں کے کلام میں اُستاد کے رنگ کی جھلک کم اور اپنی اُفتادِ طبع اور ذوقِ شعری کا اثر زیادہ ہے۔ تیز، شیفتہ، مجروح، بیتاب اور ناظم کے کلام کا مقابلہ کرنے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

ناظم کے کلام پر اصلاح

خوش قسمتی سے نواب ناظم کی غزلوں کے چند اصلاحی مسودے دستیاب ہو گئے ہیں، بظاہر یہ مسودے ترتیبِ دیوان کے وقت نظرِ ثانی کے ہیں، اور اس بنا پر ان میں کہیں کہیں معمولی تغیر و تبدل نظر آتا ہے، تاہم اُن سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرزا صاحب نے ناظم کی غزلوں کی اصلاح میں کتنی توجہ صرف کی تھی۔ وہ اصلاحیں یہ ہیں:

وہ صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں — (یا حق نہیں) نا قابل سمجھیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط
اُس رُخ کا جلوہ تجھ کو مقرر ہے اے دلِ فگار — [illegible]
بیٹھے بیٹھے اڑا کبوتر خط — یوں پہنچتا ہے اُڑ اُڑ کے پرِ خط

اگر "بن دیے" رکھنا منظور نہیں، تو "بے دیے" نہ "بن دیے" دیجیے۔ لیکن میرے نزدیک "بن دیے" فصیح ہے، چنانچہ میرا شعر ہے:

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل — اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس سے قطع نظر، یہ جو مثل مشہور، زبان زدِ جمہور ہے کہ "بن آئے کوئی نہیں مرتا" اس کو کوئی کیا کرے گا۔ غرض کہ میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے۔ ایک بار عرض

(۱) اردو: ۳۴، ۶۲، فاروقی دہلی، ۱۳۲۶ھ

کر کے پھر نہ کہوں گا۔ غالب

آتے رہتے ہیں اُس کے اکثر خط
پڑھ تو لیں گے وہ نامہ میرا بھی

یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک
دوست کہتے ہیں اُسے جو ہو مصیبت کا شریک

جہاں "ہر ایک" اچھی طرح نہ آئے، وہاں "ہر یک" لکھیے "ہر ایک" کیوں لکھیے؟ غالب

مبدءِ فیاض سے دونوں ہیں، ناظم، بہرہ یاب
میں بھی ہوں اُستاد کے حسنِ طبیعت کا شریک

بلکہ شریک۔ غالب

پیری میں بھی ہے ولولۂ شوق نہیں ہم
رکھتے ہیں ابھی ایک دلِ ہنگامہ گزیں ہم

یہاں "ایک" کی جگہ "اک" ہے یای تحتانی درست ہے۔ مگر "ہر" کے ساتھ "ہریک" ہو، نہ "ہراک"۔ غالب

سیاحِ جہاں گرد ہیں، آ نکلے ہیں یہاں بھی
کچھ تیرے پجاری تو نہیں اے بتِ چیں ہم

"یہاں" بروزنِ "ہاں" فصیح نہیں۔ یہ ضرورت نہ چاہیے "یہاں" بہ یای مختلط التلفظ افصح ہے۔ غالب

جو اپنے ہی سے اپنا پردہ کریں
تو بندِ قبا کس طرح وا کریں

وفا شعاری ناظم یقیں نہیں، نہ سہی
یہ کون شخص ہے، اس کا بھی کچھ خیال نہیں

سبحان اللہ! کیا امیرانہ مضمون ہے۔ غالب

قاصدوں کے کہیں انعام نہیں بنجائے نہ ملک
جلد جلد اب مرے ناموں کے جواب آتے ہیں

یہ مضمون سوائے آپ کے کون باندھ سکتا ہے؟ غالب

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی، ناظم! وہاں میں جاتا ہوں تو کہتا ہے نواب آتے ہیں

ہائے، کیا نیا مضمون ہے! غالب (۱)

رونے کی یہ شدت ہے کہ گھبرا گئیں آنکھیں
اشکوں کی یہ کثرت ہے کہ تنگ آ گئیں آنکھیں

ہے یہی گریۂ خونیں، تو کسی دن، ناظم
یوں ہی رہ جائیں گی آپس میں جھپک کر پلکیں

"جھپکنا" اور ہے، یہاں "چپکنا" منظور ہے۔ غالب

وہ سجرا چاہتے ہیں دوزخ بھی یہاں یہ خواہش کہ ہم کو جنت ہو

ہوئے ہو ایک بتِ دلفریب پر عاشق ق زبس کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو
صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے اور مجھے فنونِ عشق کا آموزگار سمجھے ہو
شریکِ دولتِ ناز و نیاز رکھتے ہو انیسِ خلوتِ شب ہای تار سمجھے ہو
اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے ہم بھی تم پر کہ مجھ سے غمزدہ کو غمگسار سمجھے ہو

ہائے، کیا قطعہ ہے! غالب

نالے سے کے مجھے طور بہت یاد ہیں، لیکن طاقت کا گماں بھی ہے تجھے دلِ غمزدہ پر کچھ

تم آ تو جاؤ صومعے میں ایک دن کہ ہم اپنے کو رہینِ قدمِ دیندار کھینچتے

لگاوٹ غیر سے دیکھے اُس کی جل کر خاک ہو جاتے
سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس کا ہے

ہو رات تو جلتے رہیں امیدِ سحر پر یہ روزِ سیہ ہے، شبِ دیجور نہیں ہے

خستہ پیکانِ غم ہر ایک جوان و پیر ہے
اور سجر دیکھو، تو ترکش ہی میں پنہاں تیر ہے

ملا کر منہ سے منہ بوسہ ذقن کا دیکھے کہتے ہیں
پیاسے پاس کیا آنا کنوئیں کا امر مشکل ہے!

(۱) بظاہر یہ کتابت کی غلطی تھی۔ عرشی

اگر "پیاسے" کے لفظ میں یائے تحتانی کا اعلان نہ منظور ہو، تو آغازِ مصرع
میں کاف لکھ دیجیے۔ غالب[1]

دیکھے دل، مل گئی دلبر کی طبیعت تجھ سے سیکھنے آتا ہے آئینِ محبت مجھ سے

سبحان اللہ! اس غزل میں معشوق کے عاشق ہونے کا بیان کیا خوب ہے!
اگرچہ معشوق کے معشوق کو مخاطب نہیں کیا، مگر معشوق کو کس کس لطف
سے سمجھایا ہے! غالب

تنگ ہوں جینے سے اب مرنا کہاں! سچ ہے، نبض چھوٹنے سے (ضیق ہو جانے سے چھٹی) چھٹتا مات ہی
مانا ہے مجھ کو قیسِ بیاباں نورد نے گر پوچھتی (پوجتی[2]) ہے لیلیٰ محمل نشیں مجھے

یہاں "پوجنا" بمعنی پرستش ہے، "پوچھنا" بمعنی پرسش نہیں۔ غالب

لکھے دو بحروں میں، ناظمؔ یہ غزل نازشِ حسنِ طبیعت ہے مجھے

دو بحریں ایک تو یہ "فعلاتن فعلاتن فعلن"، دوسری یہ "فاعلاتن
فاعلاتن فاعلن" کیا اچھی صنعت ذوبحرین کی، اور پھر باوجودِ رعایتِ
صنعت، اشعار کیا خوب! غالب

اصلاحِ املا

میرزا صاحب کی اصلاح کا دائرہ انشا اور املا دونوں کی غلطیوں کو
محیط تھا۔ قدر بلگرامی کے خط میں صاف صاف لکھدیا ہے کہ:
"تم نے مثنوی خوب لکھی ہے! کہیں املا میں، کہیں انشا میں جو اغلاط
تھے، وہ دیکھے، اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی"[3]
مگر املا کے معاملہ میں انھوں نے کچھ مخصوص نظریے قرار دے لیے تھے
بنا بریں اس قسم کی اصلاحوں سے "املائے غالب" میں بحث کی جائے گی۔

---

(۱) یعنی مصرع (۲) طرح لکھا جاتا ہے: "کہ پیاسے پاس گیا آتا کنویں کا امر مشکل ہے" عرشی
(۲) یہ بھی کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ (۳) خطوط ۱ : ۱۸۸ ۔

انشای غالب

میرزا صاحب کے عہد تک ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ فارسی زبان میں اظہارِ خیالات پسند کرتا، اور دیسی زبان کا پایہ اپنے مرتبے سے فروتر جانتا تھا۔ عرصہ دراز تک میرزا صاحب بھی اسی روشِ عام کے دلدادہ رہے۔ رفتہ رفتہ فارسی خط و کتابت کی جگہ اردو نے حاصل کرنی شروع کر دی، جو آخرِ عمر تک پہنچ کر اُن کے اظہارِ خیالات کا واحد ذریعہ ہو گئی۔

اُردو انشا کا آغاز

اُردو مراسلت کی ابتدا کے متعلق خود میرزا صاحب کا کوئی تصریحی بیان موجود نہیں ہے[1]۔ البتہ خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں:

---

[1] پروفیسر رسا ہمدانی نے ۱۹۳۹ء میں ایک مجموعہ "خطوط بنام" اور "خطوط غالب" شائع کیا ہے۔ اس کا پہلا خط ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے: "شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے، جو میں بمطبعِ اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے۔" خط پر یکم جنوری ۱۸۵۱ء تاریخ مندرج ہے۔ اس سے رسا صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تاریخِ مذکور سے میرزا صاحب نے فارسی ترک کر کے اردو میں خط کتابت شروع کی۔ جہاں تک رسا صاحب کے دادا کرامت ہمدانی کے نام کے خطوط کا تعلق ہے، مالک رام صاحب نے رسالہ جامعہ (مارچ ۱۹۴۲ء) میں اور قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ معاصر پٹنہ (جنوری ۱۹۴۳ء) میں اندرونی شہادتوں کی بنا پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ خط جعلی ہیں جن کے تار و پود خود غالب کے دوسرے خطوں اور یادگارِ غالب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ قاضی صاحب کے جواب میں ایک مضمون رسا ہمدانی صاحب نے رسالہ ندیم (اپریل ۱۹۴۴ء) میں شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ میرزا صاحب کے چار خطوں کے عکس بھی شامل ہیں۔ پہلا خط قاضی عبدالجمیل صاحب جنون بریلوی کے نام، دوسرا نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کے نام، اور تیسرا اور چوتھا جناب کرامت ہمدانی کے نام ہیں۔ رسا صاحب کہتے ہیں کہ "ان سب خطوں کی عبارت کی شان، حروف کے لکھنے کا انداز اور کتابت کی ترکیب وہی ہے، جو غالب مرحوم کے اُس خط کی ہے، جو دیوانِ غالب مطبوعہ نظامی پریس میں شائع ہو چکا ہے۔ اگر جعلی ہیں تو سب جعلی ہیں، اور اگر اصلی ہیں، تو سب اصلی ہیں۔ بہجا اعتراض کرنے والے جو اعتراض چاہیں کریں۔ مگر خدا کے لیے نئی تحقیقات کی دھن میں عقل و بینائی سے کام لینے سے معذور نہ ہو جایا کریں۔"

میں نے غالب کے قلم کے لکھے ہوئے سو سے زائد خط اور تقریباً اتنی ہی اصلاحیں دیکھی ہیں

"معلوم ہوتا ہے کہ میرزا سنہ ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے۔ مگر سنۂ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہرِ نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُس وقت بضرورت اُن کو اردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہو گی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہرِ نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی اور وہ بھی اپنے طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوتی ہو گی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً سنہ ۵۰ء کے بعد سے اردو میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔"[11]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷) اُن سب کے پیشِ نظر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علاوہ جنون بریلوی والے خط کے بقیہ تینوں خطوں کا غالب کے قلم سے کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ غالب کی اصلی تحریریں سامنے رکھ کر نقل کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے کہیں کہیں معمولی سی مشابہت کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ صورتِ حروف کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان خطوں میں جگہ جگہ جملوں کے اختتام پر ڈیش استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ یہ غالب کی عادت بالکل نہیں تھی۔ یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کے نام کا خط بلی ماروں کے محلے سے ۲۰ جون ۱۸۵۱ء کو لکھا گیا ہے۔ اس میں میرزا صاحب نے لکھا ہے کہ اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو شکایت نہ کرنا کہ میں حوادثِ زمانہ اور عوارضِ جسمی سے نیم جان ہوں۔ اولاً تو یہی درست نہیں کہ میرزا صاحب اس تاریخ سے قبل بلی ماروں میں آچکے تھے۔ کیونکہ میرزا صاحب کا شاہ نصیر الدین عرف کالے صاحب کے مکان سے منتقل ہو کر بلی ماروں کے محلے میں آنا ۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے بعد کا اور ۲ مارچ ۱۸۶۰ء سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ثانیاً خود شوخی نے اپنی شاگردی کا مفصل واقعہ مولانا ابوالکلام آزاد کے روبرو بیان کیا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرزا صاحب کے قیامِ رامپور کے موقع پر شاگرد ہوئے ہیں۔ میرزا صاحب صرف دو بار رام پور آئے۔ پہلا سفر جولائی ۱۸۶۰ء اور دوسرا اکتوبر ۱۸۶۵ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ سنہ ۶۰ء کو سالِ شاگردی کہا جا سکتا ہے۔ ان وجوہ سے میں ان خطوں کو شہادت میں پیش کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔

۱۱ یادگارِ غالب ص ۱۷۴۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرزا صاحب اس سے پہلے بھی اُردو زبان میں خط لکھتے رہے تھے چنانچہ اُن کا مکتوب بنام جواہر سنگھ جوہر جس میں تنکی ارسال کرنے کا تقاضہ ہے، یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کے کچھ بعد کا اور دوسرا خط بنام میرزا تفتہ، جس میں اُن کے دیوان کی تقریظ کی ترمیم کا ذکر ہے، ۴ اگست ۱۸۴۹ء سے پہلے کا نوشتہ ہے (۱)

اردو پر انحصار

"پنج آہنگ" کے خاتمہ میں فارسی مراسلت بالکل ترک کرکے صرف اُردو میں خط کتابت کرنے کی تاریخ خود میرزا صاحب نے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یزداں داند" و مدعیانِ دانش را توفیقِ دانستن دہد تا دانند کہ خامۂ غالب سیہ نامہ مسلک دشوار گزار پارسی آہنگ نیازی را یکدام دلاویز رفتار پیمودہ است۔ درین شصت و ہشت سالہ زندگی کہ نیزہ در بازی و گل در سخن طرازی گزشت و بسا گزین روشہا

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، غالب: ۴۰۲، طبع ثانی و رسالۂ مصنف علی گڑھ: ج (۲) نمبر ۸، ص ۳۳ - ۴۷۔ تفتہ کے نام کے خط کو میں نے ۴ اگست سے پہلے کا اس لیے قرار دیا ہے کہ میرزا صاحب کی تقریظ، پنج آہنگ کی اشاعت میں بالفاظِ موجودہ چھپی ہے۔ ادر پنج آہنگ کے اس نسخے کے خاتمہ میں کاتب نے لکھا ہے کہ "بتاریخ سیزدہم رمضان ۱۲۶۵ھ مطابق چہارم اگست ۱۸۴۹ء در مطبع شاہی (سلطانی دہلی) بقلم شکستہ رقم احقر العباد شیخ احمد صورت اتمام یافت" (نسخۂ مملوکہ ہارڈنگ لائبریری دہلی) لہذا تقریظ کے اندر ترمیم اور اس کی اطلاع یہ دونوں امر ۴ اگست سے قبل ہی انجام پا چکے ہوں گے۔ اندازے کے لیے یہ عرض کرنا مفید ہوگا کہ یہ نسخہ چھوٹے ناپ کے ۴۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں سے ۴۹۱ تا ۴۹۸ تقریظ نے گھیر لیے ہیں۔ اس صورت میں بعید نہیں کہ کاتب نے آغاز جولائی میں اس حصہ کی کتابت کی ہو، اور ترمیم والا خط جون میں لکھا گیا ہو۔ یہاں یہ اشارہ بھی مناسب ہوگا کہ مذکورہ بالا نسخے میں تقریظِ دیوانِ تفتہ کے بعد سرسید احمد خاں مرحوم کی آثار الصنادید کی تقریظ چھپی ہے۔ اس کو بعد میں درج کرنے سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بعد میں لکھی بھی گئی تھی۔ آثار الصنادید ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں پہلی بار چھپی تھی۔ ظاہر ہے کہ میرزا صاحب نے چھپنے سے پہلے ہی تقریظ لکھ دی ہوگی۔ اگر یہ درست ہے، تو پھر دیوانِ تفتہ کی تاریخ تصنیف بھی کم از کم ۱۲۶۲ھ کے کسی مہینے میں واقع ہونا چاہیے۔

درنثر نظر فروز آمدہ، از دو سال در بند آن بودم کہ ..... دیگر
در خامہ فرسائی انداز خود نمائی فرو ہلم..... پنجاہ سال تنی بی
برگ را ہنجار اورا سرایانِ پارس بہ نوا داشتہ ام
اکنون آن روش فرو گزاشتہ ام سپس مانی الضمیر را کہ با
یارانِ نزدیک، در در عرضہ بایدداد، در زبانِ اردوی و آن ہم
سرسری و از تکلف بری رقم خواہم کرد، تا زندگی
آسان گردد۔[1]

یہ خاتمہ سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں لکھا گیا تھا، جب کہ میرزا صاحب کی عمر ۶۸ سال کی تھی۔ اُنھوں نے اس ۶۸ سالہ زندگی میں سے ۱۶ سال کھیل کود میں گزار کر ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) سے ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا، اور تقریباً ۵۰ سال فارسی نظم و نثر لکھتے رہے تھے، لیکن ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) سے دو سال قبل سنہ ۷۸ھ (۶۱ء) میں یہ عزم کیا تھا کہ اب فارسی آمیختہ و ناآمیختہ بتازی کو ترک کر کے سادہ اُردو میں اظہارِ مطالب کریں گے، کیونکہ فارسی کے لیے جس فراغِ خاطر و قوتِ دماغ کی ضرورت تھی، غلبۂ پیری کے سبب سے میرزا صاحب اُس سے محروم ہو چکے تھے۔ اردوی معلی اور عودِ ہندی کے مختلف خطوط سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ میرزا صاحب نے سنہ ۷۸ھ (۶۱ء) سے قبل ہی فارسی نگاری سے احتراز شروع کر دیا تھا۔ پنجشنبہ ۸ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ء (صفر سنہ ۱۲۷۶ھ) کو جنون بریلوی کو لکھتے ہیں:

"فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر۔ ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پہ کھڑا ہے۔"

---

(۱) کلیاتِ نثر فارسی: ۲۵۴

پابرکاب ہوں"[1]

رفعت بھوپالی کو ۴ ربیع الاول سالِ "رستاخیز" (۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کو تحریر کرتے ہیں:

"از دیر باز بہ نظم و نثر نمی گرایم۔ نظم، خواہی پارسی و خواہی اُردو، خوابی ست فراموش۔ نامہ در پارسی نوشتن نیز آئین نماندہ۔ ہرچہ نوشتہ می شود یک دست در اردو ست۔ اینک ... مولانا عباس ... از بھوپال فرمان فرستاد کہ غالب ... نامہ در پارسی زبان نویسد۔ یارب، فرمان چون بجا آورم، و در نامہ چہ نویسم! باری نہ از توانائی بنان بلکہ از اثر روائی آن فرمان جنبشِ خامہ لفظی چند کہ بخواندن نیرزد، بر روی ورق ریخت"[2]

ان دونوں خطوں میں میرزا صاحب نے ترک فارسی کا سبب غلبۂ رنج و غم اور ضعف پیری کو قرار دیا ہے۔ یہی سبب شاکر کے نام کے مکتوب میں بھی ذکر کر چکے ہیں۔

خلاصۂ بحث

الغرض میرزا صاحب ایک ایسے دشوار گزار مسلکِ فارسی نگاری کے موجد تھے، جو اطمینانِ خاطر و توانائی دماغ و قلب کا مقتضی تھا۔ ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) تک یہ دونوں اسباب میسّر رہے، اس لئے میرزا صاحب زیادہ تر اسی زبان میں خامہ فرسائی کرتے رہے۔ سنہ مذکورہ میں بادشاہِ ظفر نے تاریخ نگاری کی خدمت سپرد کی اور فراغِ خاطر بر طرف ہو گئی، تو میرزا صاحب نے اُردو نثر کو زیادہ نوازنا شروع کیا ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں ذوق کا انتقال ہوا، تو اصلاحِ کلام بھی میرزا صاحب کے سپرد کی گئی، اور یہ فرصت سے محروم ہو گئے۔ جب

۱۔ عودِ ہندی: ۱۸۵، و خطوط: ۱/ ۱۱۷ (۲) انشای نورچشم: ۱۵، و کلیاتِ نثر فارسی: ۲۲۵ لیکن عبارت میں قدرے تغیر و تبدل ہے۔

کے سبب سے مسلکِ فارسی کی گامزنی کے بیچ اور کم وقت میسر آنے
لگا اور اردو کو مزید غلبہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہجوم مصائب
و آلام نے اطمینانِ خاطر کا قطعی خاتمہ کر دیا۔ نیز انوکار کی زیادتی اور معاشی
پریشانی کے سبب رفتہ رفتہ امراض مستولی ہوتے چلے گئے۔ اب اردو
نہایت سرعت کے ساتھ اُن کی انشا پر چھانے لگی، تا آنکہ سنہ ۱۲۷۸ھ
(۱۸۶۱ء) میں میرزا صاحب کو عزم کرنا پڑا کہ آیندہ فارسی نظم و نثر کچھ نہ
لکھیں گے۔ لیکن اس عہد کی عملی تکمیل سنہ ۱۸۶۵ء سے پہلے نہ ہو سکی
جس کے بعد کی فارسی تحریریں کالمعدوم ہیں۔

اردو کی فرمائش

میرزا صاحب اپنے عہد کے ممتاز فارسی ادیب تھے، اور اکثر اربابِ
علم و فضل کی طرح اسی کو سرمایۂ نازش و افتخار خیال کرتے تھے۔ جب بعض
معاصرین نے اپنی اردو شاعری کے بل بوتے پر اُن کی ہمسری کا دعویٰ
کیا، تو انھیں میدانِ سخن کے ان یکہ تازوں سے کہہ دینا پڑا:

فارسی بیں تا ببینی نقش ہای رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید — ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

میرزا صاحب کا یہ خیال نظمِ اردو ہی تک محدود نہ تھا۔ وہ نثرِ اردو کو بھی
اپنے پایۂ کمال سے فروتر جانتے تھے۔ منشی شیو نراین کے توسط سے
ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب نے نثرِ اردو کی فرمائش کی، تو میرزا صاحب

۱۔ میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے قدر بلگرامی کو اپنی مصروفیت کا حال لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:
"رہا جواب کا لکھنا، کاش، آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے! ہر روز صبح کو قلعے جانا اور دوپہر
کو آنا، بعد کھانا کھانے کے حضرت کے مسودوں کا درست کرنا۔ احباب کے خط لکھنے کی فرصت
بہت کم ہاتھ آتی ہے۔ (۲) اردوی معلی، لاہور ایڈیشن، ضمیمہ سرخوش؛ یہ اردو خطوط کے جواب
کے متعلق معذرت ہے۔ ایسی حالت میں فارسی نگاری کی مہلت ملنے کی امید رکھنا کس طرح قرینِ
صواب ہو سکتا ہے؟ (۳) کلیات نظم فارسی: ۱۳۔

۱۱ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء کو منشی صاحب کو لکھا:—

"مگر یہاں غور کرو، اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا، اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھر دوں گا؟"[1]

۱۸ دسمبر کو دوبارہ تحریر کیا:

"چنانچہ سب یار رنڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اردو کے فصیح ہوگا۔"[2]

۴ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء کو سہ بارہ بگڑ کر لکھا:

"میاں! اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو؟"[3]

نظم و نثر سہلِ ممتنع

اس کے باوجود میرزا صاحب بہ ضرور جانتے تھے کہ اُن کا کلام نظم ہو یا نثر، حسن و خوبی کے اُس درجہ پر پہنچ چکا ہے جسے علمائے بلاغت "سہلِ ممتنع" کہتے ہیں۔ چنانچہ بیخبر کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد!... سہلِ ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اُس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع کمالِ حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں اور رشید وطواط وغیرہ شعرائے سلف اس شیوے کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے، سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے گا۔"[4]

۱۔ اردوئے ۳۴۳ و خطوط ۱: ۳۸۹ (۲) ایضاً ۳۶۶ (۳) ایضاً ۳۶۷ (۴) عود: ۱۴۰

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ میرزا صاحب کی نثر اردو شیخ سعدی کی گلستاں کی طرح بظاہر اس قدر سہل معلوم ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے میں بھی ایسی نثر لکھ سکتا ہوں، مگر لکھنے بیٹھتا ہے، تو ایک جملہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور یہی کلام کی خوبی کی آخری حد ہے، جس تک رسائی کے لیے زور دماغ سے زیادہ بخشش معنوی کی ضرورت ہے۔

برتری کا پہلا سبب: استعداد فارسی

میرزا صاحب کی اردو نثر کی برتری و دلچسپی کے متعدد اسباب ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اردو زبان کی نثر اُن کی پختہ عمر کا کارنامہ ہے، جب وہ فردوسی و نظامی سے حزین و قاآنی تک تقریباً ہزار سالہ فارسی نظم و نثر مطالعہ کر کے اس زبان کی سادگی و پرکاری سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے کامیاب کوشش کی کہ اس دیسی زبان میں بھی وہی جدت، شیرینی، سادگی اور لطف پیدا کریں، جو سعدی جیسے اساتذہ ایران کی نثر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اگر وہ فارسی کے بلند پایہ ادیب نہ ہوتے یا اپنے کلام اردو میں فارسی جیسی جدت، شیرینی اور تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہ کرتے، تو ناممکن تھا کہ اُن کا کلام زبانِ اردو میں پائدار حیثیت حاصل کر سکتا۔

دوسرا سبب خطوط سے تفریح

دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو مکاتیب اُن کے تفریحی مشغلوں کا جز بن گئی تھی۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے اپنا اور مکتوب الیہ کا دل بہلانے کی خاطر لکھا کرتے تھے۔ قدرت نے بذلہ سنج طبیعت عطا کی تھی، اس لیے خطوط سے خود لطف اُٹھانے اور دوسروں کے لئے سامان انبساط مہیا کرنے میں اُنھیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ غدر سنہ ۵۷ء کے بعد تمام مشاغل میں سے صرف اسی ایک مشغلے پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ دور اہلِ ہند

کے لیے عموماً اور اہلِ دہلی کے لیے خصوصاً سخت ابتلا و مصائب کا دور تھا، جس نے اعزا و احباب کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار کر بقیہ اصحاب کو شہر بدر کر دیا تھا، اور میرزا صاحب ہندوستان کے برِ اعظم میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ اس عہدِ افسردگی کو فرحت و انبساط کے ساتھ گزارنے کی یہی ایک ترکیب باقی تھی کہ جو دو چار دوست آشنا رہ گئے تھے، اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا جائے، تاکہ اپنا دُکھ اُنھیں سنانے اور اُن کا درد خود سننے سے کچھ غم غلط ہو جایا کرے۔ چنانچہ مجروح، تفتہ، بے خبر اور چند دوسرے اصحاب سے میرزا صاحب کی کثرتِ مراسلت کا باعث یہ بھی تھا۔ اُن میں سے جس کا خط آتا اُس کو جواب، اور جس کا نہ آتا اُس کو شکوہ و عتاب لکھتے رہتے۔ اُس زمانے میں ایک بار تفتہ نے کوتاہ قلمی سے کام لیا، اور ایک ماہ تک کوئی خط نہ بھیجا، تو میرزا صاحب نے ۱۹ جون ۱۸۵۸ء کو پُر حسرت انداز میں لکھا:

"کیوں صاحب، مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہوگا، یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا، کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اُس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد، کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف، صرف تم تین صاحبوں کے خط کے آنے کی توقع۔ اُس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں، ایک تم کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔

"سنو، صاحب! اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا اگر کام آ پڑا دو تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔"[1]

اس کے بعد پھر تفتہ سے تاخیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو مزاحاً تحریر کیا:

"کیوں، صاحب، کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار، کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔"[2]

لیکن تفتہ نے اس کے بعد بھی تساہل سے کام لیا، تو میرزا صاحب نے ۲۷ دسمبر سنہ ۵۸ء کو لجاجت سے لکھا:

"کیوں، صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے، تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی، جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا دن بھی ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب، دس دس بارہ بارہ دن سے تمھارا خط نہیں آیا، یعنی، تم نہیں آتے۔ خط لکھو، صاحب، نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے، تو بیرنگ بھیجو۔"[3]

---

(۱) اردو دی: ۷۳ (۲) ایضاً: ۷۵ (۳) ایضاً: ۸۱۔

لفافے بنا کر دل بہلاتے

اُس زمانے میں میرزا صاحب غم غلط کرنے کے اس قدر درپے تھے کہ جب خط و کتابت کے بعد بھی وقت بچ رہتا، تو آیندہ مراسلت کے لیے لفافے بنانے لگتے۔ منشی نبی بخش کو ۲۲ ستمبر سنہ ۵۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں: مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔"[1]

منشی شیو نرائن نے کچھ لفافے بھیجے اور بذریعۂ تحریر ارسال کی اطلاع دی، تو اُس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا:

"لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟ لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔ بہرحال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے۔ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست۔"[2]

تیسرا سبب خط نہیں باتیں

تیسرا سبب یہ ہے کہ میرزا صاحب نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دے دیا تھا۔ وہ جب کسی دوست کو خط لکھتے، تخاطب میں وہی انداز اختیار کرتے جو اُس مکتوب الیہ سے ملاقات کے زیبا ہوتا۔ اور چونکہ ہر شخص گفتگو میں سادگی، برجستگی اور ظرافت پسند کرتا ہے — اور یہ سب خوبیاں اُن کی تقریر میں موجود تھیں، اس لیے اُن کی تحریر میں بھی وہی دلچسپی نظر آتی تھی، جو تقریر کا طرۂ امتیاز تھی۔ دراصل میرزا صاحب اس قسم کی مراسلت کرنے پر مجبور بھی تھے۔ انھیں دور اُفتادہ دوستوں کو اپنی پریشانیاں سُنانی تھیں۔ اگر یہ پریشانیاں قدیم اندازِ تحریر کے لباس میں جلوہ گر ہوتیں، تو مکتوب الیہ بہت جلد اکتا جاتے، اور میرزا صاحب کو مراسلت کا زیادہ

۱۔ اردوی ۲۷۲۔ (۲)۔ ایضاً: ۳۴۹۔

موقع نہ ملتا۔ لہٰذا اُنھوں نے اپنے تمام خطوط کو مکالمہ بنا کر اُس میں طبعی ظرافت کی تخم ریزی کی، جس کے سبب سے احباب و اعزّا اُن کے خطوں کے انتظار میں رہا کرتے۔

چونکہ میرزا صاحب نے یہ طریقہ جان بوجھ کر اختیار کیا تھا، اس لیے جب اُنھیں اس کی کامیابی کا یقین آگیا، تو اس کی ایجاد کو فخراً اپنی ذات کی طرف منسوب بھی کرنے لگے تھے۔ مہرؔ کے نام کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"مرزا صاحب، میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے، کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"[1]

تفتہؔ کو لکھا ہے:

"بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔"[2]

منشی نبی بخش کو تحریر کیا ہے:

"بھائی، مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے، کہ جو ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت گویا مکالمت ہوگئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں، غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے، ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہوتا۔"[3]

حکیم غلام نجف خاں کے خط کے آخر میں لکھا ہے:

"اُس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا۔ جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔"[4]

شفقؔ کی خدمت میں بھی اسی طرح عرض کیا ہے:

"پیر و مرشد، یہ خط لکھنا نہیں ہے۔ باتیں کرنی ہیں۔"[5]

اُنھیں کو ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

۱۔ اردوی: ۲۵۸ (۲) ایضاً: ۵۸ (۳) ایضاً: ۳۷۱ (۴) ایضاً: ۲۲۶ (۵) ایضاً: ۳۱۲۔

"اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں۔[1]"

تفتہ کو لکھا ہے:

"اس افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا۔[2]"

مرزا صاحب احباب سے بھی اسی طرح کی مراسلت کے امیدوار رہتے تھے۔ کوئی شاگرد ان کے تتبع میں مراسلت کو مکالمے کا رنگ دیتا، تو تعریف کیا کرتے۔ ایک بار تفتہ کا پیرایۂ بیان پسند آیا، تو اظہار خوشنودی کے لیے انھیں لکھا:

"جیتے رہو اور خوش رہو!... زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرداز دیدیا تھا۔[3]"

مراسلت کا محمد شاہی طرز

میرزا صاحب کے وقت تک اردو فارسی دونوں زبانوں کی خط کتابت کا انداز یہ تھا کہ شروع میں بھاری بھرکم القاب و آداب لکھے جاتے، ازاں بعد متعلقین کی خیریت کی اطلاع اور استفسار ہوتا اور اس کے بعد استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں کے پردے میں دو چار مطالب لکھ کر عربی یا فارسی دعائیہ جملے پر ختم کر دیا جاتا۔ میرزا صاحب ابتدا سے اس روش کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مکتوب الیہ کے مناسبِ حال دو چار لفظ کا القاب لکھ کر سیدھے سادے جملوں میں اظہارِ مطالب کر دیا جائے۔ پنج آہنگ کے دیباچے میں اس روش سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بیگانگی این روش از شیوۂ غالب مستمند نہ چندانست کہ گفتن نیاز داشتہ باشد۔ دانا شناس داند کہ ہنجارِ من در نگارش این ست..."

(۱) اردوی: ۲۹۶۔ (۲) ایضاً: ۲۷۶ (۳) ایضاً: ۱۰۴۔

کہ چون کلک دورق بکف گیرم، مکتوب الیہ را بلفظی کہ فراخور حالت اوست، در سر آغاز صفحہ آواز دہم، و زمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است، و پختگان حشو را دفع نہند"[1]

میرزا صاحب نے مراسلت کی اُس روش کا نام، جس میں بڑے بڑے القاب و آداب اور حشو و زوائد سے پُر خیریت گوئی و عافیت جوئی کے جملے ہوتے تھے "محمد شاہی روش" رکھا تھا" اور اس سے اسقدر بیزار تھے کہ مجروح کے نام کے خط میں اس کی ہنسی اڑاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہاں صاحب، تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں، میں فقیر نہیں، جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کرید اکرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں: "یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دعا، اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادتمندی یہ ہے۔ کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔" کیوں، سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہائے، کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے، ابرِ بے باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے، خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا

[1] کلیات نثر غالب: ۵۸

اور اگر تمھاری خوشنودی اُسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ایسی بھی ہیں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہ ہو گی؟[۱]

شفق کے خط میں القاب و آداب سے آغاز کرنے کی جگہ انتہائی پاکیزہ انداز سے اُس متعارفہ طرز کی سبکی اور عدم احتیاج کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں:

"کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں، ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم۔ حضرت غالب! ہم تجھ سے کہتے ہیں، بہت مصاحب نہ بنو۔ ای ایاز حد خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد نو بیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ، پھر عنایت نامے کے آنے کا شکر ادا کر"[۲]

میرزا صاحب کی روش

میرزا صاحب کے عہد میں جو روش پسند کی جاتی تھی، اُس کے سمجھ لینے کے بعد ضروری ہے کہ خود میرزا صاحب کا انداز مراسلت دریافت کیا جاوے۔

پنج آہنگ کے دیباچے میں اُنھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کاتب کو کن امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

"نامہ نگار را آن باید کہ

(۱) نبشتن را رنگ گفتن دہد

(۲) و مطلب را بدان روش گزارد کہ دریافتن آن دشوار نہ بود،

۱۔ اردوئے معلی: ۱۶۸ (۲) ایضاً ۳۰۴۔

واگر مطلبی چند داشته باشد، در تقدیم و تاخیرِ رعایت نگهی بکار برد،
و ازاں پرہیزد کہ سخن گرہ در گرہ گردد و اجزای مدعا بہم گرفرو خورد

(۳) زنہار استعارہ ہای دقیق، و لغاتِ مشکلۂ نامانوس در عبارت
درج نکند،

(۴) و در ہر نورد رعایتِ رتبۂ مکتوب الیہ در نظر دارد۔

(۵) تا تواند، سخن را درازی نہ دہد،

(۶) و از تکرارِ الفاظ محترز باشد،

(۷) و بیشتر بمذاقِ اہلِ روزگار حرف زند، و از احاطۂ قواعد و قوانینی کہ
قرار دادۂ این مردم است، بدر نرود،

(۸) اما اندازۂ خوبیِ زبان نگاہ دارد، و این پارسی آمیختہ بتازی را در
کشاکشِ تصرفاتِ ہندیِ زبانانِ پارسی نویس ضایع نگذارد، و
لغاتِ عربی جز بقدرِ بایست صرف نہ نماید، و پیوستہ دراں کوشد کہ
سادگی و نغزی شعارِ او گردد۔

(۹) و در اقسامِ مکاتیب، خاصۃً در خطوط و عرائضی کہ بحکام نویسد و مشتمل بر
معاملات باشد، از اغلاق و اغراق احتراز واجب داند، و سخن
استعارہ را سشارہ نگزارد، و نرم گوید، و سنجیدہ گوید، و آسان گوید۔[۱]

در اصل ان تمام ہدایتوں کی روح یہ ہے کہ "بنشستن رنگِ گفتن دہد" اسی کو میرزا صاحب نے ایک خط میں اس طرح تعبیر کیا ہے کہ "میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے"

جب ہم کسی سے بات چیت کرتے ہیں، تو کوشش کرتے ہیں کہ مخاطب کو سہولت کے ساتھ اپنا مطلب سمجھا دیں، جو باتیں کہنا ہوتی ہیں، وہ پہلے کہنے کی ہیں، پہلے اور جو بعد میں کہی جا سکتی ہیں، بعد میں کہتے

۱۔ کلیاتِ نثرِ غالب: ۵

پیچیدہ اور گرہ در گرہ باتیں کرنے سے بچتے ہیں، مشکل اور نامانوس لفظوں اور ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں۔ مخاطب کے رتبے کے لائق لفظ زبان سے نکالتے ہیں حتی الامکان گفتگو کو لمبا نہیں کرتے۔ ایک بات یا ایک لفظ کو بار بار زبان سے نہیں نکالتے۔ وہی باتیں باہم کرتے ہیں، جو زمانے کی روش اور پسندیدگی کے مطابق ہوں۔ اپنے زمانے کے اصول زبان کا لحاظ رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ قواعد و ضوابطِ زبان کی پابندی کے ساتھ دوسرے محاسنِ کلام بھی گفتگو میں برتے جائیں اہل زبان کی طرح بولنے اور دوسری زبان کے الفاظ کو بقدرِ ضرورت استعمال کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور سب سے آخر میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ بات چیت میں سادگی اور حسن پیدا ہو جائے۔ اشاروں اور کنایوں سے کام نہیں لیتے، اور نرمی و سنجیدگی برتتے ہیں، بالخصوص جب کسی معاملہ پر برابر والے یا حاکم سے عرض کرنا ہو، تو ان آخری باتوں کا اور زیادہ خیال کرتے ہیں۔

میرزا صاحب چاہتے تھے کہ خطوں میں بھی ان اصول کو برتا جائے خود انھوں نے اپنی انشا میں ان پر کس حد تک عمل کیا ہے، اس کی جانچ کے لئے اُن کے مکاتیب کے اجزا سے جدا جدا بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

القاب و آداب

سب سے پہلے القاب و آداب کو لیجئے۔ میرزا صاحب کے یہاں یہ اجزا اس قدر مختصر، مکتوب الیہ کے رتبے کے مطابق، اور متداول روش سے جدا ہیں کہ انھوں نے ان کے ترک کر دینے کا دعویٰ کر دیا ہے فرماتے ہیں:

"پیر و مرشد، یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں۔ اور یہی سبب

ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا[۱]

دراصل انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ ترک کیا تھا۔ یہ نہ تھا کہ مکتوب الیہ کے مرتبہ کا لحاظ کیے بغیر ہر خط کو بغیر القاب و آداب کے شروع کر دیتے ہوں۔ انھوں نے بزرگ یا بلند مرتبہ اصحاب کو جس قدر خط لکھے ہیں، اُن سب میں الفاظ اور پرواز کے تنوع کے ساتھ یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً نواب فردوس مکاں اور خلد آشیاں کی خدمت میں جس قدر عرضیاں ارسال کی ہیں، اُن سب میں بجز دو ایک کے "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے" ہوتا ہے۔ اور مشکل چار پانچ عرضیوں میں لفظ حضرت ساقط ہوا ہے۔ ہاں، بے تکلف احباب یا شاگردوں کے نام کے مکاتیب میں کبھی تو سرے سے القاب ہوتا ہی نہیں اور ہوتا ہے، تو "میاں، برخوردار، بھائی صاحب، سید صاحب، مرزا، میری جان کیوں صاحب، منشی صاحب، بندہ پرور"، یا اور کوئی مختصر اور بے تکلف لفظ یا فقرہ۔ کبھی کبھی مزاحاً چھوٹوں کو بھی "قبلہ وکعبہ، مولانا" یا پیرومرشد" لکھ دیا ہے۔ بعض خطوط ایسے بھی ہیں، جن میں پورا القاب تحریر کیا ہے، مگر اس میں بھی سادگی و بے تکلفی مفقود نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

"نورِ چشم، راحتِ جان، میر سرفراز حسین جیتے رہو اور خوش رہو!"

یا انھیں کو لکھا ہے:

"میری جان کے چین، میر سرفراز حسین"

تفتہ کو تحریر کیا ہے

"میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ سخنداں"

یا "نورِ نظر، لختِ جگر مرزا تفتہ"

۱۔ اردوی ۲، ۱۲۳۔

علائی کو لکھتے ہیں۔

"سعادت واقبال نشان، مرزا علاؤ الدین خاں بہادر کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔"

یہی حال آداب وتسلیمات کا ہے۔ نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو لکھا ہے:

"سلام مسنون الاسلام و دعای دوام دولت و اقبال کے بعد عرض کیا جاتا ہے۔"

بعض اصحاب کو لکھ دیا ہے: "... فقیر غالب کا سلام" یا "سلام علیکم" یا "بعد دعا کے معلوم ہو" یا صرف "آداب" یا زیادہ مزاحیہ انداز ہیں "اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی" وغیرہ۔

خیریت گوئی دعافیت جوئی

خیریت گوئی سے میرزا صاحب سخت متنفر تھے۔ وہ اس حصے کو حشو شمار کرتے تھے، اس لیے کسی ایک میں بھی "یہاں خیریت ہے اور آپ کی خیریت نیک مطلوب" نہیں پایا جاتا۔ ہاں مطالب کے ساتھ ساتھ اپنی خیریت کا ذکر اور مکتوب الیہ کی عافیت کا استفسار کر لیتے، اور اس روش کو "کارِ پختگاں" شمار کرتے تھے۔

اظہارِ مطالب

میرزا صاحب کا ادائی مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے، جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال وجواب کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ مجھ(؟) علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا، میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج جائیں گی؟ اس نے کہا آج ضرور جائیں گی۔ تیاری

اس عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ یادگار غالب (ص ۱۶۶ - ۱۹۰) کا بلفظہ خلاصہ ہے۔

ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو انھوں نے اس طرح ادا کیا ہے:

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور اُن سے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے، بلکہ اُس کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

"اے میرن صاحب، السلام علیکم! حضرت آداب۔ کہو، صاحب، آج اجازت ہے۔ میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور، میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟ نہیں، میرن صاحب، اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیوں ہوں گے! بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! لیجیے تو، حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے، اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟ کیا عرض کروں! سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا، تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں، تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پنجشنبے کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھیے گا۔ میاں بیٹھو۔ ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی تمہاری باتوں میں

آگیا، اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔"
اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔
بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ میرزا صاحب کے اندازِ بیان سے واقف نہیں، وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں:

"میر مہدی! جیتے رہو! آفریں صد ہزار آفریں! اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"

مغربی طریقہ پر جو قصے لکھے جاتے ہیں، اُن میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں، جیسے کہ میرزا صاحب کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے، ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ میرزا صاحب ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے؛ اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں، جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے، اور جواب کیا۔
میرزا صاحب کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول یا ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، وہ شوخیٔ تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید

سے حاصل نہیں ہو سکتی۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں خوش خیالی کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں میرزا صاحب کے سامنے آتی تھی، اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں:

"کیوں بھئی، اب ہم اگر کوئی آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امین الدین احمد خاں، رئیس لوہارو، کو ان کے بچپن کے زمانے میں ان کے رقعے کا جواب، جس میں میرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں:

"اے مردم چشم جہاں بین غالب، پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشم جہاں بین غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بین، تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر، اور پتلی تم۔ میاں، تمہارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں صرف تمہارا دلدادہ ہوں۔"

ایک دوست کو دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انھوں نے اس کا جواب جنوری سنہ ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب، یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ سنہ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب سنہ ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

الغرض مرزا صاحب کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے، جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج ہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے، تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادا اور ایک دادی۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یکبار مر گئے۔"

مرزا صاحب نے بعض اردو خطوں میں . . . مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں ہمیشہ ایک نقص ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے، تو اس میں تصنع اور آورد کا عیب پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب التزام ما لا یلزم کے اکثر بودا معلوم ہوتا ہے۔ مگر مرزا صاحب کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اسی شخص سے بن آتی ہے، جو باوجود خوش سلیقگی اور لطافت طبیعت کے شاعری میں نہایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیے کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ مگر یہ معلوم رہے کہ

مقفّیٰ عبارت میرزا صاحب بیشتر اُن خطوں میں لکھتے تھے، جن سے ہنسی یا ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا[1]

عرائض کی طرز ادا

اگرچہ میرزا صاحب کے عرائض کا انداز بیان اُن خطوط کے مقابلے میں، جو اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں شائع ہو چکے ہیں، باتکلف ہے، اور یہاں وہ رنگارنگی نہیں پائی جاتی، جو مذکورہ مجموعوں کے خطوط کی جان ہے، تاہم یہ عرائض بھی اُسی نادرہ کار قلم کی پیداوار ہیں جو ادب اردو کے دامن کوتاہ کو سدا بہار پھولوں سے بھر چکا ہے اس لیے ان سرکاری درخواستوں میں بھی وہ سادگی، شوخی اور ظرافت موجود ہے، جس کے سبب سے ادائی مطلب میں میرزا صاحب کی انشا دیگر انشا پردازوں کی تحریروں سے گوی سبقت لے گئی ہے۔

لیکن یہ محاسن اُن خطوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں جن میں حسن طلب ہے۔ چونکہ سرکار رامپور میرزا صاحب کی مالی دستگیری کی واحد کفیل تھی، اس لیے وہ ہر ضرورت کے موقع پر سوال کر بیٹھتے، اور یہ سوچ کر کہ ابھی سابق امداد کو زیادہ زمانہ نہیں ہوا ہے، ہمیشہ ایسے انداز سے سوال کرتے تھے کہ انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ مثلاً نواب فردوس مکاں نے سید حیدر علی خاں بہادر کی شادی کے موقع پر میرزا صاحب کو نورے اور خلعت کے نام سے ۱۲۵ روپے نقد ارسال کیے ہیں۔ میرزا صاحب اس روپے کو خرچ کرنے کے بعد آیندہ کے لیے سبیل نکالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کرو کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپے، جو نورہ و خلعت

(۱) مسجّع عبارت کے سلسلے میں مکاتیب نمبر ہائی ۸، ۱۹، ۱۰، ۱۱، ۱۶، ۲۱، ۳۰، ۳۶، ۳۹، ۴۴، ۵۱، ۵۳، ۵۵، ۵۹، ۶۳، ۶۸، ۷۱، ۸۲، ۸۰، ۹۰، ۹۷، ۱۰۳ ملاحظہ ہوں۔

کے نام سے مرمت ہوئے ہیں، میں سال کا مارا اگر یہ سب
روپیہ کھا جاؤں گا، اور اس میں لباس نہ بناؤں گا، تو
میرا خلعت حضور پہ باقی رہے گا یا نہیں؟" (۱)

نواب فردوس مکاں کی وفات کے بعد نواب خلد آشیاں کی خدمت میں قصیدۂ تہنیت ارسال کیا ہے۔ یہاں سے پہلے ہیں تا خیر ہوئی ہے میرزا صاحب کو روپے کی ضرورت ہے، اس لئے نامۂ تقاضائی لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد، حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے، مگر کہے بغیر بنتی نہیں، ۱۰۰ھ کی ہنڈی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی .... یہ رسم بری نہیں ہے۔ اگر جاری رہے، تو بہتر ہے" (۲)

ایک سال دلی میں بارش کم اور رامپور میں کافی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگرچہ یہاں مینہ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمان ازلی میرے رزق کی برات آپ پہ ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے۔ ابر رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظر اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو۔" (۳)

نواب خلد آشیاں نے جشن تخت نشینی میں شرکت کی دعوت دی ہے اس کا شکریہ ادا کر کے لکھتے ہیں:

"حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا۔ وہ

---

(۱) مکاتیب: ۱۲ (۲) ایضاً: ۳۷ (۳) ایضاً: ۴۰

آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرام سیّدنا المنصور رامپور باندھا ہے۔"(۱)

ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں نے اپنی ایک فارسی نثر اصلاح کو بھیجی ہے۔ میرزا صاحب بعض محاوروں کی تغلیط کرتے ہیں۔ اہل دربار بہارِ عجم اور فرہنگ جہانگیری وغیرہ کے حوالے سے اس اصلاح کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ نواب صاحب یہ حوالے نقل کرکے میرزا صاحب سے اصلاح پر نظرِ ثانی کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے تحریر کیا ہے:

"مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویٔ اجتہاد نہیں ہے، بحث کا طریقہ یاد نہیں۔ یہاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی علمائے عجم میں سے نہیں۔ ہندی ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی ان کا ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو بھی! نورٌ علیٰ نور!"(۲)

باغِ بے نظیر کی نمائش کا حال اخبار میں پڑھا ہے، اور چاہتے ہیں کہ نواب صاحب کو اس جشنِ بے نظیر کی مبارک باد دیں۔ اس مضمون کو اس طرح ادا فرماتے ہیں:

"نمائش گاہ سراسر سرورِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے، میں وہاں نہیں! بالا خانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا، مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا، اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا اور

(۱) مکاتیب: ۳۸، ۳۷ (۲) ایضاً: ۴۰۱

"رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی، پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر، اور وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریق فرضِ محال ہے۔ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔"(۱)

نواب سکندر زمانی بیگم کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبان فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم، دل نے قبول نہ کیا، اور یہ بھی گفتاری لفظاً اور معناً واسطِ تہنیت کے ہے، کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے طبیعت راہ دیتی ہے، الفاظ ڈھونڈے جاتے ہیں، معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں ہمہ مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ جس بات کا تصور ناگوار ہو، اس کے تذکرے جی کیوں نہ بے قرار ہو۔"(۲)

نواب زین العابدین خاں بہادر سے خواہش کرتے ہیں کہ اپنے نام کا خط سرکار کو دکھا دینا، مگر ساتھ ہی فرماتے ہیں:

"لیکن تم سے یہ تو نہ کہو مگر پڑھے؟ کس واسطے کہ تم نے اردو دیوان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا حال جناب عالی سے دریافت کر کر کب لکھا ہے، جو اس بات کا جواب لکھو گے۔"(۳)

خاتمہ

میرزا صاحب خط کے آخر میں بالعموم ایک دو دعائیہ لفظ لکھا کرتے تھے۔ اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں بعض مقامات پر یہ جز متروک ہو گیا ہے، یا اپنی خیریت یا دنیا کی بے ثباتی سے متعلق کسی جملے سے بدل گیا ہے، لیکن عرائض میں کبھی نظر انداز نہیں ہوا۔ ان میں اکثر:

۱۔ مکاتیب: ۱۶۹ (۲) ایضاً: ۱۹۲ (۳) ایضاً: ۷۵۔

"زیادہ حد ادب۔ تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ایک"

یا "تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزوں"

تحریر کیا کرتے ہیں۔ دو چار خطوں میں پہلے شعر کا مصرع اول اور دوسرے کا مصرعِ ثانی ملا کر بھی لکھدیا ہے۔ چونکہ اس جز میں رنگارنگی میرزا صاحب کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی، اس لئے تمثیل و استشہاد بیکار ہے۔

کاتب کا نام

میرزا صاحب کاتب کی شخصیت کا تعین نئے نئے اسلوب سے کرتے تھے۔ عام انشا پردازوں کی طرح آخر میں نام لکھنے کا طریقہ اُن کے ہاں صرف پُرتکلف مراسلت کے ساتھ مخصوص تھا۔ بے تکلفانہ خط کتابت میں کبھی خط کے شروع یا درمیان میں اس طرح نام لکھتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو خیال تک نہیں ہو سکتا کہ یہاں نام لکھنے سے مقصود کاتب کا تعارف ہے مثلاً مجروح کو لکھا ہے:

"قبلہ، کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے، کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے، وہ کیا کھاتا پیتا ہے، اور کیونکر جیتا ہے"[۱]

یا مثلاً شفق کو تحریر کیا ہے:

"کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اتنا ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں، واہ! کیا ہوشمندی ہے کہ قبلہ اور باپ ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم!

سُن غالب، ہم تجھ سے کہتے ہیں: "وہ بہت مصاحب نہ بن"[۲]

اور کبھی آخر میں نام لکھتے ہیں، جو بیشتر تو اُن کا تخلص "غالب" ہوتا ہے اور تنہا یا کسی ہم قافیہ فقرے کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ اردوی: ۳۷۴ (۲) ایضاً: ۳۱۴۔

"بندۂ علی ابن ابی طالب، آرزومندِ مرگ غالب، نجات کا طالب غالب، عفوِ جرم کا طالب، غالب، داد کا طالب غالب، اس خط کی رسید کا طالب، غالب، ترحم کا مستحق اور تفقد کا طالب غالب وغیرہ"۔

لیکن بعض خطوں میں اصلی نام "اسد اللہ خاں" یا "اسد اللہ" یا صرف "اسد" یا "اسد اللہ خاں غالب" یا "اسد اللہ غالب" بھی لکھا ہے۔ "اسد اللہ" کے ساتھ بھی میرزا صاحب ہم قافیہ فقرہ استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً:

"عرضداشت ہوا خواہ کا اسد اللہ کی"(۱)

متعدد خطوط میں میرزا صاحب نے یہ چیز ترک بھی کر دی ہے۔ ان میں چند ایسے ہیں جن میں کنایۃً نام آگیا ہے۔ مثلاً علائی کو لکھتے ہیں:

"نام اپنا بدل کر خط سیاہ کر لیا ہے"(۲)

انہیں کو دوسرے خط میں لکھا ہے:

"کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ گے"(۳)

ایک اور خط میں تحریر کیا ہے:

"کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے"(۴)

سرور کو بالکل نئے انداز سے لکھا ہے:

"کاتب وہی ہے جو لفافہ کے عنوان کا مکتوب الیہ ہے"(۵)

دو چار خط ایسے بھی ہوں گے، جن کے آخر میں (بالارادہ یا سہواً) نام لکھنے سے رہ گیا ہو گا۔ لیکن اکثر کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ ان کے آخر میں نام کی جگہ "غالب" نام کی جو ثبت تھی، جو نقل کرنے سے رہ گئی ہے۔

تاریخ کتابت

میرزا صاحب خط کی تاریخ بھی ہمیشہ ایک سے نہیں لکھتے

۱۔ مکاتیب، ص ۳۳ (۲) اردوئے معلیٰ، ص ۹۳ (۳) ایضاً، ص ۳۷۰ (۴) ایضاً، ص ۴۹۶ (۵) ایضاً، ص ۱۳۳

شفق کو لکھتے ہیں:

"خداوند نعمت، آج دوشنبہ ۹ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا۔"(۱)

تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"جناب عالی، آج دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہو گا۔ ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے۔"(۲)

وسطی تاریخ

بھی مطالب کے ضمن میں اس طرح تاریخ لکھتے کہ بظاہر پڑھنے والے کو تاریخ کا خیال تک نہ گزرتا، بلکہ تاریخ بھی منجملہ مطالب معلوم ہوتی تھی۔ مثلاً علائی کو لکھا ہے:

"تمہارے پاس جو قاطع برہان ہے، اگر چھاپے کی ہے، تو ٹھیک ہے، جہاں تردد ہو، غلط نامہ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو تو مجھ سے پوچھ لو۔ اور اگر قلمی ہے، تو اس کا اعتبار سرا سر ساقط ہے۔ اس کو میری تالیف نہ سمجھو، بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمیس ۹ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ ادھر پڑھا، ادھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین مہر دردی آئے۔ تمہارا خط ان کو دیا، وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں، ابر آیا ہوا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے۔"(۳)

شاہ عالم مارہروی کو لکھا ہے:

"یاں تک لکھ چکا تھا کہ ایک چپراسی آیا، اور اس نے خط تمہارے

(۱) اردوی: ۵۹۲ (۲) ایضاً: ۷۵۲ (۳) ایضاً: ۱۴۳

نام کا ٹکٹ لگا ہوا دیا اور کہا کہ ڈپٹی صاحب نے سلام کہا ہے اور یہ خط دیا
ہے۔ اسی آن میں یہ خط اپنا مع اُن کے خط کے ڈاک گھر میں بھیجتا
ہوں۔ صبح کا وقت بھیجنے کا دن ۸ صفر اور ۲۵ اگست کی ہے ہے
ڈپٹی صاحب چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر
کی حویلی میں رہتے ہیں۔"(۱)

مجروح کو لکھتے ہیں:

"تمہاری شکایت پانی پت کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجھ کو
پانی پت سے بھیجا تھا اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی، میں
نے تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط آئے گا، تو میں جواب لکھوں گا۔
آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں، تبرید پی کر بیٹھا
تھا کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔"(۲)

خاتمے کی تاریخ

خاتمے کی تاریخ میں بھی میرزا صاحب موجودہ رسم تحریر کی مخالفت کرتے
نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں آخری تاریخ کا تذکرہ کبھی ضمن مطالب میں ہوتا
ہے۔ البتہ عرائض میں دو چار مقامات کے علاوہ ہر جگہ ختم کرنے کے
بعد تاریخ ثبت کی ہے۔ مثلاً مہر کو لکھا ہے:

"دو شنبہ کا دن ۱۵ دسمبر کی صبح کا وقت ہے، انگیٹھی رکھی ہوئی ہے،
آگ تاپ رہا ہوں، اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آ گئے۔ تم کو
لکھ بھیجے۔ والسلام۔"(۳)

ذکا کو تحریر کیا ہے:

"در جواب خط کا طالب غالب سہ شنبہ اردو جنتری ۲۴ اور مانند روز دوشنبہ
۲۵ رجب سنہ ۱۲۸۳ھ اور نہم دسمبر سنہ ۲۲ ء عم بھائی یہ خط

(۱) اردوئے معلیٰ ۱۰۲؛ (۲) ایضاً: ۸۰؛ (۳) ایضاً: ۲۶

ازراہِ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔"(۱)

علائی کو لکھتے ہیں:

"۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کی بدھ کا دن صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہوگے۔"(۲)

انھیں کو لکھتے ہیں:

"...... مرقومۂ شنبہ یکم جون وقت صبح چھ بجے سات کے عمل میں۔"(۳)

خاتمے میں اعادۂ تاریخ

کبھی کبھی مرزا صاحب آغاز میں تاریخ لکھ دینے کے بعد خاتمے میں اس کا دوبارہ اجمالی ذکر کرتے ہیں۔ علائی کو لکھا ہے:

"دن، تاریخ، اپنا نام، آغازِ کتابت میں لکھ آیا ہوں۔ اب ارسالِ جواب کی تاکید کے سوا اور کیا لکھوں۔"(۴)

انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:(۵)

"دن، تاریخ صدر میں لکھ آیا —— کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ گے۔"

سہ بارہ تحریر کیا ہے:

"تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں۔ نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔"(۶)

وقتِ کتابت کا ماحول

بعض اوقات مرزا صاحب تاریخ کے علاوہ خط لکھتے وقت کی حالت کا نقشہ بھی مکتوب الیہ کی نگاہوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے، تاکہ مکتوب الیہ یہ محسوس کرے کہ خود مرزا صاحب کے پاس بیٹھا ہوا ان کی زبان سے مکتوبہ واقعات سن رہا ہے، مطالبِ خط سے زیادہ لطف اندوز ہو۔ مثلاً گرمی کا موسم ہے، رامپور کے پہلے سفر سے واپس دلی پہنچے ہیں

(۱) اردوی: ۳۴۳ (۲) ایضاً: ۲۴۴ (۳) ایضاً: ۲۰۸ (۴) ایضاً: ۴۴۴ (۵) ایضاً: ۴۳۴
(۶) ایضاً: ۳۹۵

آخر عمر میں رعشہ پیدا ہو جانے سے دائرے اور کششوں میں پہلی سی خوشنمائی باقی نہیں رہی تھی، تاہم پختگی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

سامان کتابت: کاغذ

میرزا صاحب کے خطوط میں سامان کتابت کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس لیے اس پر اجمالی نظر مناسب ہوگی۔

میرزا صاحب بالعموم بادامی یا ولائتی کاغذ استعمال کرتے تھے، جو نیلگوں یا سفید یا گلابی ہوتا۔ دربار رامپور میں ان کی جس قدر عرضیاں پیش ہوئی ہیں، وہ بجز ایک دو کے تمام اسی قسم کے گراں قیمت کاغذ پر لکھی ہوئی ہیں۔ منشی سیلچند اور خلیفہ احمد علی صاحب کے نام کے خطوط گھٹیا کاغذ پر ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کاغذ کے انتخاب کے وقت مکتوب الیہ کے رتبے کا لحاظ رکھتے تھے۔

بعض اوقات تنگ دستی کی وجہ سے میرزا صاحب کے پاس کاغذ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا، تو جواب دینے کے لیے روپے کا انتظار کرنے کے عوض کتاب میں سے سادہ ورق پھاڑ لیتے تھے۔ ۸ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو مجروح کو خط لکھتے وقت یہی صورت اختیار کرنی پڑی تھی۔ اسی خط میں فرماتے ہیں:

"بھائی، نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں، اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا، کل شام کو کچھ خرچ نہیں رہا، سو پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگا لوں گا۔"[1]

قلم

میرزا صاحب کے زمانے تک لوہے کے قلم کا رواج عام نہ ہوا تھا،

(۱) اردوئے معلی: ۱۵۵۔

اس لیے وہ بیرے کا قلم استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قلم بناتے ہیں چاقو سے انگوٹھا زخمی ہو گیا، اور اس بنا پر منشی شیو نرائن کے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے تحریر کیا:

"بھائی صاحب، تم خط کے جواب نہ پہنچنے پر گھبرا رہے ہوگے۔ حال یہ ہے کہ قلم بناتے ہیں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہو گیا اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے۔ بہرحال اب اچھا ہوں۔" (۱)

یہ سنہ ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔ آخر عمر میں رعشہ کے سبب سے خود قلم بنانے کے قابل نہ رہے تھے، لڑکوں سے بنوا لیتے تھے۔ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۶ء کو نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:

"دوران سر اور رعشہ، ضعف بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔" (۲)

لفافے

شروع میں میرزا صاحب اپنے ہاتھ سے لفافے بنا کر ادھر ادھر بھیجتے تھے۔ ایک بار منشی شیو نرائن نے لفافوں کے اوپر "از مقام" "در مقام"، "تاریخ و ماہ" طبع کر کے پارسل بھیجا۔ میرزا صاحب ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے یہ چیزیں دوستوں میں تقسیم کر دیا اور جب منشی صاحب نے ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء کو دوبارہ اسی قسم کے لفافے ارسال کیے، تو لکھا:

"برخوردار، اس وقت تمھارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا۔ دل خوش ہوا۔ بھائی میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔ یہ لفافے "از مقام" و "در مقام" و "تاریخ و ماہ" مجھ کو پسند نہیں آئے جو تم نے

(۱)۔ اردوئی: ۲۶۳، مکاتیب: ۱۸۲

کے ہیں۔ یہ لفافے بالعموم (؟) کاغذ سے بنائے گئے ہیں جن پر خط لکھا ہے، اور تمام مستطیل شکل کے ہیں۔ البتہ ردّی نے ہونے لفافے حسب اقتضائے وقت چھوٹے بڑے ہوگئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ۸ انچ لمبا اور ۳½ انچ چوڑا، اور سب سے چھوٹا ۵ انچ لمبا اور ۱¾ انچ چوڑا ہے۔ مطبوعہ کا ناپ ۶½ × ۳ ۱ اور ۵½ × ۲½ ہے۔

سرنامے

میرزا صاحب کے لفافے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سرناموں میں وہ سادگی نہیں برتی ہے، جو ان کے خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے ابتدائی چند لفافوں پر یہ عبارت مندرج ہے۔

۱

بارسید در بلدۂ دلکشائے رامپور بملاحظۂ فیض گنجور جناب مستطاب نواب والا مناقب عالی [illegible] فیض [illegible] جناب [illegible] بہادر دام اقبالہ
نگارندہ از غالب ساکن مقام دہلی مرسلہ چہار شنبہ ۲۰ جنوری ۱۸۵۷ء پوسٹ پیڈ

۲

بارسید [illegible] بملاحظۂ فیض گنجور [illegible] عالی احسان جناب مستطاب [illegible] بہ [illegible] باد
از غالب [illegible]
چہار شنبہ [illegible] جنوری
۱۸۵۷ء

۳

بحضور پر نور جناب مستطاب ــــ معلی احسان حضرت نواب محمد ــــ بعز قبول مقرون باد
بلا سٹامپ [illegible]

ا۔ اس لکیر کا مقصد یہ ہے کہ سابق سرنامے کی اتنی عبارت اس سرنامے میں بھی پائی جاتی ہے۔

ٹکٹ سے صرف دو پر پتا وغیرہ اردو میں ہے، اور سب کی زبان فارسی ہے۔ اردو والوں میں سے ایک مولوی محمد حسین خاں، مالک مطبع حسنی رام پور کے نام ہے، جس کا سرنامہ حسب ذیل ہے:

ٹکٹ	رام پور آزاد خاں کا بنگلہ دروازہ سکندری کا مطبع محمد حسین خاں مالک مطبع بیرنگ ضروری ۲۵ فروری ۱۸۶۲ء

دوسرا خط بریلی کو تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا عکس خطوط غالب میں صفحہ ۱۱۳ کے مقابل شائع ہو چکا ہے۔ اس کے سرنامے کی عبارت یہ ہے:

بریلی جامع مسجد کے پاس حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب کی خدمت میں پہنچے اسد بیرنگ ۱۲ ماہ اکتوبر [illegible]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آخر عمر میں میرزا صاحب بے تکلف احباب اور شاگردوں کو اردو میں پتا لکھنے لگے تھے۔

ٹکٹ:

میرزا صاحب بیشتر پوسٹ پیڈ خط بھیجتے، اور اوپر کے بائیں گوشے میں "پیڈ"، پوسٹ پیڈ، اسٹامپ پیڈ، پیڈ ضروری، ڈبل پیڈ ضروری، پیڈ ضروری واجب العرض، اسٹامپ پیڈ ضروری، اسٹامپ ضروری۔ یا پیڈ واجب العرض ضروری لکھ دیتے تھے۔

لفافے پر ٹکٹ لگانے کا مقام بھی متعین نہ تھا۔ کبھی لفافے کے رخ پہ اور کبھی پشت پہ اور رخ پر کبھی دائیں اوپر یا نیچے کے گوشے میں، کبھی وسط میں نیچے کی طرف، اور کبھی بائیں اوپر یا نیچے کے گوشے میں

روشنائی

میرزا صاحب ہمیشہ سیاہ روشنائی استعمال کرتے تھے، جو صاف روشن اور چکنی ہوتی۔ آخری ایام کے خطوط میں پھیکی روشنائی بھی نظر آتی ہے، جس کی وجہ خود میرزا صاحب کی قلمدان سے بے توجہی تھی ضرورت کے وقت لڑکوں کے قلم اور انھیں کی روشنائی سے لکھا کرتے ہوں گے اور خود لوح و قلم کی درستی اور اہتمام سے اس لیے سبک دوش ہو چکے ہوں گے کہ اب انھیں ان دونوں کی شہادت کی ضرورت باقی نہ تھی، عالم اسباب اُن سے [illegible] چکا تھا۔

قواعد ڈاک کی پابندی

میرزا صاحب ڈاک کے قواعد کے سخت پابند تھے۔ وہ خود بھی خلاف ورزی قانون سے احتراز کرتے تھے اور احباب کو بھی اسی امر کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ [illegible]

"خط میں خط ملفوف کرنا جانب حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں اُن کے نام کا خط تمھارے خط میں ملفوف کر کے بھیجتا۔"[1]

منشی غلام بسم اللہ نے اپنی غزل کے ساتھ کسی منصف صاحب کی غزل بھی ارسال کر دی تھی۔ آپ ان کی اس [illegible] پر سرزنش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنیے حضرت، خط میں خط ملفوف کرنا، تداخل ہوتا ہے۔ اگر یہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا، تو مجھ سے پچاس روپے لیے جائیں گے یا قید کا حکم ہوگا۔ آئندہ آپ خط جداگانہ بھیجا کیجیے۔ اس باب میں تاکید جانیے۔ کوئی خط جداگانہ آپ کی طرف سے ممنوع نہ ہوگا۔"[2]

سرور نے پارسل میں کچھ خط رکھ دیے تھے۔ اُن کو تحریر کرتے ہیں:

۱۔ مکتوب ۱۸۶۲ء [illegible]، اردوئے معلیٰ، ص ۱۴۳۔

"پارسل میں خطوط بھیجنے میں اندیشہ ہے۔ خدا نے بچا یا۔ چونکہ اسے
وہ خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھے اور از راہِ احتیاط پارسل میں
سے نکال لیے"۱

ایک بار تفتہ کے نام ایک پارسل حسبِ قاعدہ بارہ آنے کا ٹکٹ چسپاں
کرکے ڈاک خانے بھیجا۔ یہ شخص پارسل لے کر گیا تھا، اس نے غلطی
سے خطوں کے بکس میں پارسل ڈال دیا۔ میرزا صاحب نے واقعے سے
مطلع ہو کر تفتہ کو لکھا:

"صاحب، کل پارسل شمار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اس پر یہ
لکھ کر کہ یہ پارسل ہے، خط نہیں ہے، ڈاک میں بھیج دیا۔ ڈاک منشی
نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمتگار نا خواندہ آدمی کا
اس حکم کو بجا لایا اور اس کو خطوں کے صندوق میں ڈال
آیا ہو، لفافہ کہ یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے، وہ دستی کو محصول لیے۔
اگر وہاں کے ڈاکیے تم سے خط کا محصول مانگیں، تو تم ہمارے چٹھے
کے ذریعے سے گفتگو کر لینا"۲

دراصل میرزا صاحب کی احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بار تفتہ کی غلطی کا
خمیازہ بھگت چکے تھے، اور غالباً پارسل کو خطوں کے بکس میں ڈال دینے
کی وجہ سے اُن کو پوسٹ پیڈ پارسل کا مزید محصول ادا کرنا پڑا تھا
۲۲ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء کو یہ واقعہ خود تفتہ کو لکھا ہے۔

"میرزا تفتہ، کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط
بانٹتا ہے، آیا اور اس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔
پہلے تو حیران رہا کہ پارسل خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا! جب سرنامے
کی تحریر دیکھی، تو تمہارے ہاتھ کا بیرنگ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے

۱۔ اردوی: ۱۴۳ — ۲۔ ایضاً: ۱۰۵

بیرنگ خطوط

بیرنگ خطوط ارسال کرنے کو میرزا صاحب قانون صحت و اخلاق کے خلاف جانتے تھے۔ میرزا حاتم علی مہر کو ایک بیرنگ خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرا شیوہ نہیں ہے خط بیرنگ بھیجنا"[1]

لیکن کبھی بیرنگ خط بھیجتے، تو بیرنگی کی وجہ بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱) یا تو اس وقت بیرنگ خط لکھا کرتے، جب ان کے پاس ٹکٹ موجود نہ ہوتا، خواہ اس لیے کہ جیب اس کی اجازت نہ دیتی، یا بروقت ڈاک خانے سے ٹکٹ کا حصول دشوار ہوتا۔ مگر اس عذر کے لیے بے تکلف احباب اور شاگرد مخصوص تھے۔ مجروح کو ایک بیرنگ خط میں لکھا ہے:

"بھائی، نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔ [illegible] میں نے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے [illegible] اگر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں بھیجتا ہوں [illegible]۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگا لیا گیا ہے"[2]

اسی طرح علائی کو لکھتے ہیں:

"بھائی، سچ تو یہ ہے کہ آج کل میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں، تو کیا [illegible]، [illegible] نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟"[3]

ثاقب کو زیادہ مضحکانہ انداز میں تحریر کیا ہے:

"آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام، معاف رکھنا، والسلام"[4]

۲) یا اس وقت بیرنگ ارسال کرتے جب خط کے تلف ہو جانے

---

(۱) اردوئے معلیٰ: ۳۴۴ (۲) ایضاً: ۵۵ (۳) ایضاً: ۴۲۴ (۴) ایضاً: ۱۰۲

کا خطرہ ہوتا۔ چونکہ تلف ہو جانے کا خطرہ اہم مکاتیب کے سلسلے میں زیادہ ناپسندیدہ معلوم ہوتا ہے، اور اہم مکاتیب بے تکلف اور با تکلف دونوں قسم کے مکتوب الیہ کو لکھے جاتے ہیں، بنا بریں اس عذر کے ماتحت میرزا صاحب نے والیانِ ریاست اور امرا تک کو بیرنگ خطوط لکھے ہیں (۱) ایک بار شفق نے خط نہ لکھنے کی شکایت کی، تو ان کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا ہے۔

"سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے، تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں" ۲

در اصل میرزا صاحب یہ سمجھتے تھے کہ ڈاکیہ بیرنگ خط کو کوشش کر کے مکتوب الیہ تک جلد پہنچا دیتا ہے، تاکہ اس سے محصولِ ڈاک وصول کر سکے۔ یہ خیال ۹ مارچ ۱۸۵۹ء کے شفق کے خط میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

"بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا بادی اور بانی میں ہوتا ہوں۔ آپ بھی جب کبھی بغرض ارسال خط بھیجیے، تو بیرنگ بھیجیے" ۳

یہی رائے سید احمد حسن مودودی کے خط میں بھی ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ خط عمداً بیرنگ بھیجتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ پیڈ کے تلف ہونے کا احتمال ہے، اور بیرنگ کا نہیں" ۴

سیاح کو لکھتے ہیں

"پیڈ خط اکثر تلف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر اس بات پر یہ خط تم کو

---

(۱) نواب فردوس مکان کے نام دوسرا خط، جس میں قصیدہ منسلک تھا، بیرنگ بھیجا تھا

(۲) اردوی ۴۰۶ (۳) ۴۳۰ (۴) خطوط: ۱/ ۱۳۱ (۴) اردوی ۴۴۳

بیرنگ بھیجتا ہوں، تاکہ ضائع نہ ہونے کا احتمال قوی رہے"۔۱

سرور کو ضرور خطوط کے بیرنگ ارسال کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور رکھیے گا، تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا، اور رجسٹری کا دردِ سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی، ایک آنہ سہی، آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجیے، اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ اسٹامپ پیڈ خطوط تلف ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں، پابند بھی ہوا، اور یہ خط بیرنگ بھیجا ہے"۔۲

مولوی عزیز الدین نے، جنھوں نے بریلی سے خط ارسال کرنے کی اطلاع دے کر اس کا جواب نہ لکھنے کی شکایت کی تھی، جواب میں مرزا صاحب نے لکھا ہے:

"خط از روئے احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ پوسٹ پیڈ خط اکثر تلف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عبدالجمیل صاحب کا خط، جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے دیکھا ہو! آپ ان سے میرا سلام نیاز کہیے، اور خط کے نہ پہنچنے کی ان کو خبر پہنچا دیجیے"۔۳

والیِ بھرتپور کا انتقال ہوا اور یہ خبر دلی پہنچی، تو مرزا صاحب کو فکر ہوئی کہ کہیں جانی جی، جو مرزا تفتہ کے مربی تھے، معزول تو نہیں کر دیے گئے۔ اس خبر کے استفسار کے لیے تفتہ کو خط لکھا اور اس میں تاکیداً کہا کہ:

"واسطے خدا کے! نہ مختصر نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو کچھ واقع ہوا ہو، اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو، اور جلد لکھو، کہ مجھ پر خواب و خور

۱: اردوئے معلیٰ: ۱۴۱ (۲) عود ہندی: ۲۴۳ (۳) اردوئے معلیٰ: ۲۱۶

حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا، آج صبح قلعے نہیں گیا۔ اور یہ خط لکھ کر
ازراہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ
روانہ کرنا۔ آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ
خط کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں، اور پوسٹ پڑا رہتا ہے۔
جب اس محلے میں جانا ہوتا ہے، تو اس کو بھی لیجاتے ہیں۔"[۱]

دستنبو کی طباعت کے متعلق ضروری ہدایتیں بیرنگ لکھ کر فرماتے ہیں:

"واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا ہے"[۲]

اسی طرح تفتہ کو ایک ضروری خط بیرنگ لکھ کر عذر کرتے ہیں:

"بھائی یہ خط ازراہِ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں"[۳]

نواب فردوس منزل کی خدمت میں ایک عریضہ جو ان کی والدہ ماجدہ کی
تعزیت و فاتحہ کے متعلق تھا، ارسال کیا ہے، اور اس کا جواب نہ پاکر
دوسرا عریضہ بیرنگ ارسال کرتے ہیں۔ آخر میں ازراہِ معذرت
لکھتے ہیں:

"پہلے میں ایک قطعہ جناب بیگم صاحبہ مرحومہ کی تاریخ وفات کا بھیجا ہے
یقین ہے کہ پہنچا ہوگا۔ ازراہِ احتیاط یہ خط بیرنگ روانہ
کرتا ہوں"[۴]

مرزا صاحب پوسٹ پیڈ خطوط کے ضائع ہو جانے کے اس درجہ قائل تھے
کہ جب کبھی انھیں کوئی خط نہ ملتا، وہ اسے ڈاک خانے کی سہل انگاری
پر محمول کر کے لکھ دیا کرتے کہ شاید میرا خط ضائع ہو گیا ہوگا، اور اگر کسی دوست
سے جواب خطوط میں تاخیر ہوتی، یا ان کے ہر سطر خط کا حوالہ نہ ہوتا، تو باور
کر لیتے کہ خط ڈاک ہی میں تلف ہو گیا۔

[illegible]

میرزا صاحب کا پتا

اگرچہ باعتبار حسب و نسب میرزا صاحب دلی کے مشاہیر میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن اُن کی وسیع اور مسلسل مراسلت نے اس شہرت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اُن کے پاس روزانہ ہندوستان اور بیرون ہند سے اردو، فارسی اور انگریزی خطوط آتے رہتے، جن میں سرکاری اور نجی ہر قسم کی تحریریں ہوتی تھیں۔ چونکہ شہر میں انھیں ہر شخص جانتا تھا، اس لیے اُن کا خیال یہ تھا کہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر میرے نام کا خط کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ اُن کی ڈاک خانے کی معروفیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پورے شہر دلی میں وہ اپنے نام کے اعتبار سے یکہ و تنہا تھے اور ڈاکیا اسد اللہ خاں غالب کا مسمّیٰ ایک ہی ذات کو جانتا تھا۔

میرزا صاحب کو اپنی اس شہرت و ناموری کا اس درجہ پاس تھا، کہ کوئی دوست یا شاگرد اُن کے مکان کا پتا دریافت کرتا، یا اُن کے نام کے خط پر لانبا چوڑا پتا لکھ دیتا، تو وہ اس کو اپنی توہین خیال کرتے۔ ایک بار علائی نے مکان کا پتا دریافت کیا۔ میرزا صاحب نے برہم ہو کر لکھا:

دوست صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو گے اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو گے، تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی و انگریزی

یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام
یہ سب مراتب تم جانتے ہو، اور اُن خطوں کو تم دیکھ چکے ہو، اور پھر
مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں،
نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ
نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پاسکے۔ آپ صرف دلّی لکھ کر میرا
نام لکھ دیا کیجیے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن ہوں"۱

جنونؔ بریلوی نے پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے خط کے بارے میں تردد کا اظہار
کیا۔ اُن کو لکھتے ہیں:

"قبلہ، آپ کو خط کے بھیجنے میں تردد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار
خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، گاہ گاہ انگریزی بھی، اور
ڈاک کے ہرکارے بھی میرا گھر جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر میرا آشنا
ہے۔ مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے، وہ صرف شہر کا نام اور
میرا نام لکھتا ہے، محلہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کیجیے کہ
آپ لال کنواں لکھتے رہے، اور مجھ کو بلی ماروں میں خط پہنچتا رہا۔
خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا"۲

ذکا نے یکے بعد دیگرے دو نیاز نامے بھیجے، مگر مرزا صاحب کی طرف
سے جواب نہ ملا۔ انھوں نے اس کو دلّی کے ڈاک خانے کی غفلت
پر محمول کر کے آخری خط بذریعہ رجسٹری ارسال کیا، اور اس میں
جواب نہ دینے کی شکایت لکھی۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب الفاظ
و مطالب کے گل کھلاتے ہیں:

"میرے مشفق، میرے شفیق، مجھ سے ہیچ و پوچ کے ماننے والے،
مجھ سے برے کو اچھا جاننے والے، میرے محب، میرے

(۱) اردوی: ۱۸۴ (۲) ایضاً: ۲۰۷۔

محبوب! تم کو میری کیا خبر بھی ہے؟ آگے ناتواں تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے، رعشہ و ضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں کی اور دنوں کی ہے۔ پہلا خط تمہارا پہنچا...... دوسرا خط مع غزل آیا...... غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیج دی گئی، اور لکھا گیا، نوید حصول صحت جلد بھیجو۔ کل ایک خط رجسٹری دار آیا۔ گویا ستارۂ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے! بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نوید رفع مرض و حصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بیجا سے لبریز۔

صاحب! میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو، وہیں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلّی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا مجال ہے کہ مجھ تک نہ پہنچے! اسی طرح میرا خط یہاں کے ڈاک خانے سے نہ روانہ ہو، کیا معنی! جہاں پہنچے، وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔"(۱)

تفتہ کو ایک خط میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضروری نہیں۔ فرماتے ہیں:

در بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتہ ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں، حاجت نہیں ہوتی۔ بعض فارسی خط پر محلے کا نام نہیں ہوتا، اور انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے۔ چنانچہ خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانے اُن کی بلا کہ

(۱) اردوی: ۲۷۳

بلی ماروں کا محلہ کیا چیز ہے؟" (۱)

مہر کو تحریر کیا ہے:

"اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے، کہ میرے خط کے سرنامے پر محلے کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام، فقط، تمام" (۲)

ایک بار میرزا صاحب نے مکان تبدیل کیا۔ تفتہ کو تردد ہوا کہ یہ مکان کس محلے میں واقع ہے۔ ان کے اس تردد کے رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے:

"یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہشت ہے، اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلی ماروں کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ اگر اور محلے میں بھی جا رہتا، تو قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے۔ یعنی اب اکثر خطوط لال کنوئیں کے پتے سے آتے ہیں، اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ بہر حال تم وہی "دلی بلی ماروں کا محلہ" لکھ کر خط بھیجا کرو" (۳)

تفتہ ہی کو دوبارہ لکھا تھا:

"میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا جانے اس پر کیا جھگڑا پڑا" (۴)

سید احمد حسن مودودی کی شکایت پر تحریر کیا ہے:

"میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلی کے ڈاک میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو" (۵)

ایک بار میرزا صاحب نے میر مہدی مجروح کے نام خط لکھا۔ ڈاکیے نے غلطی سے کسی دوسرے میر مہدی کو جا دیا۔ انھوں نے میرزا صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ اس اطلاع پر ارشاد ہوتا ہے:

(۱) اردوئے معلی ۸۸، (۲) ایضاً ۱۵۲، (۳) ایضاً ۱۶۵، (۴) ایضاً ۱۸۶، (۵) ایضاً ۲۳۵۔

"وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہمنام کے ہاتھ جا پڑا، صاحب تصور تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا میر مہدی بھی؟ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں نہ کوئی اپنا ہمنام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا، نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا۔"(۱)

ابتدائی مراسلت میں نواب فردوس مکاں کے فرامین جامع مسجد کے پیچھے سے بٹ جاتے تھے، حالانکہ میرزا صاحب ساٹھ آٹھ برس سے بلیماروں میں چلے آرہے تھے۔ اس کے باوجود یہ فرامین میرزا صاحب کو ملتے رہے جب خود انھوں نے سرکار کو لکھا کہ:

"در دیرینہ خاص بہ عنوان نامہ ہای بینشان نشان کلبۂ این دردمند و لریش عقب مسجد جامع بنشستہ اند و من از ہفت ہشت سال در محلۂ بلیماران می مانم۔ سپس نشان این محلہ نگاشتہ شود۔"(۲)

اور اس پر سرکار نے اہل دفتر کو ہدایت فرمائی، تو یہاں سے خط بلیماروں کے پتے پر بھیجے جانا شروع ہوئے۔

۱۔ اردوئے معلیٰ: ۹۸ (۲) مکاتیب: ۱۰۹ ۔

متعلقاتِ انشا

اس بحث کے آخر میں بعض ایسے حالات کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جو بظاہر میرزا صاحب کے عادات و خصائل کی ایک کڑی معلوم ہوتے ہیں، لیکن اُن کی انشا کی کیفیت و کمیت کے اندازے کے لیے اُن کا مطالعہ افادے سے خالی نہیں، اور اس لیے انھیں متعلقاتِ انشا کے عنوان سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

جواب میں جلدی

خطوط کا جواب دینے میں میرزا صاحب بہت باضابطہ تھے۔ وہ یوں تو ہر خط کا جواب فوراً لکھتے، اور غیر اختیاری عذر کے علاوہ کسی اور عذر کو پیش کرنے کا کبھی موقع نہ آنے دیتے، لیکن ضروری اور جواب طلب خط کے جواب میں بے حد جلد بازی سے کام لیتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ یہ جانتے ہوئے کہ اب ڈاک کا وقت گزر چکا ہے، جواب لکھ لیتے اور مکتوب الیہ کو بتا دیتے کہ اس مجبوری کے سبب آج خط سپرد ڈاک نہ ہو سکا۔ مثلاً بجنبر کو تحریر کیا ہے:

"جناب عالی، آج دوشنبہ ۳ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا ...... غزدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا ...... باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا"۔(۱)

شفق کو لکھا ہے:

"خداوند نعمت، آج دوشنبہ ۷ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے

۱۔ اردوی: ۲۷۵۔

اسی وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، خط تمہارا پہنچا۔ اُدھر پڑھا، اِدھر جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا۔ خط کو سر بمہر کر رکھتا ہوں۔ کل شنبہ ۱۲ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔"(۱)

علائی کو لکھتے ہیں:

"آج یوم الخمیس ۱۹ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ اُدھر پڑھا، اِدھر جواب لکھنے بیٹھا۔"(۲)

ایک بار مجروح کا خط صبح کی ڈاک سے موصول ہوا۔ میرزا صاحب نے اس کا فوراً جواب لکھا اور اس میں تحریر کیا:

"آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں، نہر بند پی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔"(۳)

انجمن کو لکھتے ہیں:

"اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو باتیں کرنے کا مزا ملا، تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔"(۴)

تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"آج سہ شنبہ پارکو دو پہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا، اور جواب لکھا، اور کلیان کو دیا وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔"(۵)

معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء تک ڈاک کا ہرکارہ تقسیم و جمع خطوط دونوں کام کیا کرتا تھا۔ میرزا صاحب نے تفتہ کے خط میں لکھا ہے:

"اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے

۱۔ اردوئے معلی: ۵۱ (۲) ایضاً: ۳۱۲ (۳) ایضاً: ۱۸۰ (۴) ایضاً: ۱۹۳ (۵) ایضاً: ۸۰

ہرکارے کو دیا۔"(۱)

عذر تاخیر

چونکہ میرزا صاحب خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیا کرتے تھے، اس لیے اگر ان کا کوئی دوست اپنے نیاز نامے کا جواب نہ پانے کی شکایت لکھتا، اور فی الحقیقت کسی وجہ سے جواب میں "تاخیر ہو جاتی" تو میرزا صاحب فوراً عذر تاخیر لکھ دیتے۔ لیکن اگر شکایت بے بنیاد ہوتی، تو اپنے اوپر کبھی ذمہ داری نہ لیتے اور صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار میر احمد حسن مودودی نے شکایت کی کہ آپ نے میرے کئی خطوں کا جواب نہیں بھیجا اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمے باقی نہیں ہے دو باتیں ہیں جو خط کا جواب نہیں پہنچا، (۱) کو یہ سمجھے کہ وہ خط راہ میں تلف ہوئے، اور میرے پاس نہیں پہنچے۔"(۲)

ایک بار اپنی عادت کے خلاف تفتہ کے خط کا جواب دوسرے دن لکھا، تو تاخیر کی تلخی کو ظرافت کی چاشنی سے بدلنے کی بھی کوشش کی۔ فرماتے ہیں:

"بندہ پرور، آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا۔ کتنا شتاب لکھتا ہوں۔"(۳)

اسی طرح مجروح کے خط کے جواب میں کئی دن کی دیر ہو گئی، تو انھیں لکھا:

"واہ سید صاحب! تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں، مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بسبب ابر کے وہ سردی نہیں، تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے۔"(۴)

(۱) اردوئی: ۸۰ (۲) ایضاً: ۴۰۲ (۳) ایضاً: ۲۲۹ (۴) ایضاً: ۷۸۱

ایک بار مہر کو خط لکھا، اور بکس میں رکھ لیا۔ کئی دن کے بعد بکس کھولا تو خط برآمد ہوا۔ اس کے متعلق انھیں تحریر فرماتے ہیں:

مرا بسادہ دلیہای من تواں بخشید — خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

کل دوشنبہ کا دن ۲۰ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا، اور بیرنگ ڈاک میں بھیج دیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمھارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا، کچھ شکوے سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ نکالنے لگا۔ بکس میں سے وہ تمھارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں، اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔ اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو[1]۔

ایک مرتبہ میرزا صاحب نے تفتہ کو خط لکھا۔ اُن کی طرف سے جواب نہ ملا۔ بلکہ خط آیا تو الٹی خط نہ بھیجنے کی شکایت درج تھی۔ میرزا صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آج پنجشنبہ کے دن ۱۰ نومبر کو تمھارا خط آیا، اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمھارا خط پہنچتا ہے، اور میرا خط نہیں پہنچتا[2]"

لیٹے لیٹے لکھنے

میرزا صاحب شدتِ مرض اور زیادتی ضعف کے باعث نشست و برخاست کی قوت نہ ہونے کی حالت میں بھی جوابِ خط سے دوستوں کو محروم رکھنا گوارا نہ کرتے، اور لیٹے لیٹے جواب لکھتے تھے۔ ایکبار فروری

۱۔ اردوی: ۲۵۵ (۲) ایضاً ۱۷۱۔

سنہ ۱۸۵۴ء میں تپ و لرزہ کا شدید دورہ ہوا۔ ابھی مرض کی شدت باقی تھی کہ تفتہ کا خط آ گیا۔ میرزا صاحب نے اسی حالتِ ضعف میں جواب دیا، اور اس میں لکھا:

"میں چار دن سے لرزہ میں مبتلا ہوں۔ ...... اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جرِ ثقیل لکھی گئیں۔"۱

صاحب عالم مارہروی کو بحالت بیماری لکھا ہے:

"جو کچھ لکھتا ہوں، سو وہ بھی اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔"۲

اسی طرح ایک مرتبہ مجروح کا خط آیا، تو میرزا صاحب کو اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ اسی حالت میں جواب لکھ کر آخر میں فرمایا:

"بارہ پر دو بجے ہرکارے نے آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا، اور اسی طرح جواب لکھا۔"۳

سنہ ۱۸۶۳ء میں تقریباً سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا، اور بالخصوص سیدھے ہاتھ کے پھوڑے کی تکلیف سے روح تحلیل ہوئی جاتی تھی۔ اس حالت میں بھی خطوں کے جواب برابر بھیجتے رہے۔ [illegible] کو لکھتے ہیں:

"اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف۔ خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو خط چودھری صاحب کے آئے، اور ایک خط شاہ عالم صاحب کا، اور دو خط حضرت صاحب کے آئے، جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو طعنے دے کر مرد بنایا، جب یہ عبارت لکھی۔"۴

انھیں کے ایک خط میں اشعار کے حسن و قبح کا معیار بتاتے ہوئے آتش و ناسخ کا ذکر کرتے ہیں۔ استشہاد میں اُن کا کوئی شعر نہیں آتا، تو کہتے ہیں:

۱۔ اردوی معلیٰ: ۷۵۔ ۲۔ ایضاً: ۳۰۲۔ ۳۔ عود: ۱۵۴۔ ۴۔ اردوی: ۱۵۱۔

یاد کیا آوے۔ لیٹا ہوا ہوں۔ دمبدم پانو کے ورم کی ٹیس ہوش اڑائے دیتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[1]

اسی زمانے میں نفتہ کو لکھا ہے:

میں ناتوان بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں"[2]

ضعف کے سبب مراسلت میں کمی

جب بوجہ پیرانہ سالی میرزا صاحب کا ضعف روز افزوں ہونے لگا، تو مجبوراً مراسلت میں کمی کرنی پڑی۔ تاہم اس حالت میں یہ کبھی نہ ہوا کہ کسی جواب طلب کا جواب نہ دیا ہو۔ ہاتھ میں رعشہ اور بینائی میں نقصان آجانے کے بعد اخبارات میں اپنی اس حالت کا اعلان کر کے ارباب ادب سے التجا کی تھی کہ آیندہ جواب خط اور اصلاح اشعار سے معاف رکھا جائے۔ اس پر بھی برابر خطوط چلے آتے تھے۔ میرزا صاحب بے تکلف دوستوں کے منتظر رہتے۔ جب ایسا دوست آجاتا، اس سے جواب لکھا دیتے۔ ایک بار رضوان نے کوتاہ قلمی کی شکایت کی۔ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مرزا! رسم تحریر خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا تارک نہیں ہوں، بلکہ متروک ہوں۔ . . . . . اگر تمہارے خط کا جواب نہ لکھوں، تو محل ترحم ہے، نہ مقام شکایت"[3]

اپریل سنہ ۱۸۶۷ء میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد! آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا، بینائی میں بڑا فتور پڑا، حواس مختل ہو گئے، جہاں تک

۱۔ اردوی: ۱۰۵ (۲) ایضاً: ۴۹ و (۳) ایضاً: ۳۲۱۔

ہو سکا، احباب کی خدمت بجالایا، اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبر سنی کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اشعار مجھ پر معاف کر دیں خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھوا دیا کروں گا۔ زیادہ حد ادب ۔"[1]

ذکا نے کیفیتِ مزاج دریافت کی، تو اُس سپہر دُر فشانی فرماتے ہیں:

"تم میری بات پوچھتے ہو، مگر میں کیا لکھوں! ہاتھ میں رعشہ، انگلیاں کہنے میں نہیں، ایک آنکھ کی بینائی زائل جب کوئی دوست آجاتا ہے، تو اُس خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔"[2]

جون سنہ ۱۸۶۷ء میں سیاح کو اپنی حالت لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعف بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔"[3]

انھیں کو اگست ۶۷ء میں لکھا ہے:

"آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاتھ میں رعشہ آنکھوں میں ضعفِ بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے، تو اُس سے جواب لکھوا لیتا ہوں۔ بھائی، میں تو اب کوئی دن کا مہمان ہوں۔ اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں؟ ہاں اکمل الاخبار اور شرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں، ۲، ۴ روز مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو اُن کے اخبار

۱۔ عود ہندی: ۳۴۲ ۲۔ ایضاً: ۴۱ ۳۔ ایضاً: ۳۳

میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے، اور اس میں میں نے عذر چاہا
خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اس پر کسی نے
عمل نہ کیا۔ اب تک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا ہے اور
اشعار اصلاح کے لیے چلے آتے ہیں، اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔
بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔"(۱)

نواب میر غلام بابا خاں بہادر نے کبھی کبھی اطلاع خیریت کی خواہش کی تھی۔ انھیں ۴ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں:

"آپ جو فرماتے ہیں کہ تو اپنی خیر و عافیت کبھی کبھی لکھا کر، آگے تو یہ طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا، اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی، ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو گیا، بینائی ضعیف ہو گئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے، تو میں مطلب کہتا گیا، وہ لکھتے گئے۔"(۲)

سید احمد حسن مودودی کو کسی دوست نے اطلاع دی کہ اب مرزا صاحب کو افاقہ ہے۔ انھوں نے مرزا صاحب سے اس کی تصدیق چاہی۔ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

"جو آپ نے سنا ہے کہ اب غالب کو مرض سے افاقہ ہے، سو محض غلط ہے۔ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ خط نہیں لکھ سکتا، ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ جو میں کہتا گیا ہوں وہ غریب لکھتا گیا ہے"(۳)

اپنی اس مجبوری کے زمانے میں مرزا صاحب دوستوں اور شاگردوں کے خطوط کی طرح اعزہ کے خطوط کا جواب بھی مشکل دیا کرتے تھے۔ عارف کے بھتیجے باقر علی خاں کامل، جنھیں بیٹوں کی طرح پالا تھا، روزگار

۱۔ اردوئے معلی: ۲۰۰؛ (۲) ایضاً: ۸۰۳؛ (۳) ایضاً: ۴۴۶

کی تلاش میں آوارہ گئے اور دلی میں بیوی اور ایک بچی چھوڑ گئے۔ میرزا صاحب سے امید تھی کہ اپنی اور بہو اور پوتی کی خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہیں گے۔ میرزا صاحب اُن کو بھی تا خیر سے جواب دیتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے شکایت کی۔ میرزا صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

"مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا، بھائی، اب میری انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں، اور بصارت میں بھی ضعف آ گیا ہے۔ دو سطر بھی نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آ جاتا ہے، میں اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اُس وقت مرزا یوسف علی خاں آ گئے۔ میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا۔"(۱)

۱۔ اردوی: ۲۳۱۔

املاے غالب

میرزا صاحب کی نوشتہ تحریروں اور اصلاحوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صحتِ املا کا بڑا خیال تھا۔ خود بھی غلطیِ املا سے پرہیز کرتے اور شاگردوں سے بھی اسی توجہ کے متوقع رہتے تھے۔ اگر شاگرد معمولی غلطی کا مرتکب ہوتا تو صرف اصلاح پر اکتفا کرتے، ورنہ غلطیِ اصلاح کا نکتہ بھی واضح کر دیتے تھے۔ ایک بار جنون بریلوی نے فارسی کے ماضی قریب کے صیغۂ واحد حاضر کو "ی" کے ساتھ لکھا۔ آج کل اہلِ ایران اسی طرح لکھتے ہیں، مگر اس زمانے میں ایسا دستور نہ تھا۔ اس کی اصلاح میں ارشاد فرمایا ہے:

"پروردہ، رفتہ، یہ جتنے الفاظ ہیں ان میں یائے تحتانی نہیں لکھتے بس وہی ہائے ابنائی حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے، تو تو رفتہ، بردہ اس صورت پر رہے گی۔ اور اگر اس کو حرکت لازم آئے، تو علامتِ حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے گا۔ رفتۂ، آمدۂ اور ان مفعول کے سب صیغوں کا یہی حال ہے۔"(۱)

شیو نراین کو تحریر کیا ہے:

"ہر چند کہ تم کو مشاہدہ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل رہتا ہے، یہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمھاری عبارت میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ خدا چاہے، تو املا کی غلطی کا ملکہ زائل ہو جائے۔"(۲)

۱۔ خطوط: ۱۰۱۹؛ (۲) اردوی: ۱۸۴ ۵لہ

لفظ کے شروع میں واقع ہونے والے الف مضموم کے علاوہ ہر جگہ اعراب بالحروف کو ناپسند کرتے تھے۔ پنجاب کے کاتب نے "مہر و مہ" کو "مہر و ماہ" اور "اسی" کو "ایسی" لکھا تھا۔ انھوں نے اس کتابت کو غلط قرار دیتے ہوئے "مہر و مہ" بحذف الف، اور "اسی" بحذف یا اپنے قلم سے بنا دیا ہے۔

"سینہ" کا املا بھی بحذف "ی" پسند کرتے تھے۔ خود ان کی اپنی تحریروں میں "سینہ" موجود ہے(۱) لیکن نواب فردوس مکاں کے اس شعر میں

آکر ترے کوچے میں یہ کچھ ہم سے بن آئی جاتے تھے اک سینہ تھا کہ بہہ ساگئیں آنکھیں

سینہ کو "سنہ" بنایا ہے۔

عام طور پر "پہنچنا" اور اس کے مشتقات میں "ہ" کے بعد لوگ "و" لکھا کرتے ہیں۔ میرزا صاحب کے خود نوشتہ خطوں میں بھی کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے، مگر ایک جگہ کے علاوہ انھوں نے "پہونچنا" کبھی نہیں لکھا۔

انتخاب دیوان [illegible] اور ناظم و پنجاب کے مسودوں کے کاتبوں نے بھی جہاں کہیں واو کے ساتھ لکھا تھا، میرزا صاحب نے اس کی ہر مقام پر اصلاح کی ہے۔

ناظم کا ایک شعر ہے:

واں کے جانے سے رکے اور آگئی فصل بہار

لو مبارک جمع پھر وحشت کے ساماں ہوگئے

کاتب نے اس میں "رد کے" لکھا تھا، میرزا صاحب نے "د" قلمزد کر دیا ہے۔

ایک شعر میں "دوکان" تحریر ہو گیا تھا۔ اس کا بھی واو کاٹ دیا ہے۔

---

(۱) مکاتیب: ۴۰۔ ۹۴ (۲) انتخاب غالب اردو قلمی: ۹۳۔

بیتابؔ کے اس شعر میں:

پھکا جاتا ہے دل سینے میں، اللہ چھپاؤں کب تلک سوزِ نہاں کو؟

کاتب نے "پھوکا" جاتا ہے" لکھ دیا تھا۔ اس میں سے بھی میرزا صاحب نے واو نکال دیا ہے۔

خود میرزا صاحب کے انتخاب دیوان اردو میں کاتب نے لکھا تھا:

"کھولتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ"

اسے میرزا صاحب نے "کھلتا" بنایا ہے۔[۱]

"خور اور خورشید" کا عام املا یوں ہی ہے۔ میرزا صاحب خورشید کو بے واو اور خور کو صرف خر سے التباس دور کرنے کے خیال سے بواو لکھا کرتے تھے۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ پارسی قدیم میں "خُر" بضم الخا، نور تاہر کو کہتے ہیں۔ "شید" بکسر شین کے معنی روشنی ہیں۔ ایرانی آفتاب کو بعد از خدا بزرگ جانتے تھے، اس لیے اُنھوں نے سورج کو خُر اور خُرشید کہا۔ جب عرب و عجم مل گئے، اہلِ عرب نے واسطے دفعِ التباس کے "خُر" میں واو معدولہ بڑھا کر "خور" لکھنا شروع کیا۔[۲]

"منہ" کا پرانا املا "مونہ یا مونہہ" ہے۔ نواب ناظم کے مسودوں میں

---

(۱) انتخاب غالب اردو قلمی: ۳۲ (۲) رضا قلی ہدایت نے فرہنگ انجمن آرای ناصری و لفظ "خر" میں لکھا ہے: "نام آفتاب و متاخرین برای آں کہ بکلمہ خر مشتبہ نشود بواو نویسند، لیکن در زبان قدیم بے واو بود۔" اس سے میرزا صاحب کی رائے کی تائید ہوتی ہے، مگر ڈاکٹر عبداللطیف صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اس مسلک کی جو توجیہ کی ہے، وہ درست نہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ قدیم فارسی میں "خُر" کی "خ" کو پیش تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران کی پرانی زبان میں بعض لفظوں کا پہلا حرف ساکن ہوتا تھا۔ چنانچہ خور اور خود وغیرہ کی "خ" ساکن تھی اور "واو" مفتوح، یعنی "خ و" آپس میں مل کر ایک ذہری آواز پیدا کرتے تھے۔ آگے چل کر جب ابتدا بسکون فارسی زبان میں ترک ہو گئی تو "و" کی تبدیلی ہو کر تلفظ میں ایک ضمہ باقی رہ گیا کہا جانے لگا، اس لیے بالکل "معدولہ" واو قرار دیا گیا۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ عربوں نے واسطے دفع التباس کے واو معدولہ بڑھا کے خور لکھنا شروع کیا۔ عرب کی زبان میں نہ خور کو دخل ہوا نہ خورشید کو، اور نہ خر ان کی زبان میں داخل تھا، پھر ان کو التباس کے دور کرنے کی فکر کیوں ہونے لگی۔" (مقدمہ خطوط صفحہ نہم)

متعدد جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ اسے کاتب نے "مونہہ" لکھا ہے
میرزا صاحب نے ایک جگہ کو مستثنیٰ کر کے "مُنہ" بنا دیا ہے۔
(۴) فارسی اور ہندی لفظوں کے املا میں عربی کے مخصوص حروف ث، ح، ص، ض، ط، ظ، ع، استعمال نہیں کرتے تھے۔ سیاح کو لکھتے ہیں:

"عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو اس کو سمجھنا کہ عربی ہے . . . . . . جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے، طوی بھی نہیں ہے، مثلاً تفتہ لغت فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوی سے غلط ہے۔"(۱)

بتیاب نے "طمانچہ" اور "طنبور" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے طمانچہ کو "تپانچہ" بنا دیا، اور طنبور کے بارے میں یہ لکھا:

"یہ لفظ طوی سے نہیں، تے سے ہے۔ اور پھر تنبور بوزن تیمور نہیں۔ دراصل تنبرہ بوزن سہ ذرہ ہے۔"(۲)

میرزا صاحب "ذ" کو بھی عربی مخصوص حرفوں میں شمار کرتے، اور کبھی کسی فارسی لفظ میں "ذ" نہیں لکھتے تھے۔ بتیاب کے مسودے میں "خذف" تھا اسے "خزف" بنا کر لکھا ہے:

"خزف بمعنی ٹھیکری کے لغت فارسی اور املا اس کی زے سے ہے۔"(۳)

گذشتن، پذیرفتن، وغیرہ فارسی مصادر کے تمام مشتقات میں "ذال" جو مروج ہے، میرزا صاحب نے "ز" استعمال کی ہے۔ ناظم نے "سرگذشت" لکھ دیا تھا، تو اسے "سرگزشت" بنایا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں:

"گذشتن، گذاشتن، پذیرفتن، یہ سب لفظ ذال سے ہیں۔ البتہ گزاردن زے سے صحیح ہے۔ میرزا غالب نے پہلے نادانی سے پھر سخن پروری

(۱) مقدمہ خطوط: ۵، اردوی معلی: ج ۲، ۲۴۴ (۲) مکاتیب: ۱۰۴ (۳) ایضاً ۱۰۵۔

اور سینہ زوری سے "ذ" کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی اردو میں یہ لفظ "ز" سے لکھیے، تو مضائقہ نہیں، مگر فارسی میں "ذ" لکھنا ضروری ہے۔"(۱)

اس قاعدے کی انھوں نے اتنی پابندی کی ہے کہ اُن عربی لفظوں میں عربی کے مخصوص حروف نہیں لکھتے، جو اپنے معنی کی بنا پر منہ یا فہنّد بن گئے ہیں، جیسے طیّار اور ذرّا۔ طیّار کے بارے میں قدر بلگرامی کو لکھا ہے:

"طیار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لغتِ عربی، املا اس کی طائے حطّی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بازداروں میں اس لفظ نے جنم لیا، حقیقت بدل گئی، طوی، تے بن گئی، یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا، بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ "فلاں باز" "تیار شدہ است، صید خواہد گرفت"

بہرحال اب تائے قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا۔ اس لفظ کو مستعد ہشیار اور اصل اردو اور تیاری قرشت بمعنی آمادہ، اشخاص اور اشیا پر عام تصور کرنا چاہیئے۔"(۲)

"ذرا" اصلاً عربی ہے اور اس کا املا ذرّہ ہے۔ پہلے اردو محاورے میں بتشدید بھی بولا جاتا تھا۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی آفتاب تخلص کا مقطع ہے

اے آفتاب دل کو ذرّہ نہ چین آس بن   اس رشکِ مہ کو جلدی مجھ سے کوئی ملا

دوسرے مقطع میں بھی اسی طرح باندھا ہے:

---

(۱) حاشیہ دستور الفصاحت، ص ۱، پر ڈاکٹر صاحب نے یہ مختصر بیان لکھ کر مزید کچھ نہیں کیا ہے۔

(۲) خطوط: ۱، ۱۸۱۔ مگر خان آرزو کا بیان ہے "چراغ ہدایت" و "گلشن رضا" کہ طیار عربی بمعنی پرندہ ہے، لیکن ایرانی آمادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور یہ بطور مجاز ہے کے نزدیک ایک صورت یہ بھی ہے کہ تیار عربی میں بمعنی جہندہ ہے، بمعنی آمادہ جو فارسی میں آتا ہے ممکن ہے یہی ہو۔ آرزو کا قول صحیح ہے، تو غالب کا بیان کہ آمادہ کے معنی میں اردو ہے قابل نہیں اور اس کا املا ت اور ط دونوں سے ہو سکتا ہے۔" (معاصر ح ۸ نمبر ا ص ۲۰)

یک ذرہ تسلی نہ ہو خورشید جہاں کو — اک بوسہ بھی جب تک ملے انعام نہ ہوگا

اگرچہ اب تنہا مشدد نہیں بولتے، لیکن کسی ایسے لفظ کے ساتھ آئے، جو وزن یا ناپ کو ظاہر کرتا ہو، تو ذرہ ہی تلفظ کرتے ہیں، جیسے "کسے مہری ذرہ بھر پروا نہیں ہے" ظاہر ہے کہ یہ تشدید وہیں باقی رہ گئی ہے جہاں حقیقی معنے مراد ہیں۔ پس اس لفظ کو موجودہ معنی کے لحاظ سے اردو اور مستحدث کہا جائے گا۔ میرزا صاحب اسی کے قائل تھے اور ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں انھوں نے "ذرا" ہی لکھا ہے(۱)

(۵) جن فارسی الفاظ کے آخر میں الف یا واو کے بعد "ی" آتی ہے، خواہ اصلی ہو یا اضافت وصفت کی علامت، عام کاتب اس "ی" پر ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے عقل کو گالی دینا جانتے تھے۔ تفتہ کے خط میں صراحت فرماتے ہیں:

"دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو؟ . . . غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے۔ یاد رکھو، یای تحتانی تین طرح پر ہے۔

(۱) جزو کلمہ

همای بر سر مرغان ازان شرف دارد
ای سر نامہ نام تو عقل گرہ کشای را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یای تحتانی ہے، جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

(۲) دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے آسیای چرخ یا آشنای قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا فدای تو شوم، رہنمای تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

(۱) اردوئے معلیٰ: سوم دیوان غالب کے خوشخط قلمی نسخے میں ایک جگہ کا تب نے ذرا کو ذال سے لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے یہاں بھی ذال کا سر جاتو سے چھیل کر زرا بنا دیا ہے۔

ناظم کے مسودے میں "گلہ" بنا دیا ہے۔ اس سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ آخر عمر میں عربی فارسی کے ان لفظوں کو بھی جو اردو میں گھل مل گئے ہیں، ہائے مختفی سے لکھنا پسند کرتے تھے۔

(۸) اردو کے جن الفاظ میں الف یا واو مدہ کے بعد "ی" واقع ہوتی ہے۔ جیسے جائے، یا ہوئے، میرزا صاحب کی تحریروں میں ان کی کتابت بھی یکساں نہیں ہے۔ وہ کبھی انھیں بے ہمزہ کے اور کبھی ہمزہ کے ساتھ "جائے"، "ہوئے" لکھتے ہیں۔ اسی طرح یائے مدہ کے بعد "ی" ہو جیسے لیے، کیے تو یائے اول کو کبھی بصورت ہمزہ، کبھی بصورت یا اور کبھی "ی" اور ہمزہ دونوں کے ساتھ لکھا ہے۔

لیکن نواب ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں "کیجیے، دیکھیے، چاہیے، پوچھیے، ہمسائے، آجائے، لائے، لگ جائیگی، آئے ہو، ہوئے، پھیلا دیئے" وغیرہ میں سے ہمزہ کو قلمزد کر دیا ہے۔ یہ اس پر دال ہے کہ میرزا صاحب ان لفظوں کو بے ہمزہ کے انسب جانتے تھے۔

(۹) نون غنہ کے استعمال میں میرزا صاحب نے احتیاط کی ہے۔ پانو کا املا تین طرح کا مروج تھا: پانو، پانوں، پاؤں۔ میرزا صاحب اول الذکر کو صحیح اور باقی دونوں کو غلط کہتے تھے، چنانچہ ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں جگہ جگہ یہ اصلاح موجود ہے۔ جنون بریلوی نے پاؤں لکھا تھا۔ ان کو بتاتے ہیں کہ پاؤں کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو درست ہے۔[1] اور کسی شاگرد نے "پانوں" تحریر کیا تھا۔ اسے لکھتے ہیں:

"پانو، گانو، اور چھانو کا ہے۔ آگے اس کے نون لکھنا غلط ہے مگر ہاں بجمعہ جمع یوں لکھنا چاہیے، پانوؤں "۔[2]

"پوچھنا" کو بیتاب اور نواب ناظم کے کاتبوں نے "پونچھنا" لکھا تھا۔

---

1 خطوط ۱: ۱۱۸۲ (؟) خطوط [illegible] میں ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں۔

"پانو، گانو، چھانو، دانو کی یہ املا لکھنا بہتر ہے، اس لیے کہ ایک تو غنہ یہاں حقیقت میں الف میں ہے۔ دو [illegible] جمع کی [illegible] الفاظ [illegible] صورت اول ہوتی ہے پانوں، گانوں [illegible]

میرزا صاحب نے اس غلطی کی بالالتزام اصلاح کی ہے۔

"دونوں" کو بعض صحّاف "دونو" بے نون آخر لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے نون کے ساتھ لکھتے تھے۔ مذکورۂ بالا مسودوں میں بھی اس لفظ کی اصلاح کی ہے۔

"بھونکا" کا تلفظ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ واو کے بعد نون غنہ محسوس ہوتا ہے۔ بیتاب کے کاتب مسودۂ دیوان نے بھونکا لکھ دیا تھا۔ میرزا صاحب نے اسے نون غنہ سے پاک کر کے بھوکا بنا دیا ہے۔

(۱۰) ہائے مخلوط کی کتابت میں شاید فصحائے دہلی کے تلفظ کا لحاظ زیادہ رکھا ہے۔ چنانچہ نثر پنہاں میں اُن کے نزدیک ہائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے "یہاں" کے مخفف "یاں" کو دلی والے "یہاں" بولتے تھے۔ میرزا صاحب نے اس تلفظ کو افصح قرار دیا ہے۔ "بگھارنا" کی جگہ "بگھارنا" اور "گڑ پھنکیا" کی جگہ "گڑ پھنک" یا "گڑ پھنک" تلفظ کا اتباع معلوم ہوتا ہے۔ "ٹھہرنا" دلی میں ٹہرنا بولا جاتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میرزا صاحب ہمیشہ ایک "ہ" سے لکھتے ہیں۔ ناظم نے لکھا تھا

"جو آگئے ہو مرے گھر تو کوئی دم ٹھہرو"

میرزا صاحب نے اسے "ٹہرو" بنایا۔ بیتاب کا شعر تھا:

کیسا مزہ دکھاتے ہیں ہم بھی تو ٹھہر جا | تقریر میں کر کے اور یہ ناصح تو ہو گیا

اس میں میرزا صاحب نے "ٹہر تو جا" اصلاح دی۔

مخلوط "ھ" جب لفظ کے آخر میں آتی ہے تو اس کی آواز بہت ہلکی

بھلا اس کے اگر واحد کی لکھاوٹ "پاؤں" یا "پانو" قرار دیجیے تو جمع محرف "پانوؤں" یا "پاؤں" بنتی ہے جو ہرگز قبول کرنے کے لائق نہیں"۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا استدلال قوی نہیں۔ کنواں، دھواں، رواں، جوں کی جمعیں کنویں، کنووں، دھویں، دھووں، رویں، رووں اور جویں، جووں ہیں۔ مذکورہ اصول کے پیش نظر ہم یوں کہتے "اس کنویں کا پانی شہر بھر کے کنواں سے بہتر ہے" حالانکہ کنووں سے بہتر ہے" سب کی بول چال ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ ان لفظوں میں الف اور "ؤ" دونوں کے بعد نون غنہ ہے، اس لیے بہتر املا چھانوں اور گانوں ہے۔

(۱۳) لفظ آئینہ جب فاعلن کے وزن پر نظم میں باندھا ہے، تو لکھا ہے "آینہ" لکھا ہے، "آئنہ" نہیں لکھا، اور یہی املا ناظم کو بتایا ہے۔ اسی طرح خامشی اور بیہدہ میں "و" کے اضافے کو منع کیا ہے۔

عربی الفاظ کا املا

مرزا صاحب عربی الفاظ کا املا اہل ایرانیوں کے انداز پر لکھتے تھے۔
(۱) تفتہ نے ایک شعر میں "جز لاینفک" لکھا تھا[1]۔ مرزا صاحب نے انہیں بتایا کہ بجائے اس کے "جزو لاینفک" لکھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا اس لفظ کو سہ حرفی بتانا درست ہے، لیکن اس کے آخر میں ہمزہ کی جگہ واؤ لکھنا مجہول کا دستور ہے۔ مولوی نجم الغنی خاں مرحوم لکھتے ہیں:
"تبدیلی حرفا چنانکہ در ... یعنی ابدال کردن و آفادہ ہمزہ آخر را بواو بدل کردند، و ہمچنیں در جزء یعنی پارۂ چیزی، بجای ہمزہ واؤ نویسند و خوانند مگر بشرطی کہ آں را مضاف نمایند، چون جزو کتاب یا جزو بدن والا در عبارت فارسی بدون ہمزہ نویسند"[2]
(۲) جن عربی اسم فاعل کے صیغوں میں الف کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے دائم، قائم وغیرہ، ان کا املا ہمزہ کے ساتھ ہے۔ مگر مرزا صاحب نے بیشتر "ی" کے ساتھ لکھا ہے اور اگر ہمزہ ہے تو "ی" کے اوپر۔ چنانچہ مائدہ کو مایدہ، مقتضیہ کو مقتضیہ، جائز کو جایز اور طائر کو طایر لکھا ہے[3]۔ لفظ قائل اور مائل کو پہلے قائل اور مائل لکھا تھا، اس کے تیس برس بعد قایل اور مایل لکھا[4]۔
(۳) یہی حال عربی کی ان جمعوں کا ہے، جو فعائل کے وزن پر آتی ہیں، مثلاً حقائق، دقائق۔ مرزا صاحب نے انہیں بھی حقایق، دقایق، طبایع وغیرہ لکھا ہے[5]، جو مجہول کی پیروی ہے۔
(۴) مولانا اور مولانا کی کتابت میں مرزا صاحب کے یہاں دو رنگی

(۱) مکاتیب: ۱۰۵ (۲) گنج الادب: ۲۰۸، ۲۰۹ (۳) مکاتیب: ۴۶ ... (۴) ایضاً ...
(۵) ایضاً ۴۰، ۶۵، ۷۰۔

پائی جاتی ہے۔ ایک مکتوب میں انھوں نے "مولانا" لکھا ہے۔ مگر اس کے سولہ دن بعد مولٰنا اور اولٰنا لکھا ہے(۱)

(۵) لفظ "مؤیّد" اور "رؤسا" کو بے ہمزہ کے "مویّد" اور "رسا" لکھا ہے(۲) یہ بھی تتبع ہے۔

اِملا کی غلطیاں

میرزا صاحب سے بعض الفاظ کے املا میں بھول چوک بھی ہوئی ہے۔ جو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ہر زبان کے لفظوں میں پائی جاتی ہے

(۱) اردو کا لفظ سوچنا ہے۔ اس کے مشتق "سوچ" کو انھوں نے "سونچ" اور سونچنا" لکھ دیا ہے(۲) اسی طرح "پہنچنا" کے مشتق "پہنچا" کو ایک جگہ "پونچھا" لکھ گئے ہیں(۳)۔ "گھٹا ہیں" ان کے قلم سے "گٹھا ہیں" بن گئی ہیں(۴) "اکھاڑ ڈالنا" کی جگہ "اکھاڑ ڈالنا" اور "فرمایئے" کی جگہ "فرمایئے" تشدید سے ہے(۵)

(۲) عربی کے معرف باللام اسموں سے پہلے حرف جر "ب" ہو، تو اسے لفظ کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بالکل، بالفعل، باللہ کو با لکل، با لفعل، اور با للہ تحریر کر دیا ہے(۶)

(۳) فارسی کے جن لفظوں میں الف کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے گنجایش آیندہ وغیرہ، اُن کا صحیح املا "ی" کے ساتھ ہے، اور اسی طرح میرزا صاحب نے لکھا ہے، مگر پایندہ اور فزایندہ کو "پائندہ" اور "فزائندہ" لکھ دیا ہے(۷)

خرسم کو خورسم بواو لکھ دیا ہے(۸)، حالانکہ اسی کے مرکب "خرمی" کو بغیر واو لکھا ہے(۹)

فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں "بد" آتا ہے، جیسے موبد، اسپہبد، ہ بفتح با صحیح ہیں۔ میرزا صاحب نے اسپہبد، کو اسپہبُد بضم با لکھ دیا ہے(۱۰)

، انگریزی الفاظ اپنے زمانے کے تلفظ کے مطابق لکھے ہیں۔ چنانچہ لارڈ کو

غیب: ۵۴ (۲) ایضاً: ۳۰، ۴۴ - (۳) ایضاً: ۳۱، ۷۰ (۴) ایضاً: ۷۱ (۵) ایضاً: ۶۷ (۶) ایضاً: ۶۸، ۴۸ (۷) ایضاً: ۲۱، ۲۳، ۳۷ (۸) ایضاً: ۱۰ - (۹) ایضاً: ۷۶ - (۱۰) ایضاً: ۳۶

"لارڈ" بورڈ" کو بوٹرڈ، ریونیو ریٹیو، سارٹیفکٹ کو سارٹیفکٹ، پنشن کو پنسن، کلکٹر کو کلکٹر، ہارڈنگ اور ڈلہوزی کو ہارڈنگ اور ڈلہوسی اور اسٹیشن کو اسٹیسن لکھدیا ہے۔

علامات اوقات

میرزا صاحب کی تحریروں میں پرانی علامات اوقات کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیراگراف کے آخر میں اکثر یہ علامت (ط) لکھتے ہیں۔ جو لفظ فقط کی مغرائی شکل ہے۔ کبھی بارہ کا ہندسہ (۱۲) بھی اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، جو لفظ "حد" کے عدد ہیں۔ اس ہندسے کے بارے میں لطیفے کے طور پر مہر کو لکھا ہے:

"صاحب، بندہ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔"(۱)

چند خطوں میں یہ علامت (سنجط) پیراگراف کے آخر میں لکھی ہے، جو لفظ بیاض کا مخفف ہے۔ یہ علامت بادشاہوں کے فرامین کے آخر میں بھی پائی جاتی ہے، جس سے غرض یہ تھی کہ آگے کوئی لفظ نہیں لکھا جاسکے، اور اگر کوئی لکھدے، تو جعلی متصور ہو(۲) رفتہ رفتہ نہ صرف کسی تحریر کے آخر میں بلکہ ایک پیراگراف کے ختم پر بھی بطور علامت خاتمہ لکھنے لگے۔

کبھی نئے جملے کے پہلے لفظ کے اوپر یہ شکل (ـــ) بناتے ہیں، جو عربی کے لفظ بت، بمعنی قطع کی شکل ہے۔ کچھ خطوں میں نئے پیراگراف کے آغاز میں بھی یہ علامت بنائی ہے۔

ایک دو خطوں میں میرزا صاحب نے نئے پیراگراف کو دوسری سطر سے شروع کیا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ وہ انگریزی طریق کتابت سے آگاہ تھے۔

ایک خط میں صفحہ ختم ہو جانے کے باعث کچھ عبارت حاشیے پر

---

(۱) اردوی: ۲۵۷ (۲) رسالہ صلای عام دہلی، مئی سنہ ۱۹۱۳ء ص ۲۸۔

لکھنا پڑی تھی۔ اس کے ربط کی طرف اشارہ کرنے کے لیے انھوں نے
(۱۵۱) کا ہندسہ متن کے آخر اور حاشیے کے شروع میں لکھا ہے۔

شعر یا مصرع کے پہلے یہ علامت (ہ) ضرور لکھتے تھے، جو لفظ
"بیت" کی مخفف شکل ہے۔ ایک بار نام و تاریخ لکھ دینے کے بعد کوئی
بات یاد آئی، تو اسے "لہ" لکھ کر تحریر کیا ہے[1]۔ عربی کا یہ فقرہ عموماً
مجموعہای اشعار میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے معنی ہیں
"اس کا"، اس لیے کسی ایک شاعر کے متفرق شعر لکھتے وقت ہر نئے
شعر سے پہلے "لہ" لکھ دیتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے
کہ یہ شعر بھی اسی شاعر کا ہے، جس کا شعر ابھی گزر چکا ہے۔ میرزا صاحب نے
اسے نثر میں بھی استعمال کیا ہے۔

حسابی رقوم

میرزا صاحب نے روپیوں کی تعداد ظاہر کرنے کے لیے حسابی رقوم
بھی لکھی ہیں، جو بسا اوقات تعداد ظاہر کرنے والے الفاظ کے اوپر لکھی
گئی ہیں، لیکن چند خطوں میں عبارت کے بجائے رقموں پر اور کچھ میں
رقموں کی جگہ عبارت ہی پر اکتفا کی ہے۔

میرزا صاحب نے سو روپے کی رقم کو اس طرح لکھا ہے: (ما عہ)
آج کل اسے ایک سو ایک پڑھا جائے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک
کی رقم (عہ) انگریزی کے لفظ بمعنی صرف کی جگہ لکھی گئی ہے، تاکہ کوئی
شخص جعلسازی سے سو کی رقم کے آگے کچھ بڑھا نہ سکے۔

۱۔ مکاتیب: ۸، ج ۱ (۲)، ایضاً: ۱۰۔

طباعت خطوط

میرزا صاحب کی ممانعت

سب سے پہلے منشی شیو نرائن اور تفتہ کو میرزا صاحب کے خطوط کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ ان دونوں نے علیحدہ علیحدہ میرزا صاحب کو اپنی تجویز سے مطلع کر کے اشاعت کی اجازت چاہی۔ اس عہد تک مراسلت میں انشا پردازی کے تمام اصول و ضوابط کا لحاظ ضروری شمار ہوتا تھا، اور میرزا صاحب کے خیال میں زبان اردو کے لیے اس بار گراں کا تحمل دشوار تھا۔ چنانچہ [illegible] صاحب کی فرمائش اردو کے جواب میں انھوں نے [illegible] تھا کہ اس زبان میں زور قلم صرف کر کے معانی نازک پیدا کرنا اور اس طرح اپنا کمال انشا ظاہر کرنا مشکل ہے۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کہاں، جو کوشش کی جائے؟ لہذا مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اردو مراسلت کا ذوق بڑھاپے کے لیے شروع کی تھی، اور اس وجہ سے کبھی قلم سنبھال کر اور دل لگا کر کوئی خط نہ لکھا تھا۔ ان یاران باصفا کی تجویز منظور کر لینے میں خطرہ تھا کہ کہیں کمال انشائے فارسی کے مداح اردو نثر دیکھ کر شکوہ سنجی پر نکتہ چینی شروع کرنے لگیں، اور اردو کا یہ پھیکا پکوان فارسی کی اونچی دکان کی شہرت پر دھبا نہ لگا دے۔ اس لیے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو منشی شیو نرائن کو جواب لکھا:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ

---

(۱) اردوئے معلیٰ، ص ۲۲، ۴۳ و ۶۶، ۳۴ پر دو خطوط کا مضمون یہی ہے جن میں میرزا صاحب نے اردو نثر لکھنے سے انکار کیا ہے، اور ساتھ ہی اس انکار کے وجوہ بھی بتائے ہیں۔

ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں؟ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے۔"۱

اسی اثنا میں تفتہ کا پُرزور نیاز نامہ آیا۔ اسے پڑھ کر ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو ادھر منشی شیو نراین کو لکھا:

"رقعوں کے چھاپے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں، البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور مرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے"۲

اور اُس طرف تفتہ کی ہٹ کے جواب میں مشفقانہ تحریر کیا:

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے، تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے"۳

اس کے بعد ان دونوں نے طباعت مکاتیب کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ارادۂ طباعت فسخ کر دیا گیا تھا۔

غالب کے خطوں کا پہلا مجموعہ: مہر غالب

اس واقعہ کے دو سال بعد سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں سرور اور منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے میرزا صاحب کی اجازت حاصل کیے بغیر ان خطوط کی طباعت کا تہیہ کیا، جو سرور کے نام میرزا صاحب نے لکھے تھے۔ ترتیب کا کام سرور کے سپرد ہوا اور طباعت کا ذمہ ممتاز علی خاں نے لیا۔ سرور نے کتاب کا نام مہر غالب رکھ کر اس کے

---

۱ اردوئے معلیٰ: ۱،۲،۳ (۲)، آہنگ: ۱۰۵۔

دیباچے میں لکھا ہے:

"ارباب علوم کو معلوم ہو کہ سب ناساز ظہور، عبد الغفور متخلص بہ سرور مارہروی بدو شعور سے اہل سخن کا طالب اور صاحب کمال کا خواہاں تھا۔ جب کلام بلاغت نظام، مشکل کشائے مصائب فخر طالب، جناب اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا، دل کو بھایا، یکتا پایا۔ بہ سبیل مراسلات میں قدم بڑھایا، ہر گرانمایہ نامے کا جواب آیا .... جو نامہ کہ بنام میرے عنایت ہوا، اردو تحریر کیا، مکتوب سادہ روپوں سے دلربا تر ہے اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا، وہ بینا ہے، جس کان نے سنا، وہ شنوا ہے۔ بس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اٹھانا خلاف انصاف جانا۔ دل مائل تمام شہرت عام ہوا اور ہنوز یہ قصد ناتمام تھا کہ حسن اتفاق فخر زماں، وحید دوراں، جناب ممتاز علی خاں صاحب، متوطن میرٹھ ...... رونق افزائے مارہرہ ہوئے ...... ایک روز محفل ممدوح میں ذکر سحر دانی و شیوہ بیانی جناب استادی و مخدومی درمیان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلام میرزا صاحب نسیم جانفزا اور شمیم دلکشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا! اردو بھی یکتا ہے۔ نظم و نثر فارسی تو محلی بحلیۂ انطباع ہوا، لیکن نثر اردو زیور طبع سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کہ بنام تمھارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو تو میں اس کے انطباع کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔(۱) اس تقریر سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا، بشگفتگی

---

(۱) اگرچہ سرور نے سنہ ۱۸۶۱ء میں میرزا صاحب کے خطوط مرتب کر لیے تھے، لیکن دیباچہ لکھنے کی نوبت سنہ ۱۸۶۳ء میں آئی اس لیے کہ عود ہندی (ص ۲۰۰) میں میرزا صاحب کا ایک خط اس دیباچے کی تعریف میں درج ہے اور یہ سنہ ۱۸۶۳ء کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں میرزا صاحب نے [illegible] کا حوالہ دیا ہے اور ما قبل کا خط کنزیٹ ستور داو رام کی داستان پر مشتمل ہے، جو سنہ ۶۳ء کا واقعہ ہے۔

خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے، ترتیب دیے۔
گویا جواہر بے بہا کان قلمدان سے نکال کر سلک اوراق میں جمع کیے۔

چونکہ نسبت جناب غالب میرے خیال پر محبت غالب ہے، لہذا نام اس
انشا کا مہر غالب (بکسر میم) مناسب ہے، سال ختم تالیف بھی اس نام
سے مطابق پایا۔"

یہ تجویز منظور ہو گئی اور منشی ممتاز علی خاں میرٹھ چلے آئے۔ ابھی طباعت شروع نہ ہوئی تھی کہ انھیں خیال پیدا ہوا کہ میرزا صاحب کے مزید رقعات تلاش کر کے اس مجموعے میں شامل کیے جائیں۔ اس خیال کی تکمیل میں قدرت نے امداد کی اور انھیں ایک اور مجموعے کا پتا چلا، جو میرزا صاحب کے علم اور ان کی امداد سے مرتب کیا جا رہا تھا۔

غالب کے خطوں کا دوسرا مجموعہ

یہ مجموعہ بےخبر مرتب کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ارادے کی اطلاع میرزا صاحب کو پہلے سے دی تھی اور خواہش کی تھی کہ ان تمام خطوں کی نقول بھی مہیا کر دیں، جو دوسرے احباب اور شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ میرزا صاحب نے اس التماس کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت تک ان کا یہ خیال تھا کہ صرف وہ خط مرتب کیے جائیں، جن میں کوئی ادبی خوبی ہو۔ روزمرہ کی نجی ضروریات پر مشتمل خطوں کو خارج کر دیا جائے، اس لیے بےخبر کو جواب میں لکھا تھا:

"آپ کو معلوم ہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی
کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاح کے ہر شعر کے
تختے میں نشان اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں
لکھا جاتا ہے: وہ کہار آیا، خط لایا۔ آم پہنچے۔ کچھ بانٹے، کچھ کھا لیے۔۔"

(۱) عود ہندی: [illegible]

"بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام"
یہ تحریر اس ہفتے میں گئی ہے۔ غرضکہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب
یہ عبارت جو نظم کو لکھ رہا ہوں بیالیق سنمولی مجموعۂ نثر اردو کہاں ہے؟
یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے"[۱]

اسی زمانے میں نساخ کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کی نقل بیخبر کو روانہ کرتے ہوئے تمہیداً تحریر کرتے ہیں:

"پیر و مرشد، کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں مولوی عبدالغفور خاں
ان کا نام اور نساخ ان کا تخلص ہے۔ میری ان کی ملاقات نہیں انھوں
نے اپنا دیوان چھاپے کا موسوم بہ دفتر بے مثال مجھ کو بھیجا اس کی
رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثر اردو کے
لائق ہے۔ آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں"[۲]

مجموعۂ خطوط میں ان نجی خطوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ بیخبر نے ان کے اس مشورے کو نہ مانا، اور ہر قسم کے خط شامل مجموعہ کر لیے۔

مقام طباعت

میرزا صاحب کا خیال تھا کہ بیخبر اس مجموعے کو الہ آباد میں جہاں وہ مقیم تھے، طبع کرائیں گے، اس لیے ایک انگریز کے استفسار کے سلسلے میں بیخبر کو لکھا:

"جناب کمپس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف
خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اس کا
جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیج دیا۔ نثر کے
باب میں تمہارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا
ہے۔ بعد انطباع و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا"[۳]

(۱) عود ہندی: ۷۲ (۲) ایضاً: ۱۲۵ (۳) ایضاً: ۱۲۵۔

مگر بیخبر نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھا کہ منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے اپنے مطبع میں طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ میرزا صاحب ان بزرگ سے واقف تھے، اس لیے بیخبر کی اس خبر پر اطمینان ظاہر کیا، اور جب بیخبر نے دوبارہ اُن کا ذکر کیا، تو تحریر فرمایا:

"حضرت پیر و مرشد، اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے، اور وہ میرے دوست ہیں"۔[1]

طباعت میں تاخیر

بیخبر نے مکاتیب کی جمع و ترتیب کا کام سنہ ۶۱ء میں شروع کیا۔ میرزا صاحب کے مکتوب الیہوں میں سے جو بزرگ خود ان کے دوست تھے اُن سے براہِ راست، اور جن کی خدمت میں خود نیاز حاصل نہ تھا، اُن سے بتوسّطِ غالب خطوط کی نقلیں مہیا کیں اور سنہ ۶۵ء میں یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ لیکن میرزا صاحب نے، جو سنہ ۶۳ء کے بعد سے طباعت کا انتظار کرنے لگے تھے، آخرکار مجبور ہو کر تقاضا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک خط کے آخر میں بیخبر کو لکھا ہے:

"اور ہاں حضرت، وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح، یا چُھپے گا بالضم۔ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جنس جلد یں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے"۔[2]

احباب کے تقاضے

اس مجموعے کی ترتیب میں مختلف اصحاب کے پاس سے خطوط کی نقلیں منگائی گئی تھیں، اس لیے ملک میں اس کی شہرت ہو چکی تھی۔ جب اشاعت میں زیادہ تاخیر ہو گئی، تو میرزا صاحب کے پاس تقاضہ کے

---

(۱) عودِ ہندی: ۱۳۸ (۲) ایضاً: ۱۲۵

خطوط آنے لگے۔ ان تقاضوں سے پریشان ہو کر میرزا صاحب نے ۱۰ مارچ سنہ ۱۸۶۴ء کو بیجر کے نام حسب ذیل خط لکھا:

"ہاں، حضرت، کہئے، منشی ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہو گی؟ وہ مجموعہ اردو چھپے گا، یا چھپا ہی رہے گا؟ احباب اس کے طالب ہیں، بلکہ بعض نے مطلب کو بسرحد تقاضا پہنچا دیا ہے۔"[۱]

پنجاب احاطے کی مانگ

ان تقاضا کرنے والے احباب میں سب سے زیادہ حصہ زندہ دلان پنجاب نے لیا تھا۔ ان سے مجبور ہو کر میرزا صاحب نے منشی ممتاز علی خاں کو ملزم ٹھہراتے ہوئے بیجر کو تحریر کیا:

"بھی حضرت، یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطے میں اس کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب ودھی پارسل ہو۔"[۲]

میرزا صاحب کا دیباچہ

غالباً اس کے جواب میں بیجر نے میرزا صاحب کو لکھا کہ آپ مجموعۂ نثر اردو کے لیے دیباچہ لکھ کر روانہ فرمائیں، تو تمام مسودہ مطبع کو بھیجی جائے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے تحریر فرمایا:

"میں صاحب فراش ہوں، اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں گا؟"[۳]

بیجر نے اس کے بعد بھی دیباچہ لکھنے کی درخواست کی تو انھیں ظریفانہ

(۱) عودہ: ۲۴۴، (۲) ایضاً: ۲۴۵، (۳) ایضاً: ۲۴۸۔

انداز میں لکھا:

"بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم کو عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے، تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے، تو اس مجموعے کا چھپنا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ، یعنی مالکانِ تحریر، میں سے ہیں۔ پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے؟"

عودِ ہندی

تجر نے میرزا صاحب کا عذر تسلیم کر کے اپنے جمع کردہ خطوط منشی ممتاز علی خاں کے پاس بھیج دیے۔ منشی صاحب نے سرور اور تجر کے مجموعہای مکاتیب کو یکجا کر کے عودِ ہندی نام رکھا، اور خود دیباچہ لکھ جمع و ترتیب میں سعی کرنے والے اصحاب کی محنت کی اس طرح داد دی:

... نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب، جن کی ذاتِ باکمالات محتاجِ تعریف نہیں۔ ... سارا ہند انھیں جانتا ہے۔ ایران تک ان کی جادو بیانی کا چرچا ہے۔ مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی کی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں ... مگر کلامِ اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی۔ یہ دولت اربابِ شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ نثرِ اردو ان کی اور وں کی

(۱) عود: ہندی یہاں یہ امر واضح کر دینا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ تحریر کے معنی غلام آزاد کرنے کے ہیں، اور مالکِ تحریر وہ شخص کہلاتا ہے جس کے پاس غلام ہو۔ میرزا صاحب نے ازراہِ لطیفہ تحریر سے عام بول چال کے مطابق "لکھنا" مراد لیا اور یہ مالکِ تحریر کو منشی یا ادیب کا ہم معنی قرار دے کر تجر سے یہ خواہش کی کہ جب آپ خود مالکِ تحریر ہیں تو مجھے بڈھے کو کیوں تکلیف دیتے ہیں دیباچہ لکھ دینے کی۔

فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے، یہ سلاست بیان، یہ شستگی زبان، یہ روزمرہ کی صفائی، اداؤں کی شوخی، کسی کو کب میسر ہے؟ اسے بھی ترتیب دیجیے۔ قدر دانوں پر احسان کیجیے۔ میرے عنایت فرما اور میرزا صاحب کے شاگرد، ویکیتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا۔ تو انھوں نے جتنے خطوط میرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے، سب کو ایک جا کر کے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے، وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصے تک سرگرم تلاش رہا۔ جا بجا سے اور تحریریں میرزا صاحب کی بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اٹھائی، تب تمنا بر آئی، اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔

خواجہ غلام غوث خاں صاحب بہادر بےخبر، جو نواب معلیٰ القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص با اختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا۔

اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ۔ دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات، اور خاتمے میں چند نثریں ہیں، جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔

عود ہندی اس کتاب کا نام ہے ۱۲۷۷ھ[1]

عود ہندی کا سال طباعت

عود ہندی کا یہ ایڈیشن منشی ممتاز علی خاں نے اپنے مطبع مجتبائی واقعہ شہر میرٹھ میں طبع کیا۔ کتاب ۱۸۸ صفحوں پر تمام ہوئی، خاتمہ تعلق

[1]: ان عود: ۱۲۷۷ھ

میرٹھی نے لکھا۔ آخر میں چار تاریخی قطعے اضافہ کیے گئے۔ ان میں ایک قلق کا، ایک اُن کے شاگرد محمّد میرٹھی کا اور بقیہ دو غالباً خود منشی ممتاز علی خاں کے ہیں۔

ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۸۵ ہجری میں طباعت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آخری صفحے کے نچلے گوشے میں ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ ہجری (۲۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء) درج ہے، جس سے تاریخ و ماہ بھی متعین ہو جاتے ہیں۔

میور صاحب کی نذر

آخری قطعے کے مطالعے سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ منشی ممتاز علی خاں نے میور صاحب (سر ولیم میور گورنر ممالک مغربی و شمالی) کی خدمت میں عود کا مطبوعہ نسخہ نذر گزرانا تھا۔ سر ولیم میور علوم مشرقیہ کے عالم تھے۔ بیخبر نے، جو عود ہندی کی جمع و ترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حاکم کے نام معنون کر کے نشر و اشاعت کی تکمیل پر مہر توثیق ثبت کریں۔ اس زمانے میں اردو زبان میں ایسی نادر کتابیں معدودے چند شائع ہوئی تھیں۔ گورنمنٹ بعض سیاسی مصالح کے ماتحت نئی مفید کتابوں کی اشاعت میں، انعام کے نام سے، یا امداد طبع کے طور پر کچھ اخراجات کا بار اٹھا لیا کرتی تھی۔ عجب نہیں کہ منشی صاحب کو بھی کچھ روپیہ مل گیا ہو۔

میرزا صاحب کا حق تصنیف

ایک بار میرزا صاحب نے کتاب کی فوری اشاعت کا تقاضا کرتے ہوئے بیخبر کو لکھا تھا:

" اور ہاں، حضرت، وہ مجموعہ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے، فقیر کو بھیجیے۔"

عود ہندی مرزا صاحب کے انتقال سے کئی ماہ پہلے شائع ہو چکی تھی۔ لیکن ان کے مکاتیب میں اس کی طباعت یا حق تصنیف کے نسخوں کی وصولیابی کا ذکر نہیں پایا جاتا۔

عود کے رقعات کی تعداد

عود ہندی کے کل رقعات کی تعداد ۱۶۲ ہے۔ ان میں ۲۵ سرور کے نام، ۲ صاحب عالم مارہروی کے نام، ۳ شاہ عالم مارہروی کے نام، ۲۰ شفق کے نام، ۴ عزیز کے نام، ۱۳۱ مجروح کے نام، ۱ میر سرفراز حسین کے نام، ۱ حقانی کے نام، ۱ تفتہ کے نام، ۱۸ مہر کے نام، ۲۵ بیخبر کے نام، ۱ نساخ کے نام، ۱ ظہیر الدین خاں کی طرف سے ان کے چچا کے نام، ۱۰ شیفتہ کے نام، ۱ رعنا مرادآبادی کے نام، ۱ مرزا رحیم بیگ کے نام، ۱۰ شاکر کے نام، ۱۵ جنون بریلوی کے نام، ۱ مولوی عزیز الدین کے نام، ۱ سید محمد عباس صاحب کے نام، اور ۱ مفتی غلام بسم اللہ صاحب کے نام ہیں۔

ان خطوط کے علاوہ دو تقریظیں، مہر کی مثنوی کی تقریظ اور سرور کی گلزار سرور کی تقریظ، اور تین دیباچے، حدائق الانظار کا دیباچہ، قواعد نذیر (؟) نابیش کا دیباچہ، اور مرزا کلب حسین خاں بہادر کے مجموعۂ قصائد کا دیباچہ بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ایک خط بیخبر کا بھی درج کیا گیا ہے۔ جو مرزا صاحب کے خط کا جواب اور اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے مرتب کی نظر میں شامل مجموعہ ہونے کے قابل تھا۔

غالب کے خطوں کا تیسرا مجموعہ

ابھی عود ہندی طبع ہونے نہ پائی تھی کہ اطراف ہند سے مرزا صاحب کے مجموعۂ خطوط کی مانگ شروع ہو گئی۔ مرزا صاحب نے بیخبر کو ان کے مرتب کردہ مجموعے کی طباعت کے متعلق بار بار لکھا، اور جب سال بھر

گزرنے لگا اور کسی طرح کتاب نہ چھپی، تو انھیں اس کی طباعت کی طرف سے مایوسی ہوگئی۔ احباب دہلی نے میرزا کے کاربردازوں کا تساہل دیکھ کر اس شرف کو خود حاصل کرنے کا تہیہ کیا، اور مالک اکمل المطابع دہلی کو، اخراجات طباعت برداشت کرنے پر آمادہ کیا۔ اب خطوط کی فراہمی کا مسئلہ باقی رہتا تھا۔ وہ اس طرح حل ہوگیا کہ خود میرزا صاحب چونکہ انشا کی حقیقی قدر و قیمت اور بازاری مانگ سے باخبر ہوچکے تھے، اس میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہوگئے۔ چاروں طرف اہل خطوط یا ان کے نقول کی طلب میں خطوط لکھے گئے، اور رفتہ رفتہ کافی ذخیرہ فراہم ہوگیا۔ اس سلسلے میں خود میرزا صاحب نے جن احباب کو لکھا ان میں سے بےخبر اور علائی کے متعلق دستاویزی ثبوت موجود ہے۔ بقیہ اصحاب نے میرزا صاحب کے تقاضائی خطوط کی نقلیں نہیں بھیجیں، اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون بزرگ تھے، جنھیں خود میرزا صاحب نے ارسالِ نقول کے لیے لکھا تھا۔ بےخبر کے نام کا خط پنجاب احاطے کی مانگ کے تحت درج ہوچکا ہے، علائی کو سب سے پہلا مکتوب ان کے لوہارو پہنچنے کے بعد لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں، مجھ سے مسودات مانگے ہیں، اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا، جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہو، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دوگے، یا آج کل میں کوئی ادھر آنیوالا ہو، اس کو دے دوگے، تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔ اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اس کے چھاپے

جاننے سے تم بھی خوش ہوگے۔"(۱)

اس خواہش کی تکمیل میں علائی نے پس وپیش کیا۔ میرزا صاحب نے سمجھا کہ غالباً نواب صاحب نجی معاملات کی اشاعت کے خیال سے گریز کر رہے ہیں۔ اگرچہ کچھ عرصہ قبل خود میرزا صاحب نے تفتہ کو یہ کہکر اشاعت خطوط سے روکا تھا کہ نجی واقعات کو منظر عام پر لانا کیا ضرور ہے، لیکن اب انکا ادبی عقیدہ بدل چکا تھا، اس لیے نواب صاحب کے اس خیال کی تردید میں تحریر کیا:

"میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ نے تم نے لکھا، تمھارے حسن طبع پر تم سے بعید تھا، میں سخت بے مزہ ہوا۔ اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں، تو شاید ایک "تختہ" کاغذ سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجز و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی، اگر ان خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو، اور شہرت تمھارے منافی طبع ہے، تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا۔ اور ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے، تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو، اور کسی متصدی سے نقل اتروا کر چاہو کسی کے ہاتھ چاہو، بسبیل پارسل ارسال کرو، لیکن جلد۔ خدا کے واسطے کہیں غصے میں آ کر، علائی تو بلائی تو، کہکر اصل خطوط نہ بھیج دینا، کہ یہ امر میرے مخالف مقصود ہے۔"(۲)

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد بھی علائی نے ارسال نقول میں توقف کیا تھا، مگر میرزا صاحب نے پھر اس کے متعلق کچھ نہ لکھا، اور جب انھوں نے اصل خطوط بھیجکر میرزا صاحب کے ترک طلب کا سبب دریافت کیا، تو صبح شنبہ ۳۰ مئی سنہ ۱۸۶۳ء کو از راہ معذرت لکھا:

"لاموجود الا اللہ! اس خدا کی قسم، جس کو میں نے ایسا مانا ہے، اور

(۱) اردوی معلیٰ ۲۳۵، (۲) ایضاً ۳۴۳۔

اس کے سوا کسی کو موجود نہیں جا۔۔۔ ہے، کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پا کر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے، اپنا نفع نقصان سوچے گا، لاگت سچپت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا، اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ ہمارے رقعے ایک جگہ سے لیکر اُن کو بھیجے۔ اس کی رسید میں تقریباً انھوں نے طلب رقعات بہ تکلیف سوداگر لکھی، اور اس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لیکر کہیں گیا ہو گا، یا کتابیں لینے گیا ہو گا۔ یہ ۲۳ لفافے اور ۴۳ خط بدستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے اگر متوسط تقاضا طلب کرے گا، ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیجدوں گا، ورنہ تمھارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔"[1]

غالباً اس خط کی روانگی کے بعد ہی مہتمم مطبع نے خطوط کی نقلیں حاصل کیں میرزا صاحب یکشنبہ ۳۰ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۰ (۲۱ جون سنہ ۱۸۶۳ء) کو اصل خطوط واپس کر کے لکھتے ہیں:

"میری جان! مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے، میں نے خطوط مرسلہ تمھارے یک مشت اُن کو دیے۔ اب تمھارے پاس بھیجنے کا ان کا اختیار ہے، رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے۔"[2]

اردوی معلیٰ

خطوط کا یہ تیسرا مجموعہ اردوی معلّیٰ کے اسم سے موسوم ہوا۔ مجروح نے اس کا دیباچہ اور سالک نے اس کا خاتمہ لکھا۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہوئی۔ پہلے حصہ میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے

---

(۱) اردوی معلیٰ: ۲۴۰، ۲۴۲ (۲) ایضاً: ۲۴۸

تا طلبای مدرسہ فائدہ اُٹھائیں، دوسرے حصے میں مطالب مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی۔[۱] غالباً پہلی بار صرف حصہ اول شائع ہو سکا، اس لیے کہ کتب خانۂ عالیہ رامپور میں جو نسخہ موجود ہے، وہ مکمل ہوتے ہوئے صرف حصہ اول پر مشتمل ہے۔

اردوی معلی کا سال طباعت

لیکن یہ یقین کرنے کے تمام وجوہ موجود تھے کہ خطوط کا یہ مجموعہ جلد از جلد شائع ہو گا۔ لیکن قدرت نے اس ادبی انقلاب کی اولیت کا شرف میرٹھ ہی کو ودیعت کیا تھا۔ عود ہندی ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ھ کو شائع ہو گئی۔ اور اردوی معلی میرزا صاحب کے انتقال کے ۱۹ دن بعد، ۲۱ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ (۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء) کو چھپ کر تیار ہوا۔[۲]

سالک نے سالِ طبع لکھا:

کیا کہوں کچھ نہیں کہا جاتا — سب پہ نالوں کا ازدحام ہوا
صدمۂ مرگ حضرت غالب — سبب رنج خاص و عام ہوا
ہے یہی سالِ طبع و سالِ وفات — آہ اُن کا سخن تمام ہوا
۱۲۸۵ھ

مقام طباعت اور حق تصنیف

اردوی معلی، دلی کے مطبع اکمل المطابع میں طبع ہوا۔ حکیم غلام رضا خاں اس کے مالک، میر فخر الدین مہتمم، اور لالہ بہاری لال منشی تھے۔[۳]

کتاب کے آخر میں ایک اعلان شائع ہوا کہ اس کا حق تصنیف میرزا صاحب نے حکیم غلام رضا خاں کو عطا کر دیا ہے، اور ایک رقعہ بطور سند لکھ دیا ہے، لہٰذا کوئی صاحب حکیم صاحب کی بلا اجازت رقعات چھاپنے کا قصد نہ کریں۔ اس کے بعد میرزا صاحب کی حسب ذیل تحریر چھپی:

"ہیکل بے روح و روان، فقیر اسد اللہ خاں غالب متخلص بہ غالب کہتا ہے

۱۔ اردوی ۱۶۵، ۲۔ ایضاً ۲۵۴، ۳۔ ایضاً ۵ ۲۵۴

"اور لکھ دیا ہے کہ یہ جو اردوی معلیٰ تصنیف بقیر مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا، سو میں نے از راہ فرطِ محبت اپنا حق تالیف نور چشم اقبال نشان، حکیم غلام رضا خاں کو بخشدیا ہے اور اس حق کو خاص ان کا حق کیا۔ اب اور کوئی صاحب اگر مالک اکمل المطابع حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع اردوی معلیٰ کے چھاپنے کا قصد کریں گے، تو مواخذے سے محفوظ نہ رہیں گے، اور تو ازحسب منشاء قانون سستم سنہ ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔ (مہر نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۷۷ھ)"

اردوی معلیٰ کا پہلا ایڈیشن

اردوی معلیٰ حصۂ اول کا پہلا ایڈیشن ۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، جن میں ۵ صفحے مجروح کے دیباچے کے ہیں۔ پانچویں صفحے کی پندرھویں سطر سے خطوط شروع ہو کر صفحہ ۴۵۸ کی تیرہویں سطر پر ختم ہوتے ہیں، اور باقی چار سطریں خاتمۃ الطبع پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۴۵۹ سے ۴۶۱ کی ساتویں سطر تک سالک کا خاتمہ ہے۔ اس کے بعد جو ہر کی تاریخ طبع، اور پھر اسی صفحے کی گیارہویں سطر سے صفحہ ۴۶۴ کی تیرہویں سطر تک تصحیح اغلاط کا نقشہ ہے۔ بعد ازاں میرزا صاحب کا اعلان عطیۂ حق تالیف ہے۔ کتاب خانۂ رامپور کے نسخے کے شروع میں زرد رنگ کا سرورق تھا(۱) یہ میرزا صاحب کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا، اس لیے اس میں انھیں مرحوم نہیں لکھا گیا ہے۔

رقعات کی تعداد

اردوی معلیٰ کے اس ایڈیشن کے رقعات کی کل تعداد ۴۷۰ ہے

(۱) اردوی: ۴۴۸ (۲) ڈاکٹر صدیقی صاحب (الہ آباد) کے پاس اس ایڈیشن کے ۲ نسخے ہیں، ان دونوں کی لوح گہرے سبز رنگ کے کاغذ کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوح کے لیے مختلف رنگوں کے کاغذ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ان میں ۱۰ نواب میر غلام بابا خاں بہادر کے نام، ۱۱ سیاح کے نام، ۱۰ ذکا کے نام، ۹۸ تفتہ کے نام، ۳ شاہزادہ بشیر الدین صاحب بہادر کے نام، ۵ سید بدر الدین المعروف بہ فقیر کے نام، ۱۶ سرور مارہروی کے نام، ۲۱ میر سرفراز حسین کے نام، ۳۰ مجروح کے نام، ۲ شاہ عالم صاحب کے نام، ۲ صاحب عالم ما کے نام، ۱ نساخ کے نام، ۱ عزیز کے نام، ۱۱ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام، ۲ رعنا مرادآبادی کے نام، ۲ شاکر کے نام، ۱ مولوی عزیز الدین کے نام ۱ مفتی سید عباس کے نام، ۲۳ حکیم غلام نجف خاں کے نام، ۱ نجم الدین حیدر خاں کے نام، ۵ وفا کے نام، ۲ مولوی احمد حسن قنوجی کے نام، ۱ حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام، ۱ تفضل حسین خاں کے نام، ۱۸ مہر کے نام، ۲۰ منشی نبی بخش کے نام، ۱ منشی عبداللطیف ابن منشی نبی بخش کے نام، ۱۲ بے خبر کے نام، ۱ نیر کے نام، ۷ مرزا شہاب الدین احمد خاں کے نام، ۱۹ شفق کے نام، ۳ میرن صاحب کے نام، ۲ سالک کے نام، ۲ رضوان کے نام، ۲ کامل کے نام، ۳ حسین مرزا کے نام، ۱۲ یوسف مرزا کے نام، ۳۳ منشی شیو نرائن کے نام، ۲ بابو ہرگوبند سہائے کے نام، ۲ نواب امین الدین احمد خاں بہادر کے نام، ۵۶ علائی کے نام، ۱۰ فرخ مرزا کے نام، ۲ بیکش کے نام، ۱ حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام، ۱ حکیم غلام رضا خاں کے نام، ۳ ماسٹر پیارے لال کے نام، ۲ جوہر کے نام ۱ منشی ہیرا سنگھ کے نام، ۱ اور ۲ مشتاق کے نام ہیں۔

اردوی معلی حصۂ دوم

غالباً مرزا صاحب کے یکایک انتقال کے صدمے نے مہتممینِ اشاعت اردوی معلی کو حصہ دوم کی ترتیب و طباعت کی طرف سے برداشتہ خاطر کر دیا، اور یہ حصہ دیباچے کے وعدے کے باوجود شائع نہ ہو سکا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں مولوی عبدالاحد مرحوم، مالک مطبع مجتبائی دہلی، نے اردوی معلی کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ خواجہ حالی مرحوم نے حصہ دوم کے لیے

کچھ مواد عطا فرمایا، جو مہتمم طباعت نے حصۂ دوم کے نام سے آخر میں شامل کر دیا۔ خود عبدالاحد مرحوم کے الفاظ میں: "اس حصے میں خاص کر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے (میرزا صاحب نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں۔"

چونکہ ممدوح نے بھی تقریباً اسی قسم کے خطوط مرتب کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لیے کچھ بعید نہیں ہے کہ ممدوح کا ذخیرہ خواجہ صاحب کو مل گیا ہو، اور مہتمم مطبع نے اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر کتاب چھاپ دی ہو۔

نسخۂ مجتبائی کا حصہ دوم ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں، سفر دل کا ایک مختصر تقریظ نوشتہ ہے۔ اس کے بعد سراج المعرفت اور صدا کن الانظار کے دیباچے ہیں۔ بعد ازاں شاہ ظفر کی ایک کتاب اور سرور کی گلزار سرور کی تقریظیں ہیں۔ ان کے بعد دیوان ذکا، میرزا کلب حسین خاں نادر بنارسی کی ایک کتاب، نیز رسالہ تذکیر و تانیث مصنفۂ صفیر بلگرامی کے دیباچے ہیں۔ یہ تمام دیباچے اور تقریظیں صفحات ۱۔۳۱ پر درج ہیں۔ ان کے بعد اسی صفحے سے اصلاحی خطوط شروع ہوتے ہیں، جن میں ۴۳ خطوط تفتہ کے نام، ۱ ماسٹر پیارے لال کے نام، ۵ ذکا کے نام، ۵ سیاح کے نام، ۲ شاہزادہ بشیرالدین کے نام، ۱ ہشیار کے نام، ۱ مولوی کرامت علی کے نام، ۱ جوہر کے نام، ۱ منشی ہیرا سنگھ کے نام، اور ۲ ممدوح کے نام ہیں۔

ضمیمہ اردوی معلی

سنہ ۱۹۲۶ء میں شیخ مبارک علی صاحب، تاجر کتب لاہور نے اردوی معلی کے حصہ اول و دوم کے ساتھ خوش نما کا مرتب کیا ہوا ایک ضمیمہ بھی

شائع کیا ہے ۔ یہ ۲۳ خطوط پر مشتمل ہے، جن میں سے ۲۲ قدر بلگرامی کے نام، اور ایک شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام خطوط مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی نے مولانا حسرت موہانی کے ماہانہ رسالے "اردوی معلی"، (علیگڑھ) کے دسمبر سنہ ۱۹۱۰ع کے پرچے میں شائع کیے تھے ۔ سرفوش نے اس پرچے کے حوالے بغیر خطوط نقل کر دیے ہیں ۔

اس ضمیمے کے آغاز میں دو خط اور شامل کیے گئے ہیں، جو شیخ صاحب کو شفیق مکرم آغا محمد باقر، نبیرۂ حضرت آزاد دہلوی، سے دستیاب ہوے تھے ۔

میرزا صاحب کے خطوط کا آخری مجموعہ: مکاتیب غالب

مذکورۂ بالا مجموعوں کی اشاعت سے ساٹھ پینسٹھ برس بعد ریاست عالیۂ رامپور کی طرف سے میرزا صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ مکاتیب غالب کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، جو موصوف نے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں یا وابستگانِ دربار کو لکھے تھے ۔

سرکارِ رامپور سے میرزا صاحب کی مراسلت بارہ سال تک جاری رہی ۔ اس عرصے میں اہلِ رامپور سے بھی اُن کے خاص تعلقات قائم ہو گئے تھے اور متعدد اصحاب سے خط کتابت بھی رہتی تھی ۔ لیکن سوء اتفاق سے اُن کی مراسلت کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا ۔ اس مجموعے میں صرف وہ خط مرتب کیے گئے ہیں، جو دار الانشا میں محفوظ تھے ۔

مکاتیب کی تعداد

مجموعۂ ہذا کے مکاتیب کی تعداد ۱۱۹ ہے ۔ اُن میں سے ۴۳ خط نواب فردوس مکاں کے اور ۷۳ نواب خلد آشیاں کے حضور میں

چھپے ہوئے تھے، بقیہ میں سے ۲ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام، ۲ صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بیتاب کے نام، ۲ منشی سیلچند میر منشی کے نام، ۱ خلیفہ احمد علی احمد رامپوری کے نام، اور ۱ مولوی محمد حسین خاں، مدیر دبدبۂ سکندری، کے نام ہے۔

نواب فردوس مکاں کے نام کے خطوط ہیں، ۴ فارسی زبان کے اور بقیہ ۹۳ اردو میں لکھے ہیں۔ اور چونکہ مجموعے میں ایک فارسی قصیدہ مستقل نمبر کے تحت درج ہوا ہے، بنا بریں ان کے نام کے خطوں کی تعداد ۹۸ اور کل مکتوبات کا شمار ۱۳۰ ہو گیا ہے۔

گم شدہ خطوط کی تعداد

نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے فرامین کے مسودوں نیز مرزا صاحب کے زیر نظر مکاتیب میں تقریباً ۱۳۵ ایسے خطوں کے حوالے ملتے ہیں جو شلوں میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے، تو مکاتیب غالب کی تعداد ۲۶۴ ہوتی، جو اور بڑھ جاتی، اگر ان کی اہلیہ شہر سے خط کتابت بھی دستیاب ہو سکتی۔ لیکن

در دست دیگر نیست سفید و سیاہ ما

مکاتیب غالب
متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بحضورِ نواب صاحب والا مناقبِ عالی شان، قلزمِ فیض و عمانِ مان، جناب نواب محمد یوسف علی خان بہادر، دام اقبالہ مقبول باد۔"

[نواب سید یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکاں، طاب ثراہ، نواب سید محمد سعید خاں بہادر، ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، ابن نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، ابن نواب سید علی محمد خاں بہادر، بانی ریاست روہیلکھنڈ کے فرزند اکبر تھے۔ آپ جنابِ عالیہ فتح النسا بیگم صاحبہ، بنتِ محمد نور خاں بڑہیچ، ہمشیرزادہ نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، کے بطن سے دوشنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ ہجری (۵ مارچ ۱۸۱۶ء) کو متولد ہوئے، اور دوشنبہ ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ ہجری (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) کو مسندِ حکمرانی پر قدم رکھا۔ جلوس کے دو سال دو ماہ بعد ۱۴ رمضان ۱۲۷۳ھ (۹ مئی ۱۸۵۷ء) کو مشہور واقعۂ غدر رونما ہوا۔ آپ نے اس فتنے کے فرو کرنے میں حکومتِ ہند کی اعانت کر کے، بسلسلۂ اعترافِ خدمات بیس ہزار روپے کا خلعت، ایک لاکھ تیس ہزار روپے سالانہ آمدنی کا جدید علاقہ، اور "فرزندِ دلپذیر دولتِ انگلشیہ" کا خطاب حاصل کیا، سلامی گیارہ ضرب توپ کے بجائے تیرہ ضرب مقرر کی گئی، اور مراسلت میں القاب و آداب "نواب صاحب مشفق بسیار مہربان کرم فرمای مخلصان سلامت، بعد از شوقِ ملاقاتِ مسرت آیات مشہودِ خاطرِ الطاف ذخائر مہد اد" طے پایا۔ آپ نے خود اس عطیے کی

حسبِ ذیل تاریخ ارشاد فرمائی ہے۔

حب گورمنٹ سے ہوا حاصل — ملک مجھ کو بصیغۂ انعام
ناظمِ از روی ہمّت عالی — سالِ بخشش ہے "بخشش حکام"

۱۲۷۶ھ

آپ نے عربی و فارسی کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ فارسی میں خلیفہ غیاث الدین عزت رامپوری، مصنفِ غیاث اللغات، اور میرزا غالب سے، اور علوم عربیہ و حکمیہ میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے تلمذ تھا۔ تخت نشینی کے بعد شعر و سخن کا مشغلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ناظم تخلص فرماتے تھے، اور میرزا غالب سے مشورۂ سخن تھا۔ نکتہ رس ذہن، رنگین و شوخ طبیعت، اور اعجوبۂ روزگار استاد نے ان کو زبانِ اردو کا ایک بلند پایہ شاعر بنا دیا ہے۔ مومن و غالب کے بعد ان کی نظیر "اِلّا ماشاء اللہ" کا حکم رکھتی ہے۔ دیوان دو بار شائع ہو چکا ہے۔

آپ فنونِ سپہگری میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جسم مضبوط اور چہرہ نہایت خوش قطع تھا۔ داڑھی صاف اور مونچھیں باریک رکھتے اور اس زمانے کے رواج کے مطابق اکثر رنگین و زرتار لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے۔

آپ نے دس سال چھ کو مسند کرکے جمعے کے دن ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۸۴ھ (۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء) کو اس دارِ فانی سے رحلت کی، اور قلعۂ معلی کے اندر امام باڑے میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔]

(۱)

بحضورِ سراسر نور، جناب مستطاب، نواب ہمایوں القاب، جہانبان کام بخشِ جہان جہان کامیاب، دَامَ بَقَاءُهُ بِقُبُولِ الاقبال، سجدہ نشانی قلم با پوزش گستری عربضہ نگار توام افتادہ۔ ہمانا آن درگاہِ اسکندر

دارا گزرگاه پیوسته در نظر است، که هم از دور در زمرهٔ نزدیکان بندگی بجا
می آورد۔ سپاس این معنی خود از اندازه افزون تواند بود، که بعنوان روشناسی ذره
با مهر و آشنائی قطره با بحر، گدا را با شاه بیگانگی درمیان نیست۔ در آن روزها به
رنگین نثر از نوبهار که به فر فرخندگی وجود مسعود، و ساده با سپهر ساده دم از
برابری زد، نگاشتن و روان داشتن قطعهٔ تاریخ جلوس[1] به توانائی آن دانائی
و روان آسائی آن شناسائی صورت پذیرفت۔ اکنون که یعنی خدای قلمرو
دانش، آن به فر تابش تاب نظر یا بر جبین جلیس در آن به فرزانهٔ فروتنش عقل
باعقل فعال همال، امیرالدوله مولوی حافظ محمد فضل حق خان بهادر[2] به بندهٔ
زبان پذیر فرمان فرستادند که غالب به پرستش گری کمر بندد و در مشاطگی شاهدان
افکار حسن خدمت را عرضه دهد۔ اندیشهٔ مهر پیشه در رنگ برتافت و هم امروز که فردای
ورود نوازش نامهٔ مولانا ست، این نامه که بخط بندگی ما ست، روان داشته آمد
چشم داشت آنست که دوری راه تفرقه درمیان نیندازد و سپس در حاضران آن حضرت
دعاگویان دولت بشمار آیم۔ زیاده جز این آرزو در روز افزونی دولت پیوند باد
عرضداشت هواخواه اسدالله نگاشته و روان داشته چارشنبه ۲۸ جنوری
۱۸۵۵ء [مهر: نجم الدوله دبیرالملک اسدالله خان بهادر نظام جنگ ۱۲۶۷][3]

(۴)

همانا اگر گوهر جان فرستم
به نواب یوسف علی خاں فرستم

ز نامش نشانی بعلوان طرازم
ز مدحش طرازی بدیوان فرستم

ز خلقش حسابی به معدن نویسم
ز نیلش صلائی بعمان فرستم

ز لطفش که عام ست در کام بخشی
نویدی به گبر و مسلمان فرستم

ز لطفش که خاص ست در ملک گیری
مثالی بشیراز و شروان فرستم

زهی شهسواری که گرد سمندش
پی سرمهٔ چشم خاقان فرستم

رود سام چون بهر پیکار سویش
عزا نامه سوی نریمان فرستم

درش را بود پایهٔ در خیالم — نگه سویش از دور پنهان فرستم
کلیمم، از عصا ارمغانم فرستند — من این ارمغان بهر دربان فرستم
ز جودش بود فخر اجرام و ارکان — تحیت به اجرام و ارکان فرستم
ز جودش، بود وعده باز بردستان — بشارت به برهمن و دیوان فرستم
ز مویش شمیمی به جنت رسانم — ز کویش، نسیمی به رضوان فرستم
هم از شرقِ اشراقِ روی، آفتابی — با ختر شناسانِ یونان فرستم
هم از روی نیکوی وی، ماهتابی — به شب زنده دارانِ کنعان فرستم
اگر نگذرد تیرِ شستش از سینهٔ من — دل از سینه همراهِ پیکان فرستم
وگر سر ازین راه دزدد جبین را — چو گویش درین ره به چوگان فرستم
سرشت از خزانست بدخواهِ او را — سه فصلِ دگر هم بدیشان فرستم
هم از آتشِ دوزخ آرم تموزش — هم از زمهریرش زمستان فرستم
وگر تا بهاران ببستی نه میرد — در آردی بهشتش بزندان فرستم
سپه چون کشند، گرنه از ناتوانی — توانم که خود را به میدان فرستم
درین اژدها، از نفس های گیرا — به رهها بت، آیاتِ قرآن فرستم
به توفیقِ فضلِ حق، آن عینِ معنی — که "آباد" بر روی فراوان فرستم
گزشت اندر اندیشه کز خامه رشحی — بدان قلزمِ فیض و احسان فرستم
بدل گفتم، البته کاریست مشکل — نشاید که این نامه آسان فرستم
سگالش چنین رفت در کارسازی — که فرخ بود، چون بفرمان فرستم
فرستادم، اما نیابد جوابی — که تا هرچه فرمان رسد، آن فرستم
ندانم که شورِ فغانِ گدا را — چسان باز تا گوشِ سلطان فرستم
بدل گفتم، آری، فرستاده باشم — گر از راهِ چاکِ گریبان فرستم
دگر جادهٔ ره نمایان نه گردد — هم از جیبِ چاکی بدامان فرستم
بدان تار دانی وهم کارِ خود را — زخونابه موجی بمژگان فرستم

دمم در تن نی دمِ آتشین را | فروزنده شمعی بایوان فرستم
برفتارِ نازنده اندر آرم قلم را | تذروی بصحنِ گلستان فرستم
سخن کوته، آن به که از نظم خردی | بدیوانِ آن صدرِ گیهان فرستم
فرستم ولیکن خرد چون پسندد | که برگِ گیاهی به بستان فرستم
گرفتم که رنگین خیالم بگیتی | شقائق به بنگاهِ نعمان فرستم
گرفتم که بحرِ روانم بمعنی | گهرها به ابرِ نیسان فرستم
گرفتم که روشن روانم بدانش | چراغی به مهرِ درخشان فرستم
درین پرده خواهم که از مورِ مسکین | سلامی بسوی سلیمان فرستم
نبشتم که خدمت گزارست غالب | پیِ دعویِ خویش برهان فرستم
بشب بستم این نقش و در بندِ آنم | که حرزِ دعا بامدادان فرستم
بقا، بهرِ داور، ز داور خواهم | به آیین خروش از شبستان فرستم(۱)

(۳)

بحضورِ پرنور، حضرت نوابِ معلّی القاب، جاودان کامیاب، ولیِ نعمت آیهٔ رحمت، دامَ اقبالهُ، سپاس بجای آورده و پوزش همی گسترد، آن بارگاهِ سپهر کارگاه را قبلهٔ حاجات میداند، و هنجارِ سرگذشت حکایتی بعرض میرساند. سه شنبه ۲۷ جنوری نامهٔ مولٰنا و بالفضل اولٰنا(۲) بمن رسید. چهارشنبه ۲۸ جنوری عرضداشت روان داشتم. چون دو هفته گذشت و سررشتهٔ ڈاک درین بند و بستِ جدید استوار نمانده(۳) گفتم "مگر نرسیده باشد". دی که چهارشنبه یازدهم فروری ۱۸۵۷ بود، چاشتگاه قصیده(۴) بقصدِ اظهارِ فرمان پذیری فرستادم. شامگاه سرهنگ پیام منشورِ عطوفت آورد. برمردمکِ دیده سودم، و خردهٔ جان نثار کردم. تا نوردانرا هم کشودم، دو ورق از فهرستِ گنجینهٔ اسرار، یعنی اوراقِ اشعارِ گهر بار و سفینه(۵) دوصد و پنجاه روپیه در آن نورد یافتم. دفترِ شعر بمحلِ اعتبار من شد، و زرِ آن سفینه بمعرضِ وصول آمد. کرم و بنده پروری بهانه میجوید ورنه این

افتتاح بشیرینی نیاز نداشت۔ کریمان بندہ را بہ نمک ہمی پرورند؛ ولی نعمت را بندہ کنشکر پروردن آئین است شکر این شکر بعہدۂ جان شیرین فرو گزاشتم، واین نامہ بہر آنکہ رسیدن عطیہ حالی گردد، بدین زودی نگاشتم۔ اشعار خود بہنگام خویش خواہد رسید و این سر رشتہ ہیچگاہ از ہم نخواہد گسست۔ زیادہ حد ادب۔ نیر دولت و اقبال سرچشمۂ فروغ بی زوال باد!

غالب

پنجشنبہ ۱۲ فروری ۱۸۵۷

(۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب بجا لاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر[1] حضور میں بھیجتا ہوں۔ مسودات اپنے پاس رہنے دیے ہیں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے، تو میں پھر اُس[2] کو صاف کر کر بھیج دوں؛ ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہے گا[3] فقط میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص بنے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیسان، ان میں سے جو پسند آئے، وہ رہنے دیجیے مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور رہو، تو بہت مبارک۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو قیامت تک

عنایت کا طالب غالب۔ روز یکشنبہ ۱۵ فروری سنہ ۱۸۵۷[4]

[میرزا صاحب نے ۹ مارچ ۱۸۵۷ء کو ایک عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۱۱ ماہ مذکور کو رامپور پہنچا۔ مثل میں اس کا صرف لفافہ شامل ہے، اور اُس کی پشت پر تحریر ہے: "عرضی حسب الحکم چاک نمودہ شد۔ ۱۶۔ رجب ۱۲۷۳ھ"

میرزا صاحب نے یکم اپریل سنہ ۱۸۵۷ع کو ایک اور عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۳ - اپریل کو رامپور پہنچا۔ مثل میں اس کا بھی صرف لفافہ شامل ہے اور اُس کی

پشت پر تحریر ہے: "عرضی از دست مبارک چاک شد، و بندِ غزلیات مرسلہ در حضور ماند۔ ۹ شعبان سنہ ۱۲۷۳ھ"

(۵)

جنابِ عالی، کچھ کم مہینا ہوا کہ میں نے حضور کی غزلوں کو دیکھ کر خدمت میں روانہ کیا ہے، اور اُس (۱) کے پہنچنے سے اطلاع نہیں پائی۔ اب ڈاک میں خط "تلف بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس واسطے میں متردد ہوں، اور مدعا اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر وہ لفافہ نہ پہنچا ہو، تو میں اُس مسوّدے کو پھر صاف کر کر روانہ کروں۔ زیادہ حدِ ادب۔ از غالب۔ نگاشتہ صبح پنجشنبہ، ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۷۳ ہجری (۲)

(۶)

جنابِ عالی، آداب بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ آج وہ دا پہنچا۔ مگر کُٹا ہوا، اور بھیگا ہوا، اور بھاگتا ہوا۔ گوجروں نے اُسے لوٹ لیا۔ روپیہ کمّل سب لے لیا۔ خط اُس دار و گیر میں گر پڑا، بھیگ گیا۔ لفافہ مجھ تک نہ پہنچا۔ خط مع ہنڈوی کے پہنچا۔ خط میں سے القاب بہ تکلف پڑھا، اور یہ جملہ "سفتجۂ مبلغ دو صد و پنجاہ روپیہ" پڑھا گیا، اور باقی خیر و عافیت "مگر آنکہ" اس کے بعد جو کچھ لکھا تھا، اُس میں سے "مولوی" یہ لفظ، اور بعد ایک لفظ کے "خانصاحب" یہ پڑھا گیا، اور کچھ نہیں۔ مجھ کو (۴) غم یہ ہے کہ غزلہای اصلاح اور "دیوانِ اردو" کی رسید میں نے نہ پائی (۵) فقط

ہنڈوی کا بعینہٖ وہ حال جو میرے خط کا تھا، کچھ پڑھا جائے، کچھ نہ پڑھا جائے۔ آپ کا نام اور ڈھائی سو روپیہ پڑھا گیا۔ چونکہ مہاجن مجھ کو جانتا تھا، اُس نے اُس بھیگے ہوئے کاغذ کو اپنی چٹھی میں لپیٹ کر اُس مہاجن کے پاس بھیجا ہے۔ جب وہ صحیح کر کر بھیجے گا، تب وہ مجھ کو روپیہ دیگا۔ اُس کے صحیح کرنے میں کیا تامل ہے؟ میں نے صرف بطریقِ اطلاع لکھا ہے۔ اور غزلوں کی اور دیوان کی رسید، اور جو اس خط میں "مگر آنکہ" (کے) (۶) بعد مطالب مندرج تھے وہ پھر لکھیے

ہی باریک کاغذ پر لکھ کر اُس [1] ساہوکار دیجے گا، اور اُس کو تاکید کیجے گا کہ اس کو بھیج دے۔ یہاں کے ساہوکار نے میری خاطر سے اس رقعے کو اپنی [2] چھٹی میں روانہ کیا ہے۔ غالب۔ پنجم ذی الحجہ (۳)

(۷)

بوالا خدمتِ رفعات درجت، جنابِ نواب صاحبِ والامناقبِ عالیشان قلزمِ فیض و مہبطِ احسان، عزّ نصرہٗ وَدَامَ مُلکہٗ، آدابِ نیاز بجا می آرد، و نیاز مندانہ عرضہ می دارد۔ در زمانِ چیرہ دستیٔ کور نمکانِ سپاہِ رُوسیاہ سر رشتۂ پیام از ہم گسست۔ ناچار بفرستادنِ نامہ بر، رساندنِ نامہ و پیام صورت بست درین روزگار کہ فرمانِ داورانِ دادگر روائی وسلسلۂ آمد شدِ نامہ رسائی یافت، نامہ در پیام روان داشتہ شد، و نارسیدنِ پاسخِ آن را چنان پنداشتہ شد، کہ مگر آن نیاز نامہ نرسیدہ باشد، یا فرطِ احتیاط مانعِ تحریرِ جواب گردیدہ باشد۔ بہر آئینہ در دل چنان گزشت کہ درین بارہ بدانسان سخن سرای نوان گشت کہ سرگزشت من از دلیٔ نعمت نہان و حجابی درمیان نماند۔

حالیٔ رای جہان آرای باد کہ دیرینہ نمکخوارِ سرکارِ انگریزم، و از سر آغازِ سال یکہزار و ہشت صد و شش کہ در آن گاہ شمارِ سنینِ عمر من از دہ نگزشتہ بود، بعوضِ جاگیرِ عمِ حقیقیِ نسبیٔ خود، نصراللہ بیگ خان بہادر [۴] کہ با جمعیتِ رسالۂ چہار صد سوار معیت جرنیل لارڈ [۵] لیک بہادر [۶] در فتحِ ہندوستان کوششہای شایان کردہ، و پرگنہ "سونک سونسا" [۷] بتقیدِ حینِ حیات جاگیر یافتہ، و ہمدران عہد بمرگِ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمانِ جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوریٔ گورمنٹ، منتِ زرِ ہی شامل جاگیرِ عم سببیٔ من، نواب احمد بخش خان بہادر [۸] در وجہِ معاشِ من منجملۂ نذرِ استراریٔ سرکاری کہ بذمۂ نواب احمد بخش خان بہر دوام واجب الادا بود، قرار یافت چون جانشینِ احمد بخش خان [۹] کیفرِ کردار یافت، و جاگیر بسرکار باز یافت شد، رسیدنِ آن وجہِ مقرری از خزانۂ کلکٹریٔ [۱۰] دہلی صورت پذیرفت، چنانکہ تا انجام

اپریل سنہ ۱۸۵۷ء از کلکٹری دہلی یافتہ ام، و از مئی خود آشکار است کہ حال چیست. پیوندِ تعلق با بہادر شاہ [۱] جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بتحریرِ تاریخ سلاطینِ تیموریہ و از دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہریاری می پرداختم. درین ہنگامہ خود را یکنار کشیدم و بدین اندیشہ کہ مباد، اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رود و جان در معرضِ تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم. ہرگاہ شہر بدستِ سپاہِ انگریز فتح شد، ہمہ جاگیرداران و پنشنداران [۲] از شہر بدر رفتند، چنانکہ تا امروز آوارۂ دشت و کوہ اند، من از جا نجنبیدم و ہمچنان گوشہ گیر ماندم. درین بندوبست کہ خاصہ از بہرِ سیاستِ مجرمان ست، و تحقیقاتِ جرم از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مخبران می کنند، ہیچ گونہ آلایشِ دامنِ من پدید نیامد و دار و گیر و بازپرس روی نداد [۳]. بودنِ من در شہر از حکام نہان نیست. امّا چون پرسشی درمیان نیست، لاجرم محفوظ ماندہ ام. می بایست کہ خود سلسلہ جنبانِ گشتمی و با حکّام پیوستمی. درین بارہ سخن آنست کہ درین زمان با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم، و معہذا ہنوز موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم و خواہشِ ملاقات بمیان آورم. راستی اینکہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام. لیکن مقامِ شکر است کہ بتقدیم نرسیدنِ خدمت از راہِ بیدستگاہی است، و ذریعۂ اخلاص و خلوص ہمان بیگناہی است.

حالِ خود را، اگرچہ پرسش از جانبِ آن والا مناقب نبود، گفتم، و خون میخورم کہ صحت و عافیتِ ذاتِ ہمایونِ اقدس کہ یارب، جاودان سلامت باد! چگونہ دریابم. ہمدرین گنج کہ مسکنِ منست، شنیدہ ام کہ والاشان زین العابدین خان بہادر بشہر آمدہ اند. نیازمندیِ من با مرحومی نواب عبداللہ خان بہادر و مہرورزیِ من با اصغر علی خانِ مرحوم و محبت و نسبتِ من با نواب عبدالرحمن خان بہادرِ مغفور بچشم دیدہ اند و آن مدارج کی در نظر دارند کہ ایشان را در ضمیر میگذشت کہ گدای گوشہ نشین را باید دید؟ من خود پای کہ رفتار داشتہ باشد ندارم

واز بزادیہ بروں آمدن نتوانم۔ بہ نگاشتنِ این نامہ زحمتِ اوقاتِ ملازمان ازآن روا داشتہ ام کہ اگر نفرستادنِ نامہ محض ازروی احتیاط است، ہویدا گردد کہ در عنایت تفریط و در رعایت افراط است۔ چشم دارم کہ بمشاہدۂ سوادِ نوازشنامہ فروغ نظر اندوزم۔ شغلِ شعر و سخن ہر آئینہ نفیں دارم کہ درین چنین فتنہ و آشوب دل بدان کار رنگ نہ گراید؟ دولت پایندہ و نصرت طرب فزاینده باد! از اسد اللہ غالب رنگاشتہ وروان داشتہ پنجشنبہ ۱۴ جنوری ۱۸۵۸ء

(۷)

دبیرانِ خاص، برعنوانِ نامہ ہا بہ نیستین، نشانِ کلبۂ این درویش دلریش عقبِ مسجد جامع نبشتہ اند، ومن از ہفدہ ہشت سال در محلۂ بلی ماران[۲] می مانم[۳]۔ سپس نشانِ این محلّہ نگاشتہ شود۔ فقط

(۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت![۴]

منشورِ عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی مخمّس اور غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی۔

یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کرنا ہے، ورنہ حضور کے کلام کو اصلاح کی احتیاج کیا ہے؟ میری کیا سخنوری اور سخن سرائی ہے! آپ کی قدردانی بلکہ قدر افزائی ہے۔ تکلّف ہے، اگر کہوں کہ تا قیامت رہو۔ بے تکلف دعا یہ ہے کہ خدا کرے ایک سو بیس برس تک سلامت رہو!

اِس قرینے سے کہ بسبب کم فرصتی کے اُن کا ملاحظہ نہ کرنا مرقوم ہوا، ریختے کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا۔ دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے۔ مگر یہ چار جزو کا رسالہ جواب بھیجا ہے، اِس کا دیکھنا ضرور در کار ہے۔ فارسیٔ قدیم اور سہرِ حُسن[۵] اور صنعتِ الفاظ؛ با این ہمہ ہر امر کی احتیاط اور رعایت کا لحاظ۔[۵]

جنابِ عالی، طرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ ہے۔ خدا کا شکر یہ کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ کسی طرح کے جُرم کا پتہ [illegible] میرے احتمال بھی نہیں! قسمت کا گلہ یہ کہ عطای پنشنِ قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ اُنیسواں مہینا ہے۔ گویا بِن کھائے جینا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشنداروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھیے کیا نیا گُل کھلے گا! پہلی نومبر کو یہاں اشتہارِ عام ہو گیا ہے، کہ اب قلمروِ ہندوستان میں عملِ ملکۂ معظمہ عالی مقام ہو گیا ہے[2]۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور وزرای ملکۂ دارادربان کے دو سارٹی فکٹ[3] پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے، تو اسی کتاب موسوم بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے۔
خوشنودی کا طالب، غالب۔ نگاشتۂ روزِ یکشنبہ ہفتم نومبر سنہ ۱۸۵۸ء

(۹)

خداوندِ نعمت سلامت![4]

جو آپ بن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں، اور جب مجھ کو حاجت آ پڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔

بارِ گرانِ غم سے پست ہو گیا ہوں۔ آگے تنگدست تھا، اب تہی دست ہو گیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجیے، اور کچھ بھجوا دیجیے۔ عنایت کا طالب غالب
چہارشنبہ یازدہم ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ ہجری و ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء[5]

(۱۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد آداب بجا لانے کے عرض کرتا ہوں کہ منشورِ رافت لکھا ہوا ۲۵ نومبر کا جمعے کے دن تیسری دسمبر کو اس دعاگوی دولت کے پاس پہنچا۔ ڈھائی سو روپیے کی ہنڈوی معتمد کے حوالے کی گئی۔ آج بالکل روپیہ آ جائے گا۔ خاطرِ عاطرِ اقدس جمع رہے[6]۔

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا؟ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغازِ سالِ ۱۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پاسے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اُس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اُس کو جواب مل جاسے۔

حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلامِ خوش مطلوب ہے، اگلی غزلوں کی طرح نہوں؟ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی، اور اُن اشعار میں کلامِ خوش نہ تھا؟ حضرت کا نو اُن غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اوروں کے دیوان میں دبیا ایک شعر بھی نہ نکلے گا۔ میں بقدر اپنی فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں قصور نہیں کرتا۔ زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشتِ غالب۔ معروضۂ جمعہ ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۷۵ و ۳ دسمبر ۵۸ء

(۱۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

میں اس دولتِ ابد مدت کا از راہِ مودت خیر خواہ ہوں۔ امرِ ملال انگیز اندوہ آور میں آرایشِ گفتار گوارا نہیں کرسکتا۔ نواب مرزا[۲] نے دلّی آکر پہلے تو بزم آرائی سنائی[۳]۔ چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں، کل اُس نے از روی خطِ آمدۂ رامپور حضرت جنابِ عالیہ[۴] کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا! حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کرکر[۵] اور زیادہ مغموم ہوا۔ بیدرد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بطریقِ انشا پردازی عبارت آرائی کروں؛ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دلِ دیدہ ور کو تلقینِ صبر و شکیبائی کروں ؎

از دستِ گدای بی نوا ناید ہیچ ۔۔۔ جز آنکہ بصدقِ دل دعائی بکند

حق تعالیٰ ذاتِ ستودہ صفات کو دائماً اور ابداً جاہ و جلال و دولت و اقبال کے ساتھ سلامت باکرامت رکھے!

عریضہ نگار[۲] اسد اللہ المتخلص بہ غالب

مرقومۂ یکشنبہ ۲۱ شعبان و ۲۷ مارچ سالِ حال

(۱۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

ایک خط مشتمل اپنے حال پر[۱] اور ایک خط جناب بیگم صاحبہ و قبلۂ مغفورہ کی تعزیت میں روانہ[۲] کر چکا ہوں۔ اب ایک قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ایک کا تعمیہ ہے، لیکن تعمیہ کتنا خوب اور بے تکلف ہے!

عرضداشت اسد اللہ۔ معروضۂ ۱۳ رمضان و ۱۷ اپریل سالِ حال[۳]

جنابِ عالیہ از بخشش حق	بہ فردوسِ بریں چون کرد آرام
سخن پرداز غالب سالِ رحلت	"خُلد و خُلد" گفت از روی الہام

(۱۲۷۵ھ)

(۱۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں۔ آج دوشنبے کا دن ۱۴ رمضان المبارک کی اور ۱۸ ماہِ اپریل کی صبح کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور منشورِ عطوفت لایا۔ میں نے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا۔ تعجب ہے کہ میرے دو خطوں کی رسید اس عنایت نامے میں مرقوم نہیں۔[۳] یا نہ پہنچے، یا پہنچے اور نہ پڑھے گئے، کچھ معلوم نہیں۔

پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموع پسندار دو[۱] کی نقل مرتب ہے اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ [illegible] بہادر[۲] نے کلکتے سے میرے پنسن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتے کو

بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور باربرداری مانگی۔ آج سواری اور باربرداری پہنچی، اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔ بلکہ اسی نیاز نامے میں کچھ حسنِ طلب بھی تھا۔ افسوس کہ ایسا خطِ ضروری نہ پہنچے!

دوسرا خط جنابِ عالیہ مغفورہ کی تعزیت میں تھا۔ اُس کا بھی ذکر اس عنایت نامے میں نہ تھا۔ ناچار پہلے خط کا مضمون اس ورق میں مکرر لکھ دیا، اور دوسرے خط کے صرف ذکر پر اکتفا کیا۔ حق تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، اور صبر و ثبات و دولت و اقبال و عمر و جاہ و جلال بطریقِ دوام عنایت کرے!

دو غزلیں منجملہ بارہ غزلوں کے بعدِ اصلاح ارسال کر چکا ہوں۔ خدا کرے، پہنچ گئی ہوں! پرسوں ایک قطعہ جناب بیگم صاحبہ قبلہ کی تاریخِ وفات کا بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچے گا۔ از راہِ احتیاط وہ قطعہ اس ورق میں پھر لکھتا ہوں، اور نیز از راہِ احتیاط یہ خط بیرنگ روانہ کرتا ہوں۔ زیادہ حدِ ادب۔ عریضۂ اسداللہ خاں، معروضۂ دوشنبہ چہاردہم رمضان سنہ ۱۲۷۵ھ، مطابق ہژدہم اپریل سنہ ۱۸۵۹ع۔

قطعہ

جنابِ عالیہ از بخششِ حق	بفردوسِ بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالبؔ سالِ رحلت	"خُلُود خُلد" گفت از رویِ الہام

(۱۲۷۵ھ)

(۱۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

نوازش نامے کے ورودِ مسعود کی اطلاع دیتا ہوں، اور ہنڈوی کے پہنچنے کا شکر بجا لاتا ہوں۔ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ کے مہینے کے سو روپے پہنچے۔ خاطرِ اقدس جمع رہے۔

عزمِ ولایت کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ آپ کو ہر جگہ مظفر و منصور
و کامیاب رکھے! خدمت گزار ہوں، اور دعا و ثنا میرا کام ہے۔ بڑھاپے
نے کھو دیا۔ جز نفسے چند مجھ میں کچھ باقی نہیں۔ زیادہ حدِ ادب۔
عرضداشتِ غالب۔ معروضہ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء

(۱۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیم تسلیم گزارش کرتا ہوں۔ پرسوں ایک نیاز نامہ بھیجا ہے۔
یقین ہے کہ پہنچے گا اور اس کا جواب جلد عنایت ہوگا۔ کل نوازش نامہ
جس میں سو روپیہ کی ہنڈوی بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء تھی، شرف
ورود دلایا۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس جمع رہے۔
(شنبہ ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء)

(۱۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجا لانے آدابِ نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ یہ میرا دردِ دل ہے۔
نامۂ تہنیت میں اس کا اندراج مناسب نہیں جانتا۔ میں انگریزی سرکار
میں علاقہ ریاستِ دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے، مگر
عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں
نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائی مروارید، خلعت مقرر ہے
لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوزی یہاں آئے نہیں۔
اب یہ نواب معلی القاب آتے ہیں۔ زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم،
کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدردان، جناب اڈمنسٹن
صاحب وہ کبھی چیف سکرتر رہے، لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے
تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔ اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بے گناہ ہوں

یا گنا ہگار، مقبول ہوں، یا مردود۔ با نا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں؛ لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے! بہر حال اس تشویش میں ہوں۔ راہِ چارہ مسدود، اور دُکھ موجود۔ عرفی[۲] خوب کہتا ہے ؎

مرا زمانۂ طنّاز دست بستہ و تیغ ۔۔۔ زند بفرقم و گوید کہ "ہان" مہی مگذار

فقط۔ مرقومۂ صبحِ یکشنبہ، نومبر سنہ ۱۸۵۹ع[۳]

(۱۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجا لانے آدابِ نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ منشورِ عطوفت پہنچا۔ نوّابِ عالی جناب کی ملازمت کا حال بسبیلِ اجمال مندرج تھا۔ میں از روی اخبار بتفصیل دریافت کرچکا ہوں۔ ہندوستان میں کسی رئیس کے واسطے یہ بات کاہے کو ہوئی ہے! مسند تکیہ کسی کو کب ملا ہے! یہ کمالِ عزّ و شان اور استحکامِ بنائی ریاست کا نشان ہے۔ لطف یہ ہے کہ اب صاحبانِ کورٹ آف ڈرکٹر[۳] حائل نہیں رہے۔ نوّاب گورنر جنرل بہادر نائبِ سلطنت ہیں۔ اس صورت میں جو کچھ انھوں نے دیا ہے، وہ عطیہ حضرت فلک رفعت ملکۂ معظّمہ کا ہے۔ ایسے شاہنشاہ کی سرکار سے ویسا وہ سروری کا عطا ہونا، بہت بڑی نوازش اور سزاوارِ صد گونہ نازش ہے۔ یہ چار بالشِ امارت اور کاشی پور کا ضمیمۂ ملکِ موروثی ہونا، پہلے آپ کو، اور پھر ولیعہد بہادر[۵] کو اور پھر آپ کے اولاد و اخوان و انصار کو اور سب کے بعد غالبِ دعاگوی گوشہ نشین کو مبارک ہو! زیادہ حدِّ ادب۔

مرقومۂ صبحِ یکشنبہ، ۲۷ نومبر ۱۸۵۹ع[۶]

(۱۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب نیاز بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ سو روپے کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجے گا، تو چلا جائے گا؛ لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو، اور بہت جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔ مرسلہ اسد اللہ غالب۔ معروضۂ صبح پنجشنبہ ہشتم دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء بجوابِ ورودِ عنایت نامہ مرقومہ ماہِ حال۔

(۱۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب نیاز بجا لاتا ہوں، اور مزاج اقدس کی خبر پوچھتا ہوں، اور بکمالِ ناچاری، بصد گونہ شرمساری، عرض کرتا ہوں کہ آج سہ شنبہ ۷ فروری کی ہے۔ جو لوگ کہ میرے ساتھ ہیں، گوش بر آواز ہیں؛ اور جو وظیفہ خوار دلی میں ہیں، وہ چشم براہ ہوں گے۔ زیادہ حدِ ادب۔

خوشنودی کا طالب، غالب

صبح سہ شنبہ ۷ فروری سنہ ۱۸۶۰ء

(۲۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

تقدیم مراسم تسلیم کے بعد مدعا اس گزارش کا ہے کہ عالم دو ہیں: ایک عالم شہادت، ایک عالم غیب۔ جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالم غیب میں آپ کا اقبال مجھ کو مدد پہنچا رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ کہ وہ نقشہ پنسداروں کا، جو یہاں سے صادر کر گیا تھا، وہ اب صادر ہو کر حکم آ گیا۔ حکم بہ نسبت ہر ایک کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت ہوئے۔ سو روپیہ جن کا تھا، ان کے پچاس بھی ہیں اور پچیس بھی ہیں، اور دس بھی ہیں۔

اب فرمائیے، میرے واسطے کیا احتمال گزرتا ہے۔ یاس کلّی ہے، لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگزاشت کا حکم۔ طرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورمنٹ کا حکمِ منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے عملے میں اور وکلا اور اہلِ شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔ بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال، اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔ سو یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہو جائیں گے، اور جو معلوم ہوگا، وہ عرض کیا جائے گا۔[1] غالب - ۲۲ اپریل ۱۸۶۰ء[2]

(۲۱)

حضور،

سنہ ۱۸۵۸ء میں، یہ قصیدہ کہ گویا نامہ معلوم ہے، میں نے حضور میں بھیجا تھا اور بریلی کا[3] ملک ملنے کی تہنیت دی تھی۔ بعد اس کے حضرت کو دامنۂ کوہ کی بحالی، یعنی کاشی پور ملا۔ گویا یہ میری تحریر غلط ہو گئی۔ الحمدللہ انجامِ کار جو میں نے قصیدے میں قصد کیا تھا، وہی ہوا۔ اب ارشاد ہو کہ میں لسان الغیب ہوں یا نہیں؟[4] فقط

چون نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل — دانم کہ تو دریائی [illegible] ساحل

در بادیہ بر گورِ غریبان، ز چہ سوزد؟ — آن شمع فروزان کہ بود [illegible] محفل

زان خسروِ خوبان چہ قدر چشمِ وفا بود؟ — صد حیف، کہ شد نقش [illegible] ہمہ باطل!

افسانۂ غم گر ببرایم، نبود عیب — با دوست کہ پیوستہ [illegible] غم اندر دل

میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ "تن زن — چون می ندہد داد، ز فریاد چہ حاصل؟"

از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار — دل گفت کہ "ہان شیوۂ عشاق فرو ہل"

تا کس نبرد ظن کہ بشاہد بودم روی — حاشا، کہ حکایت کنم از لیلی و محمل!

شاہد بود آن دوست کہ اندر غزل او را — خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل

من نالم ازان دوست که در عالم انصاف | شایان بودش، گویم اگر خسرو عادل
او خسرو خوبان بود و بنده گدایش | او قلزم و عمان بود و من خس ساحل
گر خواجه بهانست و گر دوست همانست | مائیم و یقینی که بوحدت شده کامل
خود هر چه بهر دم همه با اوست کزین پیش | امید کهم بود بهر وادی و منزل
یا رب! چه [illegible] که بگیرد خبر از من | بربسته برد یم در ارسال رسائل
ای یوسف ثانی [illegible] همه عالم | مشتاق جمال تو، چه دیوانه، چه عاقل
گر نام تو در بحر نگنجید، زبان تبیست | شد نام نظیر تو و همنام تو داخل
تا نزد تو چون آیم و دور از تو چه سازم | ماندن ز تو دشوار و رسیدن بتو مشکل
ای کاش، بگوئی تو چنین روی نمودی | زینسان که فرو رفته مرا پای درین گل!
چونست که گاهی نکنی روی بدین سوی؟ | از حیثیت که هرگز نهی دایه بسائل!
گر جان دهم از غصهٔ تو دانی که بگیتی | حرفی غلط از صفحهٔ هستی شده زائل
خواهی که مرا بنگری از دور، بفرمای | تا نزد تو آرند یکی طائر بسمل
از صنعت استاد ازل دان که ز هر سوی | چون قبله نما، سوی توام [illegible] مائل
غالب بسخن نام من آمد ازل آورد | دانی که درین شیوه نیم عاجی و جاهل
در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب | این آیهٔ خاصست که بر من شده نازل
من گنجم و گردون بگل اندوده درم را | می بین، در گنج ارچه کشودن شده مشکل
خود در خور ویرانه بود گنج گرانمند | غم نیست، گر آبادی دهلی شده زائل
هاروت، فسون نفس گرم چه داند؟ | اعجاز ز دهلی بود و سحر ز بابل
آن را که صریر قلمم هوش رباید | دیگر نبرد ذوق ز آوازهٔ عنادل
توقیع بریلی شو فرخنده! که من نیز | بستم بفزه مندی خویش از کرمت دل
حاشا که ستانم رقم قاضی و مفتی! | حاشا که پذیرم عمل شحنه و عامل
بفرست خردمند کسان را بگوشت | در جیب گدا ریزه قلیلی ز مداخل
هر سال ازان شهر من دایه روان ام | کز بهر همین گشته در اقطاع تو شامل

امید کہ لب تشنگیٔ من نہ پسندی — زان رشحہ کہ بر صفحہ فشانی ز انامل
امید کہ بپذیری و بر من نکنی قہر — بپذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل
امید کہ آن شیوہ نورزی کہ نگویم — کز دردِ دلم فارغ و از من شد غافل
ای رای تو در روشنی از مہر فزون تر — ای روی تو در حُسن دو چند از مہِ کامل
تا مہر بیک سال کند دائرہ را دور — تا ماہ بیک ماہ کند قطعِ منازل
باشی بسپہرِ شرف آن ماہ کہ باشد — در نور بہ خورشیدِ جہانتاب مقابل

(۲۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

شکرِ بندہ پروری بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ کل ۱۲ جولائی کو نوازشنامہ مع سو روپیہ کی ہنڈوی کے پہنچا، اور روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ متوقع ہوں کہ یہ عطیہ چوتھی پانچویں انگریزی کو جیسا کہ ہمیشہ پہنچتا تھا، پہنچا کرے۔ دسویں بارھویں نہ ہوا کرے۔[۵] تم سلامت رہو قیامت تک۔

خوشنودی کا طالب غالب

صبح جمعہ ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۶

مطابق ۱۳ جولائی سنہ ۱۸۶۰ ع

(۲۳)

ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت![۳]

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامے کے ورود سے میں نے عزت پائی۔ سو روپیے کی ہنڈوی بابت مصارف مارچ سنہ ۱۸۶۱ کے پہنچی۔ زرِ مندرجہ معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس قرینِ جمعیت رہے۔ کلیات فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول ہونے سے مجھ کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔[۵]

تم سلامت رہو قیامت تک! عنایت کا طالب، غالب

صبح یکشنبہ ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۶۱ ع

(۲۴)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم توڑے اور خلعت کے عطیے کا آداب بجا لاتا ہوں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، اور اپنی اولاد کی اولاد کی شادیاں کرنی اور اُن شادیوں میں توڑے اور خلعت کی تقسیم نصیب ہو۔[2]

یہ تحریر نہیں، مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریقِ انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپیے ناموجب، جو توڑہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا، اور اس میں لباس نہ بناؤں گا، تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں؟[3] ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب غالب۔ دوشنبہ بحسابِ تعزیہ داراں پانچویں، اور از روی

دو ج ۶ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ ھ

(۲۵)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آٹھ سات برس سے مصدرِ خدمت اور شریکِ دولت ہوں۔ لازم کر لیا ہے کہ بیہودہ گزارش نہ کروں اور کبھی کسی کی سفارش نہ کروں۔ بھائی حسن علی خاں کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب کو لکھا، اس کو میں سفارش نہ سمجھا تھا۔ مخبر بنا، اور آپ کے اہل کاروں کو اس بات کی خبر دی کہ جس کا تدارک صاحبانِ ملک و حاکمانِ عہد پر لازم ہے، سو بمقتضائے نصفت و عدالت وہ مقدمہ فیصل ہو گیا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو[6] واللہ باللہ، اگر میں نے بھیجا ہو! نوکری کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ، اور میرن مرثیہ خواں اور یہاں کے مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ

ہوا ایسے ہیں اور ایسے ہیں، غرض اس سے یہ تھی کہ محرم میں جہاں دس پانچ
مرثیہ خوان اور مقرر ہوتے ہیں، میرن بھی مقرر ہو جائیں۔ آخر جا بجا تھانیدار،
کوتوال، [illegible] اور نوکر ہیں۔ میر سرفراز حسین ہوشیار اور کارگزار آدمی ہیں۔
کسی علاقے پر یہ بھی مقرر ہو جائیں۔ یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک
ہو جاتا، بہتر تھا، ہوا بہتر۔ درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف معرّف ہوتا تھا۔
سپارش کرتا، تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا؟ میری طرف سے خاطر عاطر جمع رہے[۵]

ز سینہ تا بلبم سالہا نیاید راہ
ہر آن نفس کہ رضای تو اندر آن نبود[۶]

داد کا طالب، غالب۔ دوشنبہ ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۱

(۲۶)

ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں، اور طلوعِ ستارۂ اقبال کی مبارکباد
دیتا ہوں۔ یقین ہے کہ اس سفرِ فیض اثر میں "ریل گاڑی" کی سواری کی بھی
سیر دیکھ لی ہوگی۔ یہ اس میمنت و شکوہ و شوکت سے علاوہ ایک تماشا نیا
دیکھا۔ حق تعالیٰ حضرت کو سلامت باکرامت رکھے[۱]!

دعاگو ایک مہینا بھر سے بیمار ہے۔ ابتداء ہی قولنج دوری[۲]۔ بسببِ
استعمالِ ادویۂ حارّہ کہ اس مرض میں اس سے گریز نہیں، تپ نے آ گھیرا۔
کئی بار [illegible] بھگتیں۔ اب دو بار [illegible] ہیں، لیکن طاقت بالکل[۳] سلب
ہو گئی ہے، اور ضعفِ دماغ نے قریب بہ ہلاکت پہنچا دیا ہے۔ بالفعل[۴] آب
سیب کا استعمال ہے۔

طریقۂ دعاگوئی و ثنا خوانی کی رعایت سے نوبت بسبیل تہنیت، کہ جس
میں حصولِ عطیّۂ سلطانی کی ہجری و عیسوی تاریخ ہے، بہرحال لکھ لی ہیں۔
کل وردِ عنایت نامہ سے معزز ہو کر آج وہ اشعار نذر کرتا ہوں[۵]
زیادہ حدِ ادب سے۔ تم سلامت رہو قیامت تک۔ شفقت کا طالب، غالب

پنجشنبہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۱ ع

(۲۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل ایک شعر ظہوری مغفور کا اور ایک شعر غالبِ مرحوم کا ایک ورق پر لکھ کر، صبح کو ڈاک میں بھجوا دیا۔ شام کو توقیع قیع ہرکارۂ ڈاک نے لا دیا۔ اگست سنہ ۱۸۶۱ کی پرورش کی ہنڈوی پہنچی، اور سو روپیے وصول ہو گئے۔

فقیر کا شیوہ صدق و سداد کا ہے۔ چند روز سے تفقّد و التفاتِ قدیم میں، خدانخواستہ باشد، کچھ کمی پاتا ہوں۔ اگر غلط ہے میرا گمان، تو بتشریفِ اطلاع مشرف فرمائیے[۲]؛ اور اگر میرا دل دیوانہ سچ سمجھا ہے، تو متوقع ہوں کہ عتاب کے سبب سے آگہی پاؤں[۳]۔ زیادہ حدِ ادب ٥

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضۂ صبح دوشنبہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ء [مہر: غالب ۱۲۷۸] ع

یہ عرضداشت جدا ہے، البتہ اس کے جواب کا امیدوار ہوں اور رسیدِ معمولی جدا ہے[۴]۔

(۲۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ اور روپیے کی ہنڈوی کے پہنچا۔ اگست سنہ ۱۸۶۱ کے مہینے کی پرورش کا روپیہ وصول ہوا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

[مہر: غالب ۱۲۷۸] دوشنبہ ۱۵ ستمبر ع

(۲۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی سو روپیے کے شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ مصارفِ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ کا معرض وصول میں آیا۔ ھ

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

مرقومۂ دہم اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ ع

خوشنودیٔ مزاج کا طالب غالب

(۳۰)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامۂ ربوبیت طراز، مورخۂ ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء، ۱۴ کو مذکور کو میں نے پایا۔ ڈیڑھ سو روپیے کی ہنڈوی کا شکر بجا لایا۔ کہاں تک شکر بجا لاؤں گا! کس کس عنایت کا سپاس ادا کروں گا!

"شکرِ نعمتہای تو چندانکہ نعمت ہای تو"

اب سنیے اپنے دعاگو کی داستان: منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے "خلعت عطا کیا، اور فرمایا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا"۔ میں نے عرض کیا کہ "میں انبالے جاؤں؟" فرمایا: "البتہ انبالے جانا ہوگا"

بعد جنابِ نواب صاحب کے جانے کے شہر میں شہرت ہوئی کہ دلّی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں۔ گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ آپ خط اپنا دے آیا۔ زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔ پھر خط کے جواب میں خطِ محررۂ ۱۰ مارچ آیا۔ چنانچہ لفافہ بلجانبا گرانیٔ وزن رہنے دیتا ہوں اور خط بجنسہٖ حضرت کو بھیجتا ہوں۔

کل سے ایک اور خبر اڑی ہے کہ نصیبِ اعدا لارڈ صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے؛ انبالے میں دربار نہ کریں گے، اور شملے کو چلے

جائیں نے۔ اب میں دو وجہ سے بَینَ السّفرِ والسّکُون متردد ہوں: پہلی وجہ خاص، دوسری وجہ عام۔

دو سو میں سے سو روپے کر ساز و سامان درست کیا ہے، اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرچ راہ کے واسطے رہنے دیے ہیں۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگواؤں گا۔ جو حکم آئے گا، آپ سے عرض کر کے اُس کی تعمیل کروں گا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضۂ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء (مہر: غالب ۱۲۰۸)

(میرزا صاحب نے ایک پیڈ ضروری عریضہ سہ شنبہ ۲۸ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء کو لکھا تھا۔ مثل میں اُس کا صرف لفافہ موجود ہے، اور اُس پر میر منشی صاحب دارالانشا نے تحریر کیا ہے: "عرضی درحضور ماند")

(۳۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ جب انبالے میرا جانا نہ ہوا، تو میں نے قصیدۂ مدح، جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نوابِ معلّی القاب کی نظر سے گزرانیں۔[۲] اور یہ دستورِ قدیم تھا کہ جب میں قصیدۂ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بے واسطۂ حکامِ ماتحت مجھ کو آجاتا۔ اب جو میں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا۔ صدائی برنخاست۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا، بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسمِ تحریرِ خطوط نہ رہی، تو دربار اور خلعت کہاں[۳]؟ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا۔ وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔ جی چاہتا تھا کہ اصلِ خط مع سرنامہ بھیج دوں، تاکہ حضور ملاحظہ فرمائیں؛ مگر

برسات کا اندیشہ مانع آیا۔ نقل سرنامے اور خط کی بھیجتا ہوں ۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

حضور کی خوشنودی کا طالب، غالب

صبح سہ شنبہ ۴ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۴

(۳۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے معروض ہے۔ نوازش نامہ اور اس کے ساتھ دو ہنڈیاں دو سو آموں کی پہنچیں ۔ شکر نعمتہای تو چندانکہ نعمتہای تو! زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

سہ شنبہ پنجم جولائی سنہ ۶۴ ع

(۳۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت مع قطعۂ ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ ماہیہ بابت تنخواہ جولائی سنہ ۱۸۶۴ کی معرضِ وصول میں آیا فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نزحم کا طالب، غالب

۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۴

(۳۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ ماہیہ بابت تنخواہ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ نہم ستمبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ صدورِ والا نامہ سے میں نے عزت پائی۔ بذریعہ ہنڈوی سو روپیہ بابت تنخواہِ ماہ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ وصول ہوئے۔ زیادہ حدِّ ادب۔

ترحم کا مستحق اور تفقد کا طالب، غالب

دوشنبہ دہم اکتوبر ۱۸۶۴ عیسوی

(۳۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم و نیاز معروض ہے۔ جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاج مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبرِ وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا، اور قطعۂ تاریخ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں۔ اور حقیقتِ مرض سے آگہی حاصل ہو۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

تمہاری سلامتی کا طالب، غالب

۸ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ابتدائی یکم نومبر سے ۱۱ تک، عرض نہیں کرسکتا کہ لیل و نہار مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ راہ دُور، ہیں رنجور، معہذا بیمقدور۔ اگر دلّی سے رامپور تک تنکرم کی ڈاک جاتی ہوتی، تو یہاں ایک دم نہ ٹھہرتا[1] اور خدمت میں حاضر ہوتا۔ تارِ برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہِ اضطرار ۸ ماہِ حال، یعنی نومبر کو عریضہ روانہ کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشدِ کامل، یعنی حضرت کی ہدایت نے اُس خط کے[2] جواب آنے کی مدّت سے پہلے مجھے گردابِ اضطراب سے نکالا۔ کل ۱۲ نومبر کو نوازش نامہ آگیا۔ گویا میری جان بچ گئی، بلکہ ایک اور نئی جان میرے بدن میں آ گئی۔ اب استدعا یہ ہے کہ حالِ ناسازیِ مزاجِ اقدس مفصل معلوم ہو۔ زیادہ حدِّ ادب[3]

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عافیت کا طالب، [مہر: غالب ۱۲۷۸]

یکشنبہ ۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ بابتِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عافیت کا طالب، غالب

۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۳۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کس زبان سے کہوں، اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے! ہر روز شام تک جانبِ درنگراں رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے، اور حضرت کا نوازشنامہ لائے بارے، خدا کی مہربانی ہوئی، از سرِ نو میری زندگانی ہوئی کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ عطوفت نامۂ عالی دیا، جس کو پڑھ کر روحِ تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیند کس کی، سونا کس کا! روشنی کے سامنے بیٹھا اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سات شعر مع مادۂ حصولِ صحت جب لکھ لیے، تب سویا۔ اب اس وقت وہ مُسوّدہ صاف کرکے ارسال کرتا ہوں

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر و عافیت کا طالب، غالب

۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۴

(۴۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ عزّ ورود لایا۔ از روی ہنڈوی سو روپیہ بابتِ تنخواہِ ماہِ نومبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

تمھاری سلامتی کا طالب، غالب

۱۳ رجب ۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۴

(۴۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! چوب چینی کے

ارسال کا حکم ڈاک سے میں نے نہیں پایا۔ ۲۲ دسمبر کو ہرکارہ آیا۔ نوازش نامہ شرف افزا لایا۔ دِلّی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کنپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطرافِ شہر کے رؤسا۔ بہرحال تین چار دن میں ہر ایک جگہ سے منگوا کر، رنگین و سنگین دیے گرہ یا کم گرہ خود چُن کر، پانچ سیر قطعاتِ چوب چینی ایک ٹھلیا میں رکھ کر، آٹے سے مُنھ بند کیا، پھر کپڑا لپیٹا، ڈوری سے خوب مضبوط باندھ کر، دو جگہ اپنی مہر کی اور وہ ٹھلیا کہار کو سونپی ہے

تم سلامت رہو قیامت تک ! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

روزِ دوشنبہ ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء، وقتِ صبح حوالۂ کہارِ سرکار۔ [مہر: غالب ۔ ۱۲۷۸ھ]

(۴۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامے کے ورود سے عزّت اور ادراکِ صحت و عافیتِ مزاجِ اقدس سے مسرّت حاصل ہوئی۔ پرچہ ہنڈوی اُس توقیع میں ملفوف پایا۔ سو روپیہ بابتِ تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک ! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

حضور کی سلامتی کا طالب، غالب

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۵ عیسوی

(۴۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور کے ورودِ مسعود نے میری عزّت بڑھائی، اور اُس میں تنخواہِ فروری سنہ ۱۸۶۵ کی ہنڈوی پائی۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ سو روپیہ حضرت کا تصدق پایا

الٰہی، وہ دن جلد ہو کہ جو ہیں سُنوں کہ حضرت نے غسلِ صحت فرمایا!
تم سلامت رہو قیامت تک!
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!
نجات کا طالب، غالب
۱۱ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء

(۴۴)

بحضرتِ فلک رفعت، نواب معلّی القاب، انجم گروہ، آفتاب شکوہ، بخشش و بخشائشِ بینوایان را توانگرکن و ناتوانان را توانا ساز، در عزّ و جاہ با تاجداران ہمسرو در ملک و سپاہ با شہریاران انباز، کہ بفرزانگی حلقہ در گوش افگنندۂ دانش گستران، و بمردانگی غاشیہ بر دوش نہندۂ دلاوران ہرچہ از نیایش و ستایش بتقدیم ہمی رسد، حرز بازوی ہمت است، تا بدان نیرو در سخن دلبری تواند کرد۔

ہمانا از راز سپہر و ستارہ سخن ہمی رود و خجستگی و فرخندگی چند گفتہ می شود این نا فہفتہ کہ راستان در باستان این را "بہرام روز" میگفتند و اکنون "سہ شنبہ" نام دارد، روز بیست فیرور، دیژہ درین سالِ فرخ فال کہ دو ہمین روز است از فروردین، در روز بیست[۲] و یکم از مارچ، در روز بیست و دوم از شوال. باری، نخست بر آن سرورِ نشاہ نشان کہ امروز تشستنِ اندام آبرد می گرمابہ افزود، مبارک، و سپس بر غالبِ سخندان کہ عافیت جوی و دعاگوی این درگاہ ستنا، ہمایون!

ہمانا درین روزگار، خسرو ستارگان کہ مہرِ منیرش دانی، در برّہ، و از سوی فرازنخستین سیارگان کہ زحلش خوانی، در ترازو، سعدِ اکبر بہ قوس، و سعدِ اصغر بہ ثور، آن و دنیّر بہ بیت الشرف خوشنود و شاد، و این دو اختر یکانشانہ ہای خوشتین آباد۔ گمان ندارم کہ از خسروان پارس و سلاطینِ عرب

هیچ کس را چنین طالعی بهرِ جلوس اتفاق افتاده باشد، که حضرتِ ولیّ نعمت را برای غسلِ صحت دست بهم داده است۔ خرد تا گفتارِ مرا شنود، چشمک زد و به بیچاره سرود که "ای در درخشانیِ[1] انجم آفتاب، چون کودکان در بال افشانیِ کرمکهای شب تاب، نگران! از حلقهٔ[2] اختر شماران بدر آی، و به بستانِ حکمای روحانی رمزی از حکمتِ ایمانی بشنو، تا بدانی که بدین امیر مسند سریر، سلطان نظیر، عمرِ جاودانی و دوامِ لذتهای روحانی بخشیده اند۔" گفتم: "تا برهان نباشد" کالبدِ سخن را جان نباشد۔ مرا بے خیر مپندار، و اگر حجتی داری، بیار۔" گفت: "برهانی ازین ارجمند تر و حجتی ازین خرد پسند تر چه خواهد بود که چون آفریدگان را در آن جهان عمرِ دوباره دهند، دیگر بیمِ مرگ برخیزد و به بانگِ صور از خوابِ فنا جستگان در آن گیتی جاوید پایند۔ مگر صحتِ خداوند ازین رنجوریِ هولناک[3] بدان ماند که پنداری عمرِ دوباره یافت؟ پس اقتضای دوباره زیستن تغیر چرا پذیرد؟ و چون هستی یافتگانِ آن جهان در آن جهان جاودان زنده مانند، آنکه درین گیتی حیاتِ ثانی پذیرفته باشد، هم درین گیتی همیشه زندگانی چون نکند؟ این عمرِ عزیز که بخدایگان داده اند، عمرِ خضر و الیاس نباشد، که یکی را بشمردنِ ریگِ صحرا، و دیگری را به پیمودنِ آبِ دریا گزرد۔ انشاء اللہ العظیم، جنابِ عالی، تا جهان است، پرویز بزم، تهمتن رزم، دشمن گداز، دوست نواز، بلب در سخن اختر فشان، و بکف درم گوهر فشان خواهند زیست۔

قطعهٔ تاریخ غسل صحت، و قصیدهٔ تهنیت که پیش ازین فرستاده ام[4]، نظمی است شاعرانه، و این نگارش نثریست عارفانه، قانونِ حکمت و شریعت را جامع، هم از روی نقل حق، و هم از روی عقل راست بقای خداوند و تعبیرِ تازه جاودانی، و نشاطِ بی اندازه بیشکارِ این حیاتِ

ثانی باد! چارشنبہ ۲۳ شوال سنہ ۱۲۸۱ھ و ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ -
(مہر غالب ۱۲۷۸)

"بحضورِ نواب صاحبِ والا مناقب عالی شان، قلزم فیض و عمان احسان، امیر المسلمین نواب کلبِ علی خاں بہادر دام اقبالہٗ مقبول باد

[نواب سید محمد کلبِ علی خاں بہادر خلدِ آشیاں، نواب فردوس مکاں کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ جنابِ عالیہ فیروز النسا بیگم صاحبہ، ملقب بہ نواب بہو بیگم، دخترِ سید عبد العلی خاں بہادر، خلفِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے بطن سے ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۹ اپریل سنہ ۱۸۳۵ء) کو اتوار کے دن صبح کے وقت متولد ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں گورنر جنرل کی منظوری سے ولیعہدِ ریاست اور ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو جمعے کے دن، ۳۰ سال کی عمر میں مسند نشین ہوئے۔ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۰ جون سنہ ۱۸۶۵ء) کو مسٹر جان انگلس، ایجنٹ ریاست و کمشنر روہیلکھنڈ نے رامپور آکر باضابطہ رسم مسند نشینی ادا کی۔ ماہِ رجب سنہ ۸۲ھ (دسمبر سنہ ۶۵ء) میں ملکۂ معظمہ کی جانب سے خلعت آیا، اور اسی مہینے میں جشنِ جلوس منایا گیا۔ آپ بڑے حاتم دل، پابندِ شرع، بامروت اور خلیق تھے۔ باقاعدہ زکوٰۃ ادا کرتے، اور غیر شرعی آمدنی سے خزانے کی دولت کو پاک رکھتے تھے۔ خود صاحبِ علم تھے، فارسی خلیفہ غیاث الدین عزت، صاحبِ غیاث اللغات، سے حاصل کی، اور علومِ حکمیہ مولوی فضلِ حق خیرآبادی اور مولوی عبد الحق خیرآبادی سے پڑھے۔ ان کا دربار اہلِ کمال سے بھرا رہتا تھا۔ مشرقی علوم و صنائع کا شاید ہی کوئی ایسا ماہر ہو جو ان کے خوانِ جود و کرم کی زلہ ربائی نہ کرتا ہو۔ ان میں علما، شعرا، ادبا، خطاط، صحاف، طباخ، اور دیگر تمام ہنروں کے ماہرین شامل تھے، علمی مباحثوں کا بہت شوق تھا۔ روزانہ دربار میں کسی نہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر اہلِ دربار طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ آپ خود برابر کا حصہ لیتے، اور اس طرح اپنے معلومات کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر بناتے

رہتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور اُنھیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔
اُس عہد میں جس قدر نایاب اور نادر کتابیں مہیا کی گئی ہیں، وہ اپنی اہمیت
اور قیمت کے لحاظ سے مستقل کتاب خانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فارسی
ادبیات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جب کوئی نئی فارسی کتاب خرید
فرماتے، اُس کے سرورق پر اپنے قلم سے تاریخِ آمد وغیرہ لکھتے۔ اُردو
فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے، اور نوآب تخلص فرماتے تھے۔
فارسی کلام مرزا محمد تقی خاں سپہرؔ، مؤلف تاریخ التواریخ، کی نظر سے
گزرا تھا۔ اُردو کلام امیرؔ مینائی لکھنوی دیکھا کرتے تھے۔ ایک فارسی
نثر مرزا غالبؔ کو بھی اصلاح کے واسطے بھیجی تھی، مرزا صاحب ان کی طرزِ
نگارش کے بیحد مدّاح تھے۔ تصنیفات میں چار اُردو کے دیوان، دیوان
فارسی، تاریخِ شاہانِ سلف، انتخابِ بوستانِ خیال اور متعدد
نثریں ہیں۔ اخبار بینی کا بھی شوق تھا۔ دبدبۂ سکندری، جو رامپور کا
پہلا اخبار ہے، اُنھیں کے ایما سے ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۸۳ ہجری
(۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) سے ہفتہ وار شائع ہونا شروع ہوا۔
آپ نے ۲۲ سال، ۷ ماہ کی حکومت کے بعد ۵۳ سال ۷ ماہ ۷ روز کی
عمر میں بُدھ کے دن ۳ بجے کے وقت ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۳۰۴ھ
(۲۳ مارچ سنہ ۱۸۸۷ء) کو انتقال کیا۔ امیرؔ مینائی نے "خوابگاہِ
حامیٔ اسلام امیر المؤمنین" سے تاریخِ وفات نکالی ہے۔)

(۴۵/۱)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعدِ تسلیم معروض باد۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی صد روپیہ عز ورود لایا
اپریل سنہ ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔
زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عنایت کا طالب، غالب

۶ مئی سنہ ۱۸۶۵ عیسوی[1]

(رباعی)

سرتاسرِ دہر عشرتستانِ تو باد! صد رنگ گلِ طرب بدامانِ تو باد!

عیداست و بہار خرّمی ہا دارد جانِ من و صد چو من، بقربانِ تو باد!

عنایت کا طالب، غالب شنبہ، صبحِ روزِ عیدِ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۱ ہجری نبوی[2]

(۴۶/۲)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے تہنیت نامہ ارسال کرچکا ہوں، جواب پاچکا ہوں۔ قصیدے کا لفافہ ارسال کیا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا[3]۔

حضرت فردوس مکانِ سپہر آستاں کا معمول تھا کہ محرم سے دو تین مہینے پہلے سلام پانچ سات لکھتے تھے، اور فرداً فرداً میرے پاس بھیجا کرتے تھے۔ جب وہ فراہم ہو چکتے، تو محرّم سے دو چار دن پہلے میں اصلاح دیکر بھیج دیا کرتا تھا۔ اب کے برس ایک ہی سلام بھیجنے پائے بس۔ آج وہ سلام اِس مراد سے حضور میں بھیجتا ہوں کہ حضور کے حکم سے حضرت کے دیوان میں شامل ہو جائے۔ زیادہ حدِّ ادب[4]

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں![5]

عنایت کا طالب، غالب

شنبہ، یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲[6]

(۴۷/۳)

حضرت ولیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حق تعالیٰ، جَلَّ جَلالُہٗ وَعَمَّ نَوالُہٗ جس گروہ پر

مہربان ہوتا ہے، وہاں حاکم عادل رحیم بھیجتا ہے، کہ وہ بقوّتِ عادلہ کفر و بدعت کی جڑ اُکھاڑ ڈالے،[۱] اور بصفتِ رحم رعایا کو پالے۔ مصداق اس کا ذاتِ قدسی صفاتِ جنابِ عالی ہے، کہ قمار خانے کی بِنا مِٹا ڈالی ہے۔ زہے قانونِ سیاست! غلّے کا محصول معاف کر دیا ہے، روپیہ رعیّت پر نثار کیا ہے۔ زہے آئینِ ریاست![۲] ؎

رباعی

نوّاب کہ شد ز شوکتِ اقبالش بخشیدنِ باج غلّہ از افضالش[۳]
فارغ شد ہر کسی و رودادؔ فراغ ہم "فارغ" و ہم "فراغ" باشد سالش

پیر و مرشد، حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اُس کی رسید میں خطِ تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں، ۱۱۵ کی ہنڈوی اُس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی۔ دو قصیدے مدحیہ، میرے دیوانِ فارسی میں مرقوم، اور وہ دیوان حضرت کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ خطوں کی تصدیق از روی دفتر ہو سکتی ہے یہ رسم بُری نہیں ہے۔ اگر جاری رہے، تو بہتر ہے۔ زیادہ حدِّ ادب۔

التفات کا طالب، غالب پنجشنبہ ۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۱

(۴۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے [illegible] نامہ مع سَو روپے کی ہنڈوی کے عزّ ورود لایا۔ مئی سنہ ۱۸۶۵ کا مشا[illegible] وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار [illegible]س! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

التفات کا طالب، غالب

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۵ عیسوی[۶]

(۴۹/۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ روزِ پنجشنبہ ۱۵ جون کو ایک عرضداشت روانہ کرچکا ہوں۔ یقین ہے کہ وہ آج پہنچے گی۔ کل ۱۷ جون کو فرح بخش و روح افزا نوازش نامہ پہنچا! قصیدے کا پہنچنا اور اُس کا مقبول و منظور ہونا دریافت کرکے اپنی بخت و قسمت پر میں نازاں ہوا! اب عرض یہ ہے کہ حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوانِ فارسی میں، جو کتاب خانے میں موجود ہے، درج کیا جائے اور سلام حضرت فردوس مکاں کا اُن کے دیوان اُردو میں لکھ دیا جائے۔

حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا؟ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرام بیت المعمور رامپور باندھا، اِنْشَاءَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْم۔

پیر و مرشد، ازراہِ خیر خواہی ایک امر عرض کرتا ہوں۔ محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں، رئیس ٹونک، نے بعدِ مسند نشینی گورنمنٹ کو "یمین الدولہ" اور دو حرف "ملک و جنگ" لکھ کر دیے، اور وہاں سے وہ اُن کو عطا ہوئے۔ حضور کے اجداد امجاد نے سلاطین بابریہ کا خطاب نہ قبول کیا۔ مگر حضرت کے جدِّ امجد کو احمد شاہِ دُرّانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا۔ حضرت اگر مناسب جانیں، تو اُس خطاب کو مع دو حرف "شمس الملک و بہرام جنگ"، جناب ملکۂ معظمہ سے بذریعۂ گورنمنٹ اپنے واسطے لیں؟

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

ترقیِ دولت کا طالب، غالب۔ یکشنبہ ۱۸ جون سنہ ۱۸۶۵ء

(۵۰/۶)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت کے ورود نے معزز فرمایا۔ جون سنہ ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا سو روپیہ اور وہی ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! — دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عنایت کا طالب، غالب

معروضۂ دہم جولائی سنہ ۱۸۶۵

(۵۱/۷)

حضرتِ ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ میری عرضداشت کا جواب آ چکا ہے، بندہ ہنڈوی کی رسید بھجوا چکا ہے۔ یہاں خلق کو مینہ درکار ہے، اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور، اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز، ہوا جانستاں، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔ جز اعضای انسان کے، کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں۔ باؤ چلتی ہے۔ بامطلق ہوا نہیں ان سطور کی تحریر سے مدعا یہ ہے کہ مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ حضرت کا مزاج کیسا ہے۔ اس خط کا جواب جس قدر جلد عطا ہوگا، دعاگو پر احسان آپ کا ہوگا۔ زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آپ کی سلامتیِ ذات اور اپنی نجات کا طالب، غالب

۲۳ جولائی سنہ ۱۸۶۵

(۵۲/۹)

حضرتِ دلیٔ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض آں کہ منشورِ عطوفت عزّ ورود لایا۔ تنخواہ جولائی سنہ ۱۸۶۵ حال کا ماعہ روپیہ اندر وہی ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔ فقط

اگرچہ یہاں مینہہ اس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوتی ہے، ابرِ رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں، بنظرِ اصلاحِ نظم دہ اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۱۱ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطّۂ خاک
رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار، برس
کہاں ہے ساقیٔ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟
بیار لائیٔ گلنار گوں، بیار، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک، وہ کہے
"امیر کلب علی خاں جییں ہزار برس"
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات، اس بلاکش نے

بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس!

(۵۳/۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل برخوردار نواب مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاجِ اقدس ناساز ہو گیا تھا، اب خدا کے فضل و کرم سے افاقت ہے۔ نواب مرزا نے مجھ پر ستم کیا، کہ پہلے سے یہ حال نہ رقم کیا۔ جو دعا جب کرتا، اب بھی وردِ شب و روز ہے۔ مگر یہ خیال کہ حضور کو خیال گزرے گا کہ غالب رسمِ عیادت بجا نہ لایا، سخت جگر سوز ہے۔ اب اس خط کے جواب میں نویدِ عافیت کا امیدوار، اور یہ سوچ کر کہ آج سے آٹھویں دن جواب آئے گا، بیقرار ہوں۔

ایک عبارت کا ایک جزو بطریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ پارسل اس کا نواب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبولِ نذر کو میرا عزّ و شرف جانیں گے۔[۲] ۵

تم سلامت رہو ہزار برس : دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

دعا گو، غالب۔ ۱۳ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

(۵۴/۱۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ داستانِ حمزہ قصۂ موضوعی ہے۔ شاہ عباس ثانی[۳] کے عہد میں ایران کے صاحب طبعوں نے اس کو تالیف کیا ہے۔

ہندوستان میں امیر حمزہ کی داستان [illegible] اور ایران میں رموزِ

حمزہ" اس کا نام ہے۔ دو سو کتنی برس اس کی تالیف کو ہوئے۔ اب تک مشہور ہے، اور ہمیشہ مشہور رہے گا۔

آپ کے اس تکیہ دار، روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے مشتمل اس التزام پر کہ تشبیب کی ابیات اور مدح کے اشعار میں حمزہ اور اولادِ حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ یاران کے معاملات و حالات کا ذکر درمیان آئے۔ سو وہ قصیدہ آج اس خط کے ساتھ ارسال کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حضرت اس کو پڑھ کر محظوظ ہوں۔ خدا آپ کو قیامت تک سلامت رکھے! اگر جب تک امیر حمزہ کا قصہ مشہور رہے گا، یہ قصیدہ بھی شہرت پذیر رہے گا[۲]۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب۔ ۲۱ ماہ اگست [illegible]

یا وہاب!

زہی بہ دو چشم تو در معرضِ سیہ کاری — چو بختیارک و بختک بمردم آزاری
زہی بہ ابروی بدیع الزمانِ کشتی گیر — کہ کوہسار چو تاریخ تر بیفشاری
زہی جمالِ تو آدم ربا، چو شندکہ دیو — دماغ اہلِ نظر قافِ اوست پنداری
زغمزۂ تو چگویم؟ کہ آن بود زعمر[۳] — دلیر و چست و بہ ہنر مسند تر بعیاری
اگر تو نیستی از ساحرانِ انتریا — چرا، طلوع، ہمی آتش از ہوا باری
بدین جمال کہ داری، عجب مدار، اگر — کند عکیدۂ قدرت ترا پرستاری
بمہر روی تو گر دیدم آفتاب پرست — نہ ابر رحم کہ عشق زنان دہم بدین خواری
سپہر بندۂ ہیبت تو رخ کہ بود ماہ پرست — ترا پرستم از ین رو کہ ماہ رخساری
تو لی بمعنیٔ اصلی وجود نور الدہر — ہمین بنام کہ معنی نداشت پنداری
چکید ز زلف تو خون دلم بدانگونہ — کہ ریزد از لب زنگی در آدمی خواری
فغان زیارِ عجم و ہر کان بسنجیدن — عمود خسرو ہندا ستنہ درگرانباری

بود پلارکِ افراسیابش در کمند / کہ ہیچگہ نشود، چون ہلال، زنگاری
چگویم از نمطِ لشکرِ ظفر پیکر! / ز کہ در شمار نیاید ہمی ز بسیاری
ہمہ مقابلِ مُقبلِ، بہ ناوک اندازی / ہمہ مساہمِ خسرو، بہ طاقتِ اظہاری
بیا، بہ بین کہ در اردوی امیر کبیر / سپردہ اند علمتاہ را علم داری
چو قندر، آن کہ حلو دارِ حمزہ بود اینک / رسیدہ است بخاقانِ چین ز حلو داری
سزد کہ فخر بر اقبالِ خود کند قندر / ازین کہ یافتہ توقیعِ گرز برداری
مپرس بر درش از ہستیِ زمرد شاہ / مگر یکی بود از کافرانِ زنہاری
شنیدہ کہ خداوندِ باختر چون بود؟ / کنون بہ بندگیِ خواجہ گشت اقراری
گذشت آن کہ "چہ تقصیر کردہ ام" می گفت / بمقتضای غلط فہمی و غلط کاری
کنون بعجز "چہ تقصیر کردہ ام" گوید / ز بندگانِ خدا چون بوی رسد خواری
رموزِ حمزہ فرو ہل، خمش نشین غالب / چرا مرا بسخنہای ہرزہ آزاری؟
ز نیست رونقِ گیتی بہ دانش آرائی / ز نیست زینتِ معنی بہ نغز گفتاری
قصیدۂ تو، ولی، کاسۂ گدائی نیست / ستودہ آمدہ باشی ز رنجِ ناداری
غمین مباش کہ از گنج خانۂ نواب / خود آن نذر کہ بدل داشتی بدست آری
بوقتِ گدیہ، گدا را دعاست دست آویز / برآر دست بدرگاہِ حضرتِ باری
چراغِ دودۂ سرور، علی محمد خان / گزین نہالِ ثمر در فنِ سپہداری
زروی کلب علیخان ہمیشہ روشن باد! / چنانکہ تابشِ مہر از سپہرِ زنگاری

(۵۵/۱۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم عرض یہ ہے۔ فقیر تکیہ دار، روزینہ خوار، غالبِ خاکسار حیران ہے کہ شکر بجا لاوے آپ کی عنایت کا، یا ذکر کرے آپ کی کرامت اور ولایت کا۔ آپ بے شبہہ رونقِ مسندِ علم و یقین ہیں! تکلف برطرف، امیر المسلمین ہیں۔ یہ نہ فقط از روی ارادت ہے، بلکہ یہاں مشاہدۂ خرقِ عادت ہے

ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار اسرگرم تقاضا، بلکہ آمادہ شور و غوغا تھے۔ دو سَو روپیے کی ہنڈوی صراحی آب جہات ہو گئی، دامِ مرگ سے نجات ہو گئی۔ لطف یہ کہ آج بروزِ دوشنبہ ۲۱ اگست کو نو بجے اوّلِ روز ایک قصیدے کا لفافہ بھیجا گیا۔ اُسی دن بارہ پر تین بجے یہ کرشمۂ کرامت دیکھا گیا۔ قصیدے کے لفافے میں ایک عرضداشت ہے۔ اُس سے قصیدے کی حقیقت اور خود اُس نظم سے طرزِ نگارش کی جدّت ظاہر ہو جائے گی۔ حضرت کے انبساطِ خاطر کے واسطے یہ ایجاد ہے مجھے ہر طرح کی نظم و نثر سے آپ کی خوشی اور خوشنودی مراد ہے۔ انجام قصیدہ ہیں جو قرض کے گلے پائے جائیں اُس مجموع میں سے اہلِ بازار مٹھائی کے گئے جائیں، کوٹھی والے ساہوکار حیلِ خلیفہ گنے جائیں سہ

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترقیٔ عمر و دولتِ خداوند کا طالب، غالب
نگاشتۂ دوشنبہ ۲۱، اور روانِ داشتۂ
سہ شنبہ ۲۲ اگست سنہ ۱۸۶۵ع

(۵۶/۱۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ میں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں۔ ستّر برس کا آدمی ہوشیار ہوں۔ اور سے یہ کہا نہیں جاتا۔ حضرت پر بغیر ظاہر کئے رہا نہیں جاتا۔ خدا جانے، اور طبیب کیا سمجھے ہوں گے کہ کیا تھا۔ میرے نزدیک بہ اشتراکِ معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظِ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیلِ دریائی وجدوار کا استعمال ضرور ہے۔ اور معجونِ طلائی عنبری تقویتِ قلب میں مجوزۂ حکیم میر علی خاں مغفور ہے: ورقِ طلا، عنبرِ اشہب، عرقِ کیوڑہ، قند، کثرتِ اجزا اس ترکیبِ خاص میں ناپسند۔ کثیر الاجزا اور

معجونیں ہیں: مفرحِ بو علی سینا، خمیرۂ مروارید، خمیرۂ گاؤزبان عنبری یا اللحم غیر مشتی، جس میں طیور کے گوشت اور ادویۂ مفرح و مقوی حرارت و برودت میں معتدل۔ گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجیے۔ غذا میں گوشتِ طیور اکثر بیضۂ نیم برشت اکثر، لیکن یہ خیال رہے کہ بیضۂ مرغ و لحمِ طیور ایک جلسہ میں تناول نہ فرمائیے۔ بکری کے گوشت کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ پودینے کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دوا خانے میں موجود رہے۔ عطریات کے استعمال میں مبالغہ، بعدِ غذا مباشرت سے پرہیز۔ شوربای پاچۂ گوسفند مائدۂ خاص پر موجود رہے۔ بحسبِ رغبتِ طبیعت نوشِ جان فرماتے رہیے ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

(۵۷/۱۳)

گمان ہے سہ شنبہ [illegible] صبح ۵ [illegible] ۱۸۶۵ [illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ شرف افزا عطوفت نامہ عزّ ورود لایا، اگست ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا سو روپیہ انگریزی ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب
دو شنبہ ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۶۵

(۵۸/۱۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبانِ فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم! دل نے قبول نہ کیا۔ آرایشِ گفتار، تلخیٔ آلوشراب واسطے [illegible] ہے کہ دل کثرتِ اندوہ سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبیعت رواں [illegible]

الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں، معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف جس بات کا تصور ناگوار ہو، اس کے تذکرے سے جی کیوں نہ بیزار ہو؟ یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ ہنوز تہنیت اور مدح کا حق ادا نہ ہوا تھا کہ مرثیہ لکھنا پڑا۔ اگر ایک بات میرے خیال میں نہ آئی ہوتی، تو مجھے زندگی دشوار تھی۔ یعنی حضور کو ابتدائی جلوس میں وہ رنج پہنچا کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آتا۔ پس وسادہ نشینی کی ہدایت اور غمگینی کی نہایت یہ چاہتی ہے کہ اب مدۃ العمر "اَبَداً مُؤَبَّداً"، حضرت کو کوئی غم نہ ہو۔ ہمیشہ جہاندار و جہانستان و شاد و شادماں رہیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱ آپ کے قدمبوس کا طالب، غالب - ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۵ ع

دریغا! کہ ماند تہی تخت دولت زخاقانِ نامی، سکندر زمانی
چو "ستبارِ روضہ" بہ وسالِ فوتش ببیں اسم وی یا "جنّت مکانی"! ۲
۱۲۸۲

(۵۹/۱۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ ہر چند آبدار خانے کے ساتھ ہونے سے پانی کی طرف سے خاطر جمع ہے، کہ حضور جو پانی ہمیشہ پیتے تھے، وہی پیتے ہوں گے، مگر ہرج سفر اور اختلافِ ہوا کا خیال ہے۔ توقع رکھتا ہوں کہ نوید صحت و اعتدالِ مزاجِ اقدس سے جلد اطلاع پاؤں۔ فدوی اگرچہ بیمار نہیں لیکن طبع پر گراں ہے چشم شوق ورودِ موکبِ عالی کی نگراں ہے۔ بقول آتش "بہ تغیرِ لفظ" جو تم پھر آؤ، تو حضرت، پھریں ہمارے دن"۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! | ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار![۱]

دوامِ بقای حضور کا طالب، فقیر غالب

چہار شنبہ ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۵ع[۱]

(۶۰/۱۶)

حضرت ولیِ نعمت[۳] آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے ہم تک آنے کے پل کا ٹوٹ جانا، گاڑی اسباب، یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اسی زمہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، خیر جو ان پر گزری، وہ جانیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا۔[۲] بھوکا، پیاسا، کمل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر[۳] کے بھیجے ہوئے دو نفر آئے۔ ہم اٹھا کر سعید الدین خاں صاحب[۴] کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور[۶] آئے، اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر وہیں مجھ سے آ کر ملے۔ دوسرے دن وہ رہگرای دار السرور رامپور[۷] اور میں جادہ نوردِ ستم آبادِ دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ / ۸ جنوری ۱۸۶۶ دولتکدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دلی پہنچتا![۸]

ع

مغلوبِ غلبۂ غمِ دل، غالبِ حزیں
"کاندر تنش ز ضعف" تواں گفت "جاں نبود"

از رامپور زندہ بدہلی رسیدہ است
"ما را بدین گیاہِ ضعیف این گمان نبود"

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

۴ شنبہ ۲۲ شعبان و ۱۰ جنوری سال
جشنِ حضور

(۶۱/۱۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامۂ والا کے مشاہدے نے مجھ کو میری حیات پر یقین عنایت کیا۔ اس سفر کا حال کیا عرض کروں؟ دِلّی سے رامپور تک، ذوقِ قدمبوس میں جاتا نہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہوا و تفرقۂ اوقاتِ غذا کو ہرگز نہ مانا، اور رنجِ راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقتِ معاودت، اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا، کہ جوہرِ روح گداز پاکر ہر بُنِ مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید نہ ہوتی، تو دِلّی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، مینہ، قبض و انقباض، فقدانِ جوع، فاقہ ہائ متواتر، منزلہائ ناماٴنوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوائ زمہریر کا چلتا رہنا، بارے ہاپوڑ سے چل کر نیرِّ اعظم کی صورت دکھائی دی۔ دھوپ کھاتا ہوا دِلّی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا پیر و ناتواں ہوں، جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اُس در پر پہنچوں! ص

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۳۱ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء

(۶۲ / ۱۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیع وقیع مع سو روپیے کی ہنڈوی کے عزِّ ورود لایا۔ جنوری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ آپ کے غلامِ تو خرید نے اپنی تنخواہ کا حال پوچھا۔ میں نے حضور کا خط اُسے دکھا دیا۔ ناامیدانہ چُپ ہو رہا۔ اب اس درویشِ دلریش کا حال سُنیے۔ سامعہ مدت سے کھو بیٹھا[۲]۔ اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا[۳]۔ دور سے صرف قد و قامت آدمی کا دیکھا جاتا ہے۔ چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا ہے[۴]۔ فقدانِ طاقت، سقوطِ اشتہا، ضعفِ بصر، ضعفِ بخت۔ میرا حال بعینہٖ میر کے اس شعر کے موافق ہے:

درکشاکشِ ضعفم، نگسلد روان از تن — اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عنایت کا طالب، غالب

۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۶

(۶۳ / ۱۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیع وقیع کے ورود نے میری آبرو بڑھائی۔ اُس میں سے میں نے سو روپیے کی ہنڈوی پائی۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ فروری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ میں نے پایا۔

زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

مرقومۂ ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۶ — عنایت کا طالب، غالب

نبود ثانی و ہمتای تو در دہر، ہما نا!
دانم، از حال و آلم خبری داشتہ باشی
سرنوشت ازلی، گرچہ ندارد خطِ توانا!
دشمنم چرخ، دتو بینیّ و لنوزی بعتابش
بہ عدو صاعقہ ریزا، بہ محب فیض رسانا!
حافظینِ تو کنند نامِ ترا زندہ بگیتی
یاد فردوس برین جای تو، فردوس مکانا!
غالب، از غم چہ خروشی؟ نہ زیباست خموشی
باکریم ہمہ دان ہیچ مگو، ہیچ مدانا!

(۶۵/۲۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشور مکرمت ظہور مع ہنڈوی عزّ ورود لایا سو روپیہ تنخواہِ اپریل سنہ ۱۸۶۶ کا معرض وصول میں آیا۔ زیادہ حدّ ادب۔
تم سلامت رہو ہزار برس؛ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب
۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۶ عیسوی

(۶۶/۲۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی، تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر کہی۔ مقطع اس کا یہ ہے:

غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا!
وہ دن گئے جو کہتے تھے: "نوکر نہیں ہوں میں"

اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ حضرت
کے پسند آئے! زیادہ حدِّ ادب ۔

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشت اسد اللہ بیدستگاہ

۹ جون سنہ ۶۶

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں — خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟ — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟ — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟ — لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟ — رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کس لیے — کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

قطعہ

در پر امیرِ کلبعلیخاں کے ہوں مقیم — شایستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں اسد — خیرات خوارِ محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

(۶۷/۱۴۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل ایک عرضداشت مع ایک غزل کے
ڈاک میں بھیجی گئی۔ شام کو منشورِ عطوفت مع ہنڈوی تنخواہ مئی سنہ ۱۸۶۶ء عزِّ
ورود لایا۔ سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ آج صبحدم وقتِ تحریر اس عرضی
کے حضرت فردوس مکاں کا دیوان پیشِ نظر تھا۔ اس میں یہ شعر نظر پڑا۔
اس کے مضمونِ حکیمانہ و عارفانہ نے بڑا مزا دیا۔ یقین ہے کہ اس کو

۳۱ جولائی سنہ ۱۸۶۶ء کو روانہ کی تھیں، جو آج تک دارالانشا میں محفوظ ہیں۔ مکاتیب کے پہلے ایڈیشن میں مستقل خط کی طرح اُس قطعے کی نقل چھاپی گئی تھی۔ بعد ازاں اس متول کو بیجا خیال کر کے نکال دیا گیا۔]

(۶۹/۲۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج شنبہ ۱۰ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ کی ہے۔ فقیر چشم براہ تھا کہ اب ڈاک کا ہرکارہ آتا ہے، اور ہنڈوی ملفوفۂ نوازش نامہ لاتا ہے۔ ناگاہ اس وقت ڈاک کا آدمی ایک خط برخوردار منشی سیلچند کا لایا۔ اُس میں مندرج تھا کہ تو نے جون سنۂ حال کی تنخواہ کی رسید کیوں نہ بھیجی۔ اور بعد اس کے لکھا تھا کہ جولائی کی تنخواہ کی چٹھیاں ہوتی جاتی ہیں۔ اب دو ایک دن میں تیری تنخواہ بھی بھیجی جائے گی۔ متحیر کہ یا رب، میں حسبِ معمول تنخواہِ جون کی رسید ارسال کر چکا ہوں۔ اب دوبارہ رسید کیوں مانگی جاتی [illegible] پیام مرگ تھا کہ جولائی کی تنخواہ اب روانہ ہوگی۔ یا رب! ۱۰ کو روانہ ہو، ۱۲ کو چلے گی، خدا جانے کہیں تک مجھے پہنچے گی، اور میرا حال یہ کہ اگر یہی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسطیں جاتی ہے۔ حضور کے عطیے پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزارا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے، جس طرح گزرتی ہے۔ چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔

خلاصہ دو عرضیں ہیں: ایک تو یہ کہیں جون کی تنخواہ کی۔ رسید بھیج چکا ہوں۔ اگر ڈاک میں تلف ہو گئی ہو، تو اور لکھ بھیجوں؛ دوسری یہ کہ اس مہینے کی یعنی جولائی کی، تو تنخواہ خیر ۱۲ ماہِ اگست تک پہنچ جائے گی۔ آیندہ کو حکم ہو جائے کہ مہینے کی پہلی دوسری کو فقیر کی تنخواہ، کہ وہ محض بطریقِ خیرات ہے، بھیج دیا کرے۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب فقط

(۷۰/۲۶)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ پہلے اپنا حال عرض کر لوں، تب کچھ اور مدعا لکھوں۔ غم نے کمھولی بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! نہ حواس درست، نہ رای صحیح۔ برسوں سے مکروہات میں مبتلا رہتے رہتے اب طاقت تحمّل کی نہ رہی۔ خدا جانے، کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں کیا کرنا چاہیے، کیا کرتا ہوں۔

کل آخرِ روز میر منشیٔ حضور کا خط آیا۔ جون کی تنخواہ کی رسید کے نہ پہنچنے کی اطلاع پائی۔ تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا۔ اُسی وقت عرضی لکھی۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا، مگر بھیجدی۔ آج آخرِ روز توقیعِ وقیع مع جولائی کی تنخواہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ ہنڈوی مختار کار کو دی، اور یہ عرضی لکھنے بیٹھا۔ لکھ کر لفافہ کر رکھتا ہوں۔ کل صبحدم ڈاک میں بھیجدوں گا۔

اگر عرضیٔ سابق میں کوئی بات گستاخی و دیوانگی و بدحواسی کی ہو، تو فقیر کی خطا معاف ہو۔ میر منشی صاحب کے اگر مخالفِ طبع کوئی لفظ ہو، تو وہ بھی درگزر کریں۔

جون کی تنخواہ کی رسید کا لفافہ ڈاک میں گم ہو گیا ہوگا۔ اگر میں بھی بھول گیا ہوں، تو بعید نہیں، بلکہ اغلب ہے کہ غالب کو سہو ہوا ہو۔ بلا زیادہ درِ دولت پر ظاہر ہو کہ جون کی تنخواہ جولائی میں، اور جولائی کی اگست میں میں نے پائی۔ آیندہ ہر انگریزی مہینے کی دوسری تیسری کو روانگیٔ ہنڈوی کا متوقع ہوں۔ زیادہ حدِّ ادب!۔ ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۶ع عفو و رحم کا طالب، غالب

(۷۱/۲۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت مدّظلّہُ العالی!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیع دِ قیع مع دیباچۂ شرحِ اشعارِ بدرِ چاچی عزّ ورود لایا۔ کیا عرض کروں کہ کیا عالم نظر آیا! واقعی افتتاحِ کلام بطرزِ میرزا طاہر وحید[2] اور پھر نگارشِ مطالب بشیوۂ میرزا جلالا ئی طبا طبائی[3] ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ اعجازِ خسروی[4] کا رنگ جلوہ گر ہے پس ناقدِ بصیر کے نزدیک یہ نگارش، طاہرِ وحید اور جلالا کی عبارت سے بہتر ہے۔ یہ عرضداشت جلد بھیجتا ہوں، تاکہ حضرت پر پہنچنا اُس دیباچے بالتقریظ کا ظاہر ہو جائے۔

برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون[5]، ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں، عرش آرامگاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی، یا امسال نظر آئی ہے۔ اوراقِ مرسلۂ حضور مع میں جامے میں لپیٹ کر بسبیلِ پارسل ارسال کروں گا، یا پرسوں دوشنبے کو، یا سہ شنبے کو۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ع روزِ شنبہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ نجات کا طالب، غالب[6]

(۷۲/۲۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور عزِّ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ معرضِ وصول میں آیا۔

نثرِ نثرہ نثار کے اوراق ۳ ستمبر ماہِ حال، کو ارسال ہوئے ہیں نظرِ انور سے گزرے ہوں گے۔ فقط

اُردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے۔ فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر چند شخصوں کے حوالے کیا ہے۔ بعدِ اتمام تحریر نذر کیا جائے گا!

بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی و اُردو، سراسر دیکھا ہوا میرا، جو اُن کے کتاب خانے میں تھا، غدر میں لُٹ گیا۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہوگیا۔ دو تین غزلیں، فارسی، ہندی، جو لکھی ہیں، اُن کا انتخاب بھی پہنچے گا ۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسد اللہ بیدستگاہ

دوشنبہ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ ع

(۷۳ / ۲۹)

حضرت دلِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ خاطرِ اقدس میں نہ گزرے کہ غالب تعمیل احکام میں کاہل ہے۔ بصارت میں فتور، ہاتھ میں رعشہ، حواس مختل، ناچار کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں! بارے ایک دوست نے کاتب کا نشان دیا۔ اردو کا دیوان، اشعار پر صاد کرکے، اُس کو حوالے کیا۔ کل وہ اجزای منقولہ آئے۔ آج بطریقِ پارسل مع اس عرضی کے ارسال کیے۔

خط کاتب کا مجھ کو پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیونکر پسند آئے گا! اغلاط اتنے تھے کہ مجھ کو تحریر کے برابر محنت پڑی۔

فارسی کے کلیات کا شیرازہ کھول کر، اجزا اُس کے احباب پر تقسیم کردیے ہیں، جابجا اشعار پر صاد کر دیے ہیں۔ وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعدِ اتمام وہ بھی پیشکش کروں گا

زیادہ حدِّ ادب۔ ۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترحم کا طالب، غالب

سہ شنبہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

[میرزا صاحب نے تقریظِ شرح بدرِ چاچی کی اصلاح کے سلسلے میں چہار شنبہ ۱۹ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو ایک عریضہ روانہ کیا تھا۔ مثل میں اس کا صرف لفافہ موجود ہے۔ اس کی لپشت پر میر منشی صاحب لکھتے ہیں: "اصلِ خط درحضور پُر نور، کہ بمقدمۂ تقریظِ شرحِ بدرِ چاچی بود، ماند۔ ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء"][1]

(۴۷/۳۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں یقین ہے کہ حضرت کی نظرِ انور سے گزر گیا ہو۔ آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریق پارسل اِس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ اور بھائی ضیاءالدین خاں بہادر نے جو اوراق میرے پاس بھیجے ہیں، وہ بھی اسی پارسل میں رکھدیے ہیں[2]۔ حضرت! اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لُٹ گیا۔ بعدِ غدر جو کچھ کہا ہے، وہ یہی ہے جو پہنچتا ہے۔

اِس درویش نے صرف غزلوں[4] اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو، تو وہ بھی بھیجوں۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب

۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۶

(۷۵/۳۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہِ ماہِ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ معرضِ وصول میں آیا۔ اشعارِ فارسی و اُردو پہنچے۔ خدا کرے، پسند آئیں! افسوس کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے میرا حال سامعۂ اقدس پر عرض نہ کیا! حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں، اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرضِ باقی ماندہ ادا ہو جائے، اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔ فقط

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

اسد اللہ بیدستگاہ۔ بست و ششم اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ ع

(۷۶/۳۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اِس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اُٹھا: "م از آن مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است"۔ یہ ذلیل کو عزت دینی اور دُکانِ بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا اُستاد اور اپنا م
اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ
چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی؛ اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اُس سے حقائق و دقائقِ زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اِس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے، مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بخشش کا طریق یاد نہیں۔

میاں اِنجو، جامعِ فرہنگِ جہانگیری، شیخ رشید، راقمِ فرہنگِ رشیدی عظمای عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی ان کا اِن کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور رہند بھی۔ نورٌ علیٰ نور!

فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اُن لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات اُن کے کلام میں ہیں، اُن کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کر دوں؟ اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارتنگ و ارژنگ، متحد المعنی اور آشیان ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا؛ لیکن نہ اُن صاحبوں کے قیاس کے بموجب، بلکہ اپنے خداوندِ نعمت کے حکم کے مطابق۔

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

انصاف کا طالب، غالب۔ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء

(۲۲/۳۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج سہ شنبہ، ۱۶ ماہِ اکتوبر کی، دن کو بارہ بجے کھانا کھا کر بیٹھا تھا کہ توقیعِ وقیع آیا۔ پڑھتے ہی کانپ اُٹھا، اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ اگر حضور کے ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو تو مجھے جنابِ الٰہی اور حضرتِ رسالت پناہی کی قسم؛ اگرچہ فاسق و فاجر ہوں، مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔ خدا و رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا۔ انکارِ بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرای ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی، اور باہم جو اُن کی عقول میں اختلاف ہیں، اُن میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں، اور دل سے

مجھے بحث نہیں۔ با ہمہ ضعفِ حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان دونوں باتوں کو میں نے مانا، لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب، بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔ یہ کلمہ موجبِ عتاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کو گناہ سمجھا جائے ؎ آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں گناہ معاف کیجیے، اور نویدِ عفو سے مجھ کو تقویت دیجیے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۶۸ھ عفو کا طالب غالب

$\left(\frac{۵۸}{۳۴}\right)$

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضور کے لشکرِ نصرت اثر کا سپہ سالار نواب معلیٰ القاب، جناب مہدی علی خاں بہادر اکبرآباد پہنچا، اور خیامِ فلک احتشام کا وہاں نصب ہونا، اور رامپور سے اکبرآباد تک گھوڑوں کی ڈاک کا بیٹھنا اور حضرت کا سنبھل تک بسبیلِ ڈاک تشریف لے جانا، اور وہاں مزاجِ اقدس کا ناساز ہونا اور دارالسلطنت کو معاودت فرمانا، یوماً فیوماً مسموع ہوا۔ غرض اس عرضداشت کی تحریر سے یہ ہے کہ حصولِ جواب سے آبرو اور خیریت و عافیتِ مزاجِ مبارک سے عزّ و اطلاع پاؤں۔ فقط

اخبار میں مسطور اور شہر میں مشہور ہے کہ حضرت اجلاسِ کونسل کے واسطے حسب الحکم گورنمنٹ کلکتے کو تشریف لے جائیں گے۔ نمک خوار دعاگوئی و مدح گستری میں بہانہ طلب رہتا ہے۔ اس تقریب کا ایک قطعۂ تاریخ سنہ ۱۸۶۶ عیسوی رقم کیا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو اجازت ملجائے کہ اس کو کسی اخبار میں چھپوا دوں۔ فقط

قطعہ

چو نوّاب ۔۔۔ انہ بہرِ اجلاسِ کونسل بہ کلکتہ از رامپور آورد رُخ

عدو را بگیر و بکش ز دو دی را — بجو سالِ اجلاس از "بخت فرخ"
چو گویند کز کشتنِ دی چه خواہی — بگو: حذفِ اعدادِ دی "اینت پاسخ"!

"اینت" لغتِ پارسی ہے، مرادفِ ہنی و زہی، اور قتل کا مشار الیہ لفظ "دی" ہے، جس کے ۱۴ عدد ہیں، اور "دہی" کا مشار الیہ عدد ہے "بخت فرخ" کے ۱۸۸۲ جب اس میں سے ۱۶ کم کیے، تو ۱۸۶۶ رہے۔
زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
(۱۸ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء)

(۷۹/۳۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیع و قیع مع ہنڈوی تنخواہِ نومبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی عزِ ورود لایا۔ سورڈ بیہ معرضِ وصول میں آیا۔

قطعۂ تاریخ کے باب میں التماس یہ ہے کہ اب قوتِ ناطمہ پر تصرف اور معنی آفرینی کا ذور مطلق باقی نہیں۔ مگر از راہِ فرطِ ارادت و محبت ثنا و دعا کے واسطے تقریب ڈھونڈھتا ہوں۔ جب موقع پاتا ہوں کچھ عرض کرتا ہوں۔ تخرجۂ لطیف ہاتھ آگیا، اُسی پر مدعا کی بنا رکھی۔

پیر و مرشد، اگر غازی آباد سے حضور ریل پر سوار ہوں، تو فقیر کو تاریخِ ورودِ غازی آباد سے آگہی ہو جائے، تاکہ میں وہاں حاضر ہو کر قدمبوسی کی سعادت حاصل کروں۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
عریضہ نگار اسد اللہ

۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی

۸ دسمبر ۱۸۶۶ عیسوی

(۸۰/۳۶)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ ایک عرضداشت بھیج چکا ہوں۔ اُس کا جواب نہیں پایا۔ امیدوار ہوں کہ اس عرضداشت کے جواب سے محروم نہ ہوں۔ فقط

کل دن کو دس بجے سنا کہ عالی جناب نواب مہدی علی خاں بہادر سواریٔ ریل آئے، اور ائلی کے محلّے میں ٹھہرے ہیں۔ کھانا کھا کر فوراً سوار ہوا۔ وہاں جا کے سُنا کہ نواب صاحب ریل کے اسٹیشن پر گئے ہیں۔ گھنٹا بھر بیٹھا رہا کہ حضرت آئے۔ آگے غازی آباد کے اسٹیشن پر سے سواری ہوتی تھی۔ اب ولی محمد سوداگر کی کوٹھی[۲] کے پاس سے[۳] جو بیگم کے باغ[۴] کے عقب ہے، نیا اسٹیشن قرار پایا ہے[۵]۔ سو صاحبزادہ صاحب نے آپ کے حضور میں اطلاع کی ہے۔ دیکھیے حضرت غازی آباد سے سوار ہوتے ہیں یا شہر میں سے!

واسطے خدا کے! مجھ کو اپنے روزِ ورود و وقتِ ورود سے اطلاع بخشیے اور اس عرضی کا جواب ایسا جلد عنایت ہو کہ فقیر بے سر و سامان اپنا سامان درست کر رکھے۔[۶]

حضرت کی توجہِ باطنی، جو ہمیشہ میری مصلحِ حال اور افزایشِ عزّ و وقار کی کفیل ہے، بعد ادائے شکرِ الٰہی اُس کا سپاس بجا لاتا ہوں۔

پیش از غدر گورمنٹ کے دربار میں ۷ پارچے، اور جیغہ، سرپیچ، مالائی مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعدِ غدر اگرچہ پنشن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۲ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباردارں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہو گی، ایک رباعی کا غذِ زرّ ہتّب پر لکھی ہوئی نذر کر دوں گا، کلماتِ عنایت سُن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب منتظر

بہادر شہر کو علم ۔ بارے بروقت ملاقات، تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لاٹ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا، اور فرمایا کہ "یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔"[1] مالای مروارید میر منشی نے گلے میں ڈال دی ۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے ۔

دوشالا ۱، کمخواب کا تھان ۱، بنارسی تھان سنہری بوٹے ۱، بنارسی سیلا ۱، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ۱، کنادیز کا تھان ۱، الوان کی چادر بے کنارہ ۱۔

میں اس عطیے کو آپ کی بخشش معنوی سمجھتا ہوں، اور دوسری بخشش یعنی اس خط کے جواب کے جلد حاصل ہونے کا متوقع ہوں ۔ زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشت کے جواب کا طالب غالب

روز سہ شنبہ ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶

(۸۱/۳۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے ۔ نوازشنامہ مع ہنڈوی صدر روپیہ عز ورود لایا ۔ دسمبر ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا ۔

اللہ اللہ! یہ فرطِ عنایت، بہ ظہورِ مکرمت کہ حضرت ڈاک میں سوار ہونے کو ہیں اور میرے نام خط کا حکم ہو، اور وہ خط دستخط سے مزین ہو، دسمبر کی تنخواہ دسمبر ہی میں جاری ہو، اور جنوری کی تیسری تاریخ میرے پاس پہنچ جائے! ظہورِ آثارِ ربوبیت بوجہِ احسن و اکمل ہے۔

(۸۲/۳۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے ۔ حضرت کا رونق افزائے کلکتہ ہونا از روئے شمارِ

رفتارِ ریل یقینی ہے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا کا موافق آنا، اور جناب لاٹ صاحب بہادر سے ملاقات کا ہونا، اور اجلاسِ کونسل کا وقوع میں آنا، یہ امور جب تک حضرت رقم نہ فرمائیں گے، دعاگو کے خیال میں کیوں کر آئیں گے؟ ناچار جرأت بہم پہنچا کر اس عرضداشت کے جواب میں ان حالات کے انکشاف کا امیدوار ہوں[2]۔ فقط

پیر و مرشد، حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہو گیا۔ تنخواہ نے قسط سے اور میں نے رنج سے رہائی پائی۔ ہم بدل و ہم بزبان ثنا خوانِ جود و نوال و دعاگوی دوامِ دولت و اقبال ہوں۔ آدھا قرض عطیۂ سابق میں، اور آدھا قرض عطیۂ حال میں ادا ہو گیا۔ کچھ نہیں سکتا، اور بن کہے بنتی نہیں اگر دونوں لڑکوں[3] کا پچاس[5] روپیہ مہینا جنوری سنہ ۱۸۶۷ء، یعنی ماہِ حال و سالِ حال، سے جاری ہو جائے گا، اور ماہ بماہ فقیر کے روزینے کے ساتھ پہنچا کرے گا، تو آپ کا نمک خوار پھر کبھی قرضدار نہ ہو گا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

فیض کا طالب، غالب

معروضۂ ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷

(۸۳/۳۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ بہت دن تک متردد رہا کہ حضور کلکتے ہیں یا رامپور۔ چنانچہ ایک عرضداشت اُسی تردد میں بھیجی ہے۔ ہنوز جواب کے آنے کی مدت منقضی نہیں ہوئی۔ خیر، اُس کے جواب پر کیا موقوف ہے؟ یہ تو جان لیا کہ حضرت رونق افزای رامپور ہیں، مگر یہ کیونکر جانوں کہ اب بہ خجستگی و فرخندگی یہیں رونق افزا رہیں گے، یا پھر کلکتے تشریف لے جائیں گے؟ خیر، اس بے علمی کو سہل سمجھ لیا کہ جو کچھ ہو گا، معلوم ہو جائے گا، مگر یہ کیونکر جانوں کہ

مزاجِ اقدس کیسا ہے، اور جب تک یہ نہ جانوں تو آرام کیونکر آئے؟ یہاں سے رامپور تک برابر تار برقی بھی نہیں، جو خبر منگواؤں۔ آج ۱۴ فروری کی ہے۔ یہ خط بھیجتا ہوں۔ اگر جواب آئے، تو ۹ دن میں۔ مجھ کو اتنے دن صبر کیونکر آئے گا؟ الٰہی، آج بالکل کوئی نوازش نامہ حضرت خداوند کا آ جائے! زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس، ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر کا طالب، غالب

۱۴ فروری ۱۸۶۷ء

(۸۴/۴۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو میں نے خط ڈاک میں بھجوا دیا۔ دو امروں کے نزدیک کے رفع کی التماس تھی۔ ایک یہ کہ پھر کلکتے کو تشریف لے جائیے گا یا نہیں؛ دوسرے یہ کہ مزاجِ اقدس کیسا ہے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ کل ہی دوپہر کو اخبار میں دیکھا کہ حضور نے بوجہ ناسازیِ آب و ہوائے کلکتہ شمولِ کونسل سے انکار کیا۔ بارے اس سے خاطر جمع ہوئی۔ رہی مزاجِ مبارک کی حقیقت، اُس سے بھی فی الجملہ طمانیت ہوگئی۔ یعنی عنایت نامے میں خیر خواہ کے خلافِ مدعا کوئی بات مندرج نہ تھی۔ اسی عرضی میں یہ بھی عرض کر دیتا ہوں کہ سو روپیہ بابت تنخواہِ جنوری سنہ ۱۸۶۷ حال میں نے پائے اور شکر دولتِ پروری بجا لایا۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

عنایت کا طالب، غالب

۱۵ فروری ۱۸۶۷ء

(۸۵/۴۱)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ عطوفت عزِّ ورود لایا (سو روپیہ تنخواہ) فروری سنہ ۱۸۶۷ حال کا معروضِ وصول میں آیا۔

اس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراضِ قدیم بڑھ گئے دورانِ سر، اور رعشہ، اور ضعفِ بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی۔ ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

زیادہ حدّ ادب۔

نجات کا طالب، غالب

۱۳ مارچ سنہ ۱۸۶۷

(۸۶/۴۲)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو دو گھڑی دن چڑھے نوروز ہے۔ آج یہ قطعہ بالتحفۃ المقام کر لکھ کر حضور کی نذر بھیجتا ہوں ہے

نوروز و دو عید از دو جانب امسال خوب است ز روئے وضع و نیک ست بفال
امید کہ این سہ عید، نذرِ نواب آرند دوامِ عمر و عزّ و اقبال

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

چہارشنبہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۶۷ع

(۸۷ / ۴۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم و تعظیم معروض ہے۔ ہنڈوی ملفوفۂ نوازشنامہ کے ذریعے سے سو روپیے مارچ کی تنخواہ کے وصول ہوئے۔

ایک رباعی بھیجتا ہوں، اور یہ چاہتا ہوں کہ دبدبۂ سکندری کے آغاز میں اس کے چھاپنے کا التزام رہے!

آں کیست کہ تسخیر ملک راجاں باشد؟ آں کیست کہ ہمسرِ سلیماں باشد؟
آں کیست کہ انجمش بفرماں باشد؟ کس نیست، مگر کلب علی خاں باشد

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۶ اپریل سنہ ۱۸۶۷ء

(۸۸ / ۴۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نمایشگاہِ سراسر سورِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں[۲]، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے! میں وہاں نہیں! بالاخانے پر رہتا ہوں، اُتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اُتارا اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار لے چلے۔ راہ میں نہ مرا، اور رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بےنظیر میں میری پالکی رکھدی۔ پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے؛ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے؟ بارے تین بیت کا قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو میں خوشنودیٔ مزاجِ مبارک سے اطلاع پاؤں[۳]۔

نمایشگهی در خور بہ شانِ خویش برآراست نوّابِ عالی جناب
بہ بین، چون طرب را نہایت نماند بود سال آن "بخشش بےحساب"
خدایا! پسند خداوندگار کہ از طبعِ غالب رود پیچ و تاب

"بخشش بےحساب" کے بارہ سو بچاسی ہوتے ہیں "طرب" کی نہایت
باء ی مؤحدہ ہے۔ جب وہ نہ رہی، تو دو عدد گھٹے، اور ۱۲۸۳ رہ گئے، فہوالمقصود۔
اگر حضرت کی مرضی ہو، تو دبدبہ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

دادکا طالب، غالب

۱۴ ماہِ اپریل سنہ ۱۸۶۷ عیسوی

(۸۹/۴۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع عزّ ورود لایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا سور وپیہ بنامِ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

(۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷)

(۹۰/۴۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ ادای مدارجِ تسلیم سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں۔ ہے، ہے! میں کیوں جیتا رہا، جو صاحبزادہ محمد حسن خان کے مرنے کی خبر سنوں، اور خداوندِ نعمت کو تعزیت کے کلمات لکھوں؟ میں نیم جاں نہ مروں، اور وہ نوجوان مر جائے۔

سروِ چمنِ سروری افتاد ز پای، ہای!

حضرت کے رنج واندوہ کا تصور اور مارے ڈالتا ہے۔ دوسری محرم کو علی بخش خاں خانساماں مرے، تیسری کو یہ واقعۂ ہوشربا پیش آیا۔ یہ تو آپ کا فرزندِ دلبند تھا۔ جو اس کا غم ہو، وہ بجا ہے۔ پر فقیر جانتا ہے کہ علی بخش خاں کے مرنے کا بھی حضرت کو بڑا رنج ہوا ہوگا۔ ایسے کارگزار، دیانتدار، ہوشمند، مزاج داں کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ بہرحال "رَضِینَا بِرِضَاءِ اللہِ" حضرت کے سامنے صبر و ثبات و تسلیم و رضا میں کلام کرنا ادریس کو حکمت پڑھانی اور خضر کو راہ بتانی ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب ۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷

(۹۱/۴۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ورودِ توقیعِ وقیع سے فیض پایا۔ سو روپیہ مئی سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا معرضِ وصول میں آیا۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسد اللہ بیدستگاہ

۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷

(۹۲/۴۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے کہ توقیعِ وقیع عزِ ورود لایا۔ اُس کی ملفوفہ ہنڈوی سے تنخواہِ جون سنہ ۱۸۶۷ کا سو روپیہ میں نے پایا۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ہوا خواہ، اسد اللہ

۱۵ جولائی سنہ ۱۸۶۷

(۹۳/۴۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بموجب تحریر مرزا رحیم الدین بہادر حیا کے فاضل شطرنج باز[۱] کو خرچ دے کر روانہ کیا۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

اسد اللہ بیدستگاہ - ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۷ ع

(۹۴/۵۰)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیم مراسمِ تسلیم نوازش نامے کے ورود کا شکر اور جولائی مہینے کے سو روپیہ کے وصول کا سپاس بجا لاتا ہوں۔

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں! فقط

نجات کا طالب، غالب

۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۷

(۹۵/۵۱)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آپ کے غلامِ زرخرید، یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی، اور اپنے کنبے میں ہوئی، یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے[۳]، اور رجب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ[۴] ہے۔

کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ مدعا ہی ضروری الاظہار

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۶/۵۲)

آن کیست کہ جسمِ ملک را جان باشد؟ آن کیست کہ ہمسرِ سلیمان باشد؟
آن کیست، کہ انجمش لبِ فرمان باشد؟ کس نیست، مگر کلب علی خان باشد

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عزّ ورود لایا۔ اُس میں یہ حکم مندرج پایا کہ حسین علی خاں کی شادی کے باب میں "خلاصۂ مکنونِ خاطر" عرض کروں۔ حکم بجا لاتا ہوں، اور عرض کرتا ہوں۔ مجملاً یہ کہ میں دردولت کا گدای خاک نشین، اور وہ آپ کا غلام۔ تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک اور میرے گھر میں زیور، زرینہ وسیمینہ کا نام و نشان نہیں۔ ہمت اُدھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں، تا یہ کام سرانجام پاوے، اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جاوے۔

دوسری بات یہ کہ سو روپیہ ماہ بماہ آپ کی سرکار سے بطریقِ خیرات اور ۶۲ روپیہ مہینا انگریزی سرکار سے بعوضِ جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ حسین علی خاں کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جاوے۔ لیکن توقیع تنخواہ اُس کے نام جاری نہ ہو، بلکہ اُس کی زوجہ، حسن جہاں بیگم، بنتِ اکبر علی خاں، کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو، اور اُس کی مہری رسید سے ملا کرے۔ زرِ مصرفِ شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار، جو خداوند کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۷/۵۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عزّ ورود لایا۔ اللہ اکبر! حضرت نے غمخواری و تفقّد و درویش نوازی کو اُس پایے پر پہنچایا کہ شاہانِ عجم میں سلطان سنجر نے اور شاہانِ ہند میں شاہجہاں نے ملازموں کی اتنی پرسش اور نوازش کی ہو گی۔ باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاءالدین خاں کے ہاں ہوئی۔ اُنھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپیہ دیے، اور میری زوجہ نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو روپیے صرف کیے۔ حسین علی خاں کا سسرا، یعنی اکبر علی خاں، اپنے خاندان کا ہے، لیکن امیر نہیں، نوکری پیشہ ہے۔ اب یہ میں کیونکر عرض کروں کہ مجھے کیا دو؟ سائل ہوں۔ یہ رسم نہیں کہ سائل مقدارِ سوال عرض کرے۔ حالِ مصارفِ شادیٔ خاندان لکھ دیا ہے۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرا حقِ خدمت اتنا نہیں کہ اِس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دو گے، اُس میں شادی کر دوں گا۔ زیادہ حدِّ ادب ہ

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔ معروضۂ ۲۴ جمادی الاول سنہ ۱۲۸۴ [۱۲۷۸]، مطابق ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ [۱۸۶۱]، فردای ورودِ ہمایوں منشور ہ

(۹۸/۵۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ فرمانِ والا مع ہنڈویٔ تنخواہ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ عزّ ورود لایا۔ [ماہ] سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب ہ

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷

(۹۹/۵۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ دیدبۂ سکندری میں حضرت کے مزاج کی ناسازی کا ذکر دیکھ کر جو مجھ پر گزری، میرا خدا جانتا ہے۔ مگر یہ بڑی بات ہے کہ اُسی ذکر کے ساتھ افاقت در رفعِ مرض کی بھی تو یہ مندرج تھی۔ توقع ہے کہ حضرت مفصل حال مرض کے پیدا ہونے کا اور فی الحال مزاجِ اقدس کیسا ہے، پھر منشی کو حکم ہو جائے کہ حضور کی زبانی خط میں مجھے لکھ بھیجیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ء

(۱۰۰/۵۶)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ایک قطعہ ۱۵ شعر کا بھیجتا ہوں۔ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا۔ زیادہ حدِّ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۵ رجب سنہ ۱۲۸۴ ہجری

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رامپور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ

اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم

رامپور، آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم

رامپور ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم

ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
دُرِّ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبحدم باغ میں آ جائے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم

حبّذا باغِ ہمایونِ تقدّس آثار!
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم

مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آ جائے، تو لے ان کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراقِ رقم

حق سے کیا مانگیے؟ ان کے لیے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم

ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نوّاب کو ہم

یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
وہ دو چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم!

(۱۰۱/۵۷)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آج روزِ جمعہ ۱۷ رجب ۱۲۸۴ اور ۱۵ نومبر ۱۸۶۷ء والا نامہ مع ہنڈوی تنخواہِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ آیا۔ سو روپے کل آئیں گے۔ ہے شاگرد پیشہ اور اہلِ قرضِ متفرقہ میں جاکر لئے روپے بٹیں گے[1]۔ اللہ، اللہ، پیرومرشد

رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا تقاضا ہے۔ ادھر سے جز سکوت جواب نہیں[2]۔

کئی دن ہوئے کہ ۱۵ شعر کا قطعہ ارسال ہوا ہے۔ اس کی رسید اس خط میں مندرج نہ تھی۔ خاتمے کے تین شعر دعائیہ یہاں لکھتا ہوں۔ دعا کا نیا طور ہے۔

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں غالب کو ہم

یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار رہے جن کا عالم

اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم!

نجات کا طالب، غالب

(۱۰۲/۵۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت![3]

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل ۱۶ دسمبر کو نومبر کی تنخواہ کی ہنڈوی پہنچی وہ بھی سعادت مند منشی سیل چند کے خط میں ملفوف۔ دیر میں ہنڈوی کا پہنچنا باعث طرف

حضرت کے توقیعِ وقیع کے مشاہدے سے آنکھوں کا روشن نہ ہونا میری سیاہ بختی کی دلیل ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۷

(۱۰۳/۵۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج روز شنبہ، یکم ماہِ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ھ ہے، بہ اتفاقِ حسابِ روجِ نگارشِ جنتری ؎

روزِ روزہ است و روز ناپیداست   غلظتِ ابر و شدّتِ سرماست

چونکہ دھوپ تو نظر ہی نہیں آتی، ناچار دن رات آگ تاپتا ہوں، اور ہر وقت کانپتا ہوں۔

ماہِ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے، تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسمِ نکاح عمل میں آئے۔ اور چونکہ اس ماہِ مبارک میں درِ فیض باز، اور سالِ انگریزی کا بھی آغاز ہے، وہ پچیس روپیے مہینا جو زبانِ مبارک سے نکلا ہے، جنوری سنہ ۱۸۶۸ سے بنامِ حسین علی خانِ مذکور جاری ہو جائے، تو مجھے گویا دونوں جہان مل گئے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

لکھا ہوا یکم رمضان اور بھیجا ہوا دوم رمضان کا۔ عطا کا طالب، غالب،

(۱۰۴/۶۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ رافت عزّ ورود لایا۔ ہنڈوی ملفوفہ سے

سو روپیہ بابت تنخواہ دسمبر سنہ ۶۷ ۱۸ معرضِ وصول میں آیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

توجہ کا طالب، غالب

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۷ عیسوی

(۱۰۵/۶۱)

داد و دہشِ تو روز افزوں بادا! بر دولتِ تو زمانہ مفتون بادا!

این عید و دو صد ہزار عیدِ دیگر بر ذاتِ تو فرخ و ہمایون بادا!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۲۸ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ ہجری

(۱۰۶/۶۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے، منشورِ عطوفت ظہورِ عز ورود لایا، اور اُس کی ملفوفہ ہنڈوی سے جنوری سنہ ۱۸۶۸ حال کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ فقط

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

۱۴ فروری سنہ ۱۸۶۸

(۱۰۷/۶۳)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

عرضِ مدارجِ عجز و نیاز کے بعد نوازشنامے کے پہنچنے کا اور تنخواہِ فروری سنہ ۱۸۶۸ کے پانے کا شکر بجالاتا ہوں۔ سبحان اللہ! کیا برکت ہے اس سو روپیے میں کہ سو آدمی روٹی کھاتے ہیں، اور اس فقیر کے بھی سو کام نکل جاتے ہیں۔

مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی، عطیۂ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے، تو

آخرِ ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے، خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائے گا، تو اس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا! غرض اس سے یہ کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ حضرت، کوئی ایسا نہیں کہ جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا رہے، اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۹ مارچ سنہ ۱۸۶۸[۱]

(۱۰۸/۶۴)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت ظہور عزِّ ورود لایا۔ سورِ بیّنہ[۲] کا کاغذ خط کے لفافے میں سے پایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۸ کی تنخواہ کا روپیہ معرض وصول میں آیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

(دوشنبہ ۱۱ ماہِ مئی سنہ ۱۸۶۸)[۳]

۱۱/ اپریل (۱۸۶۷ء ابلاغ)

(۱۰۹/۶۵)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ شوقِ قدمبوس نے تنگ کیا۔ جب دیکھا کسی طرح جا نہیں سکتا، ناچار اپنا نقشا اتروایا، اور خدمتِ عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہیں میں بنفسِ نفیس، تب تک اس صورت سے حاضر ہوں گا۔ زیادہ حدِ ادب ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب

۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸[۴]

۶۷ ع

(۱۱۰/۶۶)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ آج چوتھا دن ہے کہ توقیع وقیع عزّ ورود لایا ہے۔ ہنڈوی ملفوفہ کی رو سے تنخواہ مئی سنہ ۱۸۶۸ کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا ہے۔ جواب کے جلد نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں گرمی کی شدّت کے سبب سے اور اختباس ہوا سے کہ جو لازمۂ موسم برسات ہے، بیکار محض ہو گیا ہوں مطلق کچھ لکھ نہیں سکتا، اور کوئی ایسا شخص کہ جس سے کچھ لکھواؤں، اس چار روز میں میرے پاس نہیں آیا۔ آج اس وقت ایک صاحب آ گئے۔ اُن سے میں نے یہ عریضہ لکھوا لیا۔

پیر و مرشد، سابق کے عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے۔ اُس کی رسید اس نوازش نامے میں مرقوم نہ تھی۔ مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ ڈاک میں تلف نہ ہو گیا ہو۔ اگر اُس کی رسید سے شرفِ اطلاع پاؤں، تو دلجمعی ہو جائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۸ء، نجات کا طالب، غالب

(۱۱۱/۶۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل منشورِ عطوفت عزّ صدور لایا۔ جولائی سنہ ۱۸۶۸ کا سو روپیہ بذریعۂ ہنڈوی وصول پایا۔

تین التماس سابق پیش ہوئی تھیں۔ سو اب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے اُن خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ انشاء اللہ الکریم، حسب ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ میں آمد رمضان یعنی نومبر و دسمبر میں، میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا، اور حسین علی خاں

کی شادی بھی ہو جاے گی، اور اُس کے واسطے اُس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جاے گی ٥

باکریمان کارہا دشوار نیست! فقط

عرضداشتِ ہواخواہ، اسد اللہ۔ معروضۂ ۱۳ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۸ء

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

(۱۱۲/۶۸)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیمِ مدارجِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت عزّ ورود لایا، ہنڈوی ملفوفہ کے ذریعے سے بابتِ تنخواہِ اگست ۱۸۶۸ سو روپیہ وصول پایا۔

لکھوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ مدعای ضروری الاظہار

پیر و مرشد! حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ بطریقِ "شیئاً للہ" سوالِ مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے، وہ عطا کیجیے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجیے، لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں ٥

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

زیادہ حدِّ ادب۔ عرضداشتِ دولتخواہ، اسد اللہ

معروضۂ ۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ء

(۱۱۳/۶۹)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع سو روپیے کی ہنڈوی کے عزّ ورود لایا۔ تنخواہِ ستمبر ۱۸۶۸ کا سو روپیہ میں نے پایا ٥

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

مشتاقِ مرگِ ناگاہ، اسد اللہ

۱۳ ماہِ اکتوبر ۱۸۶۸ء

(۱۱۴ / ۷۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت شرفِ ورود لایا۔ ماعصہ روپیہ بابتِ تنخواہ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ از روی ہنڈوی ملفوفۂ خط معرضِ وصول میں آیا۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے! مجھ سے اپاہج نکمے کو بعوضِ خدمت تنخواہ دیتے ہو

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ اسد اللہ، معروضۂ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۸

(۱۱۵ / ۷۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل عریضۂ مشعر رسیدِ تنخواہ نومبر سنہ ۱۸۶۸ ارسال کر چکا ہوں۔ آج ناچار از روی اضطرار و افتقار پھر یہ عرضی لکھتا ہوں۔ حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے للعصہ روپیے بچے۔ عصہ روپیے کا چھٹا ماہوار کا۔ سود سہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپیے ہوں، تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اُس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال؟ کبھی نہ کہوں گا آٹھ سو روپیے مجھ کو اور دیجیے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔ برخوردار نواب مرزا خاں کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے۔ وہ عرض کرے گا۔ مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ مگر حضور، جو عطا فرماتا ہے، جلد ارشاد ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عرضداشتِ گدای بے دل اسد اللہ مضطر

۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۸ ع

(۱۱۶/۷۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ بہت دن ہوئے کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے مجھ کو مبارکباد لکھی تھی کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے اور مقدارِ قرض پوچھی ہے۔ سو میں نے اُن کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپے میں میرا قرض تمام ادا ہو جائے گا۔ اس تحریر سے یاد دہی منظور ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

آرام کا طالب، غالب

صبح پنجشنبہ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ع

(۱۱۷/۷۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ اور اُس میں تنخواہ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ع کی ہنڈوی ملفوف پہنچی۔ جلد بادآوری کا شکر بجا لایا۔

حضور قرضخواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ پس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں۔ آگے حضرت مالک ہیں۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ غالبِ گدا۔ مرقومۂ روزِ یکشنبہ

اواخرِ تاریخ رمضان المقدس سنہ ۱۲۸۵

"بخدمت نواب صاحب مشفق و مکرم، منظہر لطف و کرم، نواب زین العابدین خاں صاحب بہادر عرف کلن میاں، سلمہ اللہ تعالےٰ، مقبول باد"

(صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر عرف کلن میاں ولد صاحبزادہ سید اصغر علی خاں بہادر ولد نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے ہمجد اور رشتے میں حقیقی چچا زاد بھائی کے بیٹے تھے تقریباً ۱۲۴۵ھ میں دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے دادا نواب سید عبداللہ خاں بہادر کی صدر الصدوری میرٹھ کے زمانے میں اُن کے ساتھ رہے۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں رامپور آئے۔ ان کے بڑے بھائی صاحبزادہ سید محمد رضا خاں بہادر کو نواب فردوس مکاں کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ سوءِ اتفاق سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ صاحبزادہ کلن میاں نے سرکار کی اجازت کے بغیر ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۲ء میں بھاوج سے عقد کر لیا اور رامپور سے ترکِ وطن کر کے جیپور چلے گئے اور وہیں توطن اختیار کر لیا۔ امیر مینائی نے لکھا ہے:

"عابدؔ۔ صاحبزادہ محمد زین العابدین خاں عرف کلن خاں ولد صاحبزادہ محمد اصغر علی خاں اصغرؔ ... بیالیس برس کا سن ہے۔ تلمذ کسی سے نہیں بطورِ خود کہتے ہیں۔ یہ اُن کا کلام ہے:

تھا جو اُڑنا ہی ہوش کو میرے	بو ئی گیسوئے عنبرین ہوتا
تھا نہ کھلنا جو عقدۂ دل کو	کاش، ابرو کی تیرے چیں ہوتا

ان کے دادا میرزا صاحب کے مخلص دوست تھے، اس لیے یہ میرزا صاحب کے

اپنا بزرگ اور وہ انھیں اپنا فرزند خیال کرتے تھے۔ لیکن نواب فردوس مکاں ان سے ناخوش ہو گئے، تو میرزا صاحب نے ان کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کر دیا۔ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر نے جنوری یا دسمبر ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ [انتخاب یادگار: ۲۱۲؛ ملخص تسلیم: ۹۶؛ خمخانۂ جاوید: ۵، ۴۹۹]

(۱۱۸/۱)

بندہ پرور! مہربانی نامہ پہنچا۔ میں تو سمجھا تھا، آپ مجھ کو بھول گئے۔ بارے یاد کیا۔ جناب نواب صاحب میرے محسن اور میرے قدردان اور میرے امیدگاہ ہیں۔ میں اگر رامپور نہ آؤں گا، تو کہاں جاؤں گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تجھ کو آنے میں تردد کیا ہے، تردد کچھ نہیں، توقف ہے۔ وجہ توقف کی یہ کہ میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی۔ دہاں سے صاحب کمشنر شہر[۲] کے وہ درخواست حوالے ہوئی۔ صاحب کمشنر دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔ پس اگر وہ کیفیت پنشن کی ہے، تو یہاں کی کلکٹری کا دفتر اگر نہیں رہا نہ رہے، رپورٹ بورڈ[۳] کے دفتر، اور لفٹنٹ گورنری آگرہ، اور نواب گورنر جنرل کلکتہ کے دفتر اس پنشن کی کیفیت سے خالی نہیں ہیں۔ اور اگر میری کیفیت مطلوب ہے، تو میرا بے جرم اور بری ہونا، الگ ہو تا فساد سے اندر دفتر قلعہ و اظہار مخبر بن ظاہر ہے۔ بہرحال صاحب کمشنر شہر، کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر، چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعد ملاحظہ کیفیت کیا حکم دیں؟ مگر تا صدور حکم میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ ہاں، بعد ملنے حکم کے، خواہی دلخواہ ہو خواہی مخالف مدعا، دونوں صورت میں، رامپور آؤں گا۔ مگر حیران ہوں کہ جب تک یہاں رہوں، کھاؤں کیا، اور جب چلنے کا قصد ہو، تو رامپور کس طرح پہنچوں! کیا خوب ہو کہ تم یہ رقعہ اپنے نام کا حضور کو، یعنی حضرت نواب صاحب کو پڑھوا کر اس مدعای خاص کا جواب جو وہ فرمائیں، مجھ کو لکھ بھیجو! لیکن تم سے یہ توقع

کیونکر پڑے؟ کس واسطے کہ تم نے اُردو دیوان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا حال جنابِ عالی سے دریافت کر کر کب لکھا ہے، جو اس بات کا جواب لکھ گئے زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ از غالب نگاشتہ و رواں داشتہ پنجشنبہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء۔ ضروری جواب طلب!

(۱۱۹/۳)

نواب صاحب، والا قدرِ عظیم الشان سَلَّمَکُمُ اللہ تعالیٰ!

بعدِ سلام مشہود خاطرِ عاطر ہو۔ سابق آپ کا خط متضمن اُردو کے استفتائے روزمرہ کا آیا تھا۔ اُس کا جواب جو مجھے معلوم تھا لکھ بھیجا۔ اب جو دوسرا خط آیا، اُس میں آپ نے اپنے اشعار بتوقعِ اصلاح بھیجے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خاص خدمتِ اصلاحِ اشعار پر جناب نواب صاحب قبلہ کا نوکر ہوں، اور آپ حضور کے عزیزوں میں اور فرزندوں میں ہیں، پس میں بے حکم حضور کے آپ کی خدمت بجا نہیں لا سکتا۔ ناچار کاغذ اشعار مسترد بھیجتا ہوں۔ یہ امر یقین ہے کہ موجبِ ملالِ اقدس نہ ہوگا۔ بندگی بیچارگی۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں، کہ مدعای ضروری الاظہار اسی قدر تھا۔ والسلام۔

راقم اسد اللہ خاں غالب ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء

بنامِ صاحبزادہ سیّد محمد عبّاس علی خاں صاحب بہادر

[صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں بہادر ابن سید محمد عبدالعلی خاں بہادر، ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے حقیقی چچا زاد بھائی اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ تقریباً ۱۲۲۴ھ (ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۰ء تک دہلی میں قیام رہا۔ نہایت پاکیزہ سرشت، خوش مقال اور کمالات ظاہری و باطنی سے پیراستہ تھے۔ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگردوں میں ممتاز، اور ہمچشموں میں خوش فکری کی بدولت سرفراز تھے۔ عاشقانہ اور معاملے کے شعر خوب کہتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے اور بذریعۂ مراسلت اصلاح لیتے رہے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد حاکم صدر بنائے گئے اور فروری ۱۸۶۳ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ محکمۂ صدر میں عدالتی خط و کتابت اور کاروبارِ ریاست انجام پاتا تھا۔ انھیں اس زمرے کے کام کا بڑا تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔

بتاریخ ۲۹ رجب سنہ ۱۳۰۰ھ (۶ جون سنہ ۱۸۸۳ء) کو دوپہر کے وقت فوت ہوئے۔ دیوان گلدستۂ باغِ جناں کے نام سے شعبان ۱۳۰۱ھ میں چھپ چکا ہے۔ کتاب خانے میں متعدد قلمی نسخے بھی محفوظ ہیں۔ انھیں میں وہ نسخہ بھی ہے جس پر میرزا غالب کے قلم کی اصلاحیں ثبت ہیں۔ انتخاب یادگار: ۲۷۶، اخبار الصنادید: ۱۷۳، ختم خانہ]

(۱۳۰ / ۱)

قبلہ، جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے؛ اور جس کو کاٹ دیا، وہ معیوب ہے؛ اور جس پر صاد نہیں، وہ بےعیب اور ہموار؛ اور جس کے معنی میں مجھے تامل ہے، اُس پر نظر، علامت اُس کی ‌ظ۔ باقی جابجا منشاءِ اصلاح اور حقیقت الفاظ لکھ دی ہے۔ تین جزو، جس میں سات ورق سادے ہیں، پہنچتے ہیں۔ اور اجزا بھیج دیجیے!

مرے دل کی ذرا سی پھانس کیا ہو بر نکلے — اُکھاڑا ایک ہی جھٹکے میں پاؤ در جس نے خیبر کا
تھا

~~ہوا یوں دین اصحاب رسول اللہ سے شائع~~ — کہ نکلے چوک میں سے جس طرح بازار چوسر کا
ہوا دین نبی اصحاب سے دنیا میں یوں شائع

ہیں تو ہم اس کے بیہودہ بکنے پہ سر دفتار — تا صبح ناداں یہ سمجھے کچھ پشیماں ہو گیا
بیہودہ

اُف رے گرمی تپِ عشق کہ جل کر نکلا — رگ سے جب سوختہ جاں کے ترے خنجر نکلا
دل

یہ بخت کی امداد ہے، یا یاد کی تاثیر؟ — بھولے سے بھی واں ذکر ~~ہمارا~~ نہیں ہوتا
تمہارا

پھر مجھ کو کچھ خبر نہیں، آگاہ ہے خدا — پی لی تھی ایک بار جو ہاں جان کر شراب
تو

نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی اُن پہ — دیکھتے ہیں تو ہے اس طرح کی بھولی صورت
طور

~~شکر کی جا ہے، تا اک خلق کو مارے ڈالو~~ — کیا قیامت ہوئی، گر ہو گئی اچھی وحشت
خلق کے قتل سے کیا فائدہ؟ بس شکر کرو

~~اتنی صبح تک خم کے خم گردوں میں الٹ گیا~~ — ساقی نے کس قدر مئے گلگوں پلائی رات
باقی رہا نہ یوں تو صبوحی کے واسطے

~~بیخود نہیں~~ اور وہ محو خیال رقیب تھے — تھی وصل میں بھی وہ ہی جدائی تمام رات
ہیں بیخود

~~قاتل بنا ہے تیری ہی تلوار کے لیے~~ — ~~تھی وحشت عاشقوں کو نہ~~ کچھ سر کی احتیاج
قاتل لگا رکھا ہے تری تیغ — منقطع — بیتاب کو اگرچہ نہ تھی

کیا رحم کھا کے میری سفارش کچھ اس نے کی — برہم جو ہے رقیب سے بھی یار کا مزاج
ہے جو

درماں نے تیرے گور میں پہنچا دیا مجھے! اب چارہ گر بتا ہیں کروں کیا ترا علاج

کر

عادل ہے تو تو شک نہیں سمجھا اس میں ہی ایذا ڈالی ہے کس مراد پہ تو نے بنا سے چرخ

لیکن

آپ چل کر کہو احوالِ دل مضطر بیتاب ~~کس کی دوات، قلم کیسی، کہاں کا کاغذ؛~~

کیسا قلم، کیسی دوات، اور کہاں کا کاغذ؛

اس سے

ہو تی ہے جو غلق پہ لیں اب یہیں ہو جائے گی فتنۂ محشر ہوا قربان تری رفتار پہ

صدقے

دشمنوں کا اور فلک کا بھی ہیں اب شکوہ ہو لیا خوش اگر ہوتا ہے وہ ظالم مرے آزار پہ

ممنون

آتشِ فرقت سے اک شعلہ ہو وہ دل نہیں رہا ہاتھ رکھنا اب مرے سینے پہ، دلبر دیکھ کر

کا

لکھ دیا لکھنے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آگیا رد دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر ۴۴

آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب

طبعِ رسا نے اپنی وہ پایا لا کیا اسے پہنچا تھا مرتبے کو نہ اپنے سخن ہنوز

میری

بیتاب کو کسی نے جو پوچھا تو بولے ۵ ہاں خاک پہ پڑا تو ہے اک خستہ تن ہنوز

پوچھا

سخت جانی تجھے اللہ کی مارا او ظالم پھر گیا، زندہ مجھے دیکھ کے دلبر یوں بس

چھوڑ

خدا کرے! ترے پیکانِ تیر کو ~~ستم~~ پسند آئے دلِ بیقرار کی آغوش

ظالم

ہے مرے دوست کا بھی دشمنِ جاں وہ ظالم ہم نے اس واسطے دشمن سے نکالا اخلاص

دوست یعنی معشوق ۔ دشمن یعنی رقیب ۔ رقیب معشوق کا عاشق ہوتا ہے دشمن جان نہیں ہوتا ۔ مانا کہ وہ رقیب معشوق کا درپردہ دشمن ہے ۔ پھر اس عاشق نے اپنے معشوق کے عدو سے اخلاص کیوں نکالا ؟ خدا جانے اس شعر کی فکر کے وقت حضرت کا خیال کدھر تھا ۔ غالب

دوستی اپنی خدا کے لیے کہہ کر رکھیے ۔۔۔ نہیں بھاتا ہے مجھے ناصحو اتنا اخلاص

تھ

~~قاصد کی تاب کیا ہے کبوتر کی کیا مجال ۔۔۔ پہنچا رہے یار تک سنتے ہیں پروردگار خط~~

یہ گستاخی بے مزہ ہے

وے وادیِ دل وگرنہ یہ دونوں ہیں بلا ۔۔۔ کرتے ہیں آہ و نالہ ترا اے خدا لحاظ

ہاں اس میں نمک ہے

دیوانہ ہے وہ کون جو دن کو جلائے شمع ۔۔۔ خورشید کے سامنے کیا کوئی لائے شمع

اس مہروش ۔

~~پروانہ ساں نہ کیوں مجھے شرم آتی ہو~~ ۔۔۔ میں مبتلا ہوں آپ کا وہ مبتلائے شمع

پروانہ مجھ کو کہتے ۔۔ تم کو حیا نہیں ؟

دیکھو یہ چھیڑ ہم سے وہ غیروں کے سامنے ۔۔۔ انجان بن کے پوچھتے ہیں ماجرائے داغ

کہ

درماں کرے گا دیکھیو کس کس کا چارہ گر ۔۔۔ ہے زخم آبلے بھی تو دل پر سوائے داغ

ہے تو زخم اور آبلہ

وحشی تو بھاگ نکلے یقیں ہو مجھے اگر ۔۔۔ دوڑے مرا گلا تری شمشیر کی طرف

اُلٹی وہ

اب پوچھتے ہیں آپ کہ ہے تجھ سے کیا قلق ۔۔۔ جب قابلِ بیاں نہ اپنا رہا قلق

تجھ کو

اتنا کسی سے وصل میں ہوگا نہ عیش بھی ۔۔۔ جتنا کہ تیرے ہجر میں پایا ہم نے سہا قلق

کو

اٹھیں تو وصل کا [illegible] ہزار برس — ہزار سال کو ہم ایک دم سمجھتے ہیں

ہے ایک دم ہزار برس

[illegible] نہیں تیرے مرہم میں چارہ گر — پھر کیوں ہیں زخم دل کو عبث مزا کر دیا

ہر گز نمک

ہوا شق [illegible] وہ بھی — کیا گر ماہ نے ٹکڑے کتاں کو

وہ بھی انگشت نبی سے

مسیحائی نہ دیکھی ہو تو [illegible] — [illegible] آؤ دل ربا کو

گر اس کی — مری تربت پہ لاؤ

بھا گیا اپنے زلیخا قتل کا ایسا ہم کو — بعد مردن بھی کتنی مرنے کی تمنا ہم کو

ہے

عشق نے دم ہی پہ بیتاب بنا دیا آخر — کسی صورت بھی کافر نے نہ چھوڑا ہم کو

ستمگر

ننگ عریانی ہو کیوں قطع نظر سو نے — جبکہ اللہ نے پیدا کیا عریاں مجھ کو

وحشت

[illegible] — یہ بھی دیکھنا تھا، بنایا تھا جو انساں مجھ کو

مقتضیات بشر میں سے نہ تھا صبر مگر؟

دیکھا میں بت کو لگے پڑھنے اسی کا کلمہ — [illegible] ایماں مجھ کو

میرے خالق نے دیا ہے کیسا

ہزار صبر کرو، لاکھ سیئے قرار رہو — اگر وہ چیز [illegible] کہ آشکار رہو

نہیں — تھی

بڑے ادب سے جنے قیس نے کیا سجدہ — [illegible] وہ مزار رہو

کہیں یہ حضرت بیتاب کا

بہاتے ہیں تو دو دریا بہائیں چشم تر دونو — فغان و نالہ ہیں تو ہوں مگر ہیں بے اثر دونو

"دونو" میں نون ضرور ہونا چاہیئے۔۔ اس غزل کو نون کی ردیف میں لکھدو

باغ میں ہو فضلِ گل، زنداں میں ہے یہ گل کھلا — ہے گریباں ہاتھ میں اور پاؤں میں زنجیر ہے
ہیں
اک ذراسی اور بھی تاخیر کرنا، اے اجل — سنتے ہیں کچھ وہاں اپنے قتل کی تدبیر ہے
ہمارے
قتل کرتے ہیں گمانِ دادخواہی پر ہمیں — دیکھیو تو تقصیر سے پہلے یہاں تعذیر ہے
منتیں
گزری اپنی عمر کس چین سے، شکرِ خدا — دیکھیے بیتاب اب کیا خواہشِ تقدیر ہے
گزری اب تک عمر اپنی

(۱۲۱/۲)

قبلہ، قصائد و غزلیات و رباعیات کو بقدر اپنی فہم و فراست کے درست کر کے خدمت میں گزرانتا ہوں۔ چونکہ جانتا ہوں کہ آپ اکبرآباد نہیں گئے، اس لفافے کو آپ کے پاس رامپور کے پتے سے بھیجتا ہوں۔ توقع یہ کہ مجھ کو اپنا خادم سمجھیے اور جو خدمت میرے لائق ہو، بے تکلف ارشاد کیجیے۔ راقم اسد اللہ خاں۔ مرقومہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء

فرماتے ہیں باتیں پہ وہ بیمار کی اپنے — "کیا درد ہے؟ کیوں اس کا مداوا نہیں کرتے"
آکر
ہیں کرنا تھا جو وہ کر بیٹھے — ~~اے بتو بیٹھو~~ گھر بیٹھے
آپ باتیں بنائیں
اپنے ہاتھوں سے کر کے کام تمام — نوحے کرنے کو چارہ گر بیٹھے
نوحہ
حال بیتاب کا نہ پوچھو کچھ — ہم تو اب آستے صبر کر بیٹھے
چھو — اُس سے
وفادار ناصح، مبارک ہو تم کو — ہیں تو دہی بے وفا چاہیے
تمھیں

اگر چشم بد سے، تو کچھ زلف کم ہے؟ یہ سچ ہے بچائے خدا ہر بلا سے

کیا
پاس رکھنے کا جو بیتاب وہ وعدہ کرے صحبتِ غیر بھی واللہ گوارا ہو جائے

کریں وہ وعدہ ناچار
کیا کرے جانتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ کچھ تم عقبیٰ میں تو تاصح رہے کام آنے کے

آپ
کروں کیا جاں سے تنگ آکر دعا کی تو، منت ہی کروائی خدا کی

کریں مرگ کی آخر
ڈرا نا تھا کہ اُس کا دل دکھانا! جدنگِ آہ نے، یہ ہے اخطا کی

نہ
گئے وہ تو ہوا ہم کو بتا کے خوشامد ہے یہاں کیا کیا صبا کی

کر
عبادت سے بڑھی خواہش مرض کی ہمارے درد کی اچھی دوا کی

مرض کا ہو گیا شوق
~~نہ ہنسیے قیس کی دیوانگی پر خبر تو لیجے اپنے مبتلا کی~~
نہ دو پیلے اس کو تم مجنوں کا طعنہ جو دیکھو صورت اپنے مبتلا کی

~~زلف بکھری جو تجھ پر یشاں دل بکھرا خود پریشاں ہوئے ہم اس کو پریشاں کرکے~~
زلف خود بخود بکھرتی ہے۔ ہم نے کب پریشان کیا، جواب کہیں

اضطرابِ دلِ بیتاب، بُرا ہو تیرا بد دماغ اُس کو کیا نالہ و افغاں کرکے

جب
آہ، جس طرح موئے سب عاشق وہی اپنی بھی حقیقت ہو گی

جس طرح آہ۔ طرح اور ہے اور طرح اور ہے۔ "فقیر" کو طرح" بہ حرکت کے معنے میں طرح لیکن نہیں لکھنا۔

~~الفت بتوں سے اپنے تئیں لا کلام ہے~~
"کو" کی جگہ "تئیں" نہ لکھا کرو

~~جبروت ہے نہیں ہے، نہ لاہوت نہ اہا~~
یہ عشق ہے، کچھ اور ہی اس کا مقام ہے
لاہوت ہے نہ یہ جبروت ۱۲ اے خدا پرست: جبروت بحرکت موحدہ اور ملکوت بحرکت لام صحیح ہے
پاکر نجات نزع سے ~~آرام کرتے ہیں~~
سوتے ہیں بے خبر
ہم رہرو فنا ہیں، یہ غربت کی شام ہے
م معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ م
م ساقی اگر نہیں تو نہو، مے سے کام ہے م
م بیتاب، پی، خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ م
م یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے م
(ان دونوں شعروں کے ہر مصرع پر صاد بنا کے دائیں گوشے میں لکھا ہے) واللہ! کیا ذوق انگیز قطعہ ہے۔ غالب (پھر بائیں گوشے میں لکھتے ہیں) خم سے بھر سبو میں، سبو سے شیشے میں، شیشے سے جام میں، اس تقدیم و تاخیر کا مزا میں ہی جانتا ہوں۔ غالب۔
ہر روز اگر وہ ستم ایجاد کریں گے ~~آزاد تو دینے کو~~ کبھی یاد کریں گے
ہر روز کئی بار مجھے
~~پرواز کی ہے گرچہ ہوس دل میں بگرہم~~ آزردہ نہ ~~خاطر تیری~~ صیاد کریں گے
طاقت ابھی موجود ہے لیکن ہم خاطر
آسانی سے کیوں قتل کیا؟ حشر کو یہ تو اللہ رے ہاں، شکوۂ جلاد کریں گے
ہم،

اس طرح مرینگے کہ ہو ہر ایک کو عبرت　　معدوم ہم الفت ہی کی بنیاد کریں گے

دکھ سے

ستم کی حشر میں بھی باز پُرس کیا ہو گی؟　　کسے مجالِ سخن اُ سے، ایخدا، ہو گی؟

اُس سے

~~خدا کے آگے ہمیں پوچھے جائیں گے پہلے　　میری دفوِ ضلالت ہی رہنما ہو گی~~

"پوچھنا" اور ہے۔ پُرسیدن کا ترجمہ پوچھنا بے نون ہے۔ یہ آگہی کے واسطے لکھا ہے۔ شعر غلطیٔ املا کے واسطے نہیں کٹا، بلکہ ناقص تھا۔

~~فلک بہا لگا آنکھوں کی راہ اُس کو بھی　　جو خونِ دل ترے غم میں میری غذا ہو گی~~

خون مذکر، غذا البتہ مونث ہے۔ مگر ذرا غور کیجیے، خون غذا ہو گا یا خون غذا ہو گی!

نہیں ٹھہرا ہے اتنا عرشِ اعظم　　دعا کی بختی یہ کس نے بلیلا کے

ہے

بِن اُس کے خونِ جگر ہم پئیں، یہ مے، ساقی!

خدا کرے، تیرے ساغر میں بھی لہو ہو جائے!

کہ　جام

(اس شعر پر صاد بنا کے حاشیے پر لکھا ہے) شعر اچھا، مگر بھی کا لفظ بے موقع اور بے محل ہے۔

ہوے ہیں گرچہ "نائب"، پر ہوا سے ابرِ باراں میں

ی

رہے ہے، ساقیا، میخانے میں تیار تھوڑی سی

میں سب سمجھے ہوے ہوں، بات کا جو ڈھب تمھارا ہے

نہ چاہوں، ناصحا، میں اُس کو، یہ مطلب تمھارا ہے

ناصح

کہاں ہیں قیس اور فرہاد اب یہ عہد ہے اپنا
دور
کہاں ہیں لیلیٰ و شیریں، زمانہ اب تمھارا ہے
مژگاں کا تیری صید نہ کس طرح سے ہو دل
ہو کس طرح سے
اس تیر کے لیے یہی نخچیر چاہیے
نیکوں سے بھی جھکے رہیں سر کچھ تو، دیر کی
یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا!
مسجد کی چوب و خشت سے تعمیر چاہیے
بلا میں آپ پڑتا ہے تو ناصح ترے اوپر تو کچھ آفت نہیں ہے
تو
خدا کیونکر ملائے دلربا سے؟ نہ کہنے دو کہ یہ قدرت نہیں ہے
معاذ اللہ، مگر
یہی کہہ کہہ کے "ملاؤ عن شناسو" کرے جو چاہے، پر عادت نہیں ہے
بہلاتا ہوں دل کو
ذرا بیتاب کو باہر تو دیکھو تمھارے آگے گو غیرت نہیں ہے
عزت
آج پیغامبر نہ کچھ کہتا ہیں بہت ہم پہ وہ خفا بیٹھے
"وہ ہم پر بہت" جہاں پورا لفظ آ سکے، یعنی پر، وہاں ادھورا لفظ کیوں لکھیے۔ البتہ جہاں گنجایش نہ ہو، وہاں قاعدے کے موافق جائز ہے۔ اور اس قاعدے کا نام تخفیف ہے۔
پھبی قدرت خدا کی اے بتو! تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے
آپ

تیغ کھینچے ہوئے جس وقت وہ قاتل آئے — کوئی ہے میرے سوا، جو کہ مقابل آئے
کون

کیوں یک بیک زمانے کا نقشہ بدل گیا — یہ رنگ تو ہوا تھا نہ دنیا میں آشکار
ناگاہ کیوں

~~تزئین کچھ آج کل ہے وہ اس خاکدان کی~~ — خلد بریں بھی رو برو ہے جس کے شرمسار
یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا!

گل نے کہا ہے شاخ کے ہر جزسے سر بڑے — اب کونسی جگہ ہے کہ نکلے جہاں سے خار
جزو ظہور

بیٹھے ہیں مطمئن سبھی بزم نشاط میں — ہاں اک صبا تو پھرتی ہے گلشن میں بیقرار
نسیم

کثرت سے بسکہ جمع ہوئے شاہدانِ گل — کس کس مزے سے ہوتے ہیں آپس میں ہمکنار
ہوتے ہیں

دن عید ہے زمانے میں اور رات شب برات — ہر سمت راگ و رنگ ہے قانون اور ستار
شب

وہ دن ہی آج، جس پہ کروں جان نا نثار — ہے جشنِ غسلِ صحتِ نوابِ نامدار
فدا۔ اگر یہ مطلع ہے تو چاہیے اس سے پہلے ایک شعر میں اطلاع دیجائے

بیشک طمانچۂ ملک الموت گرز ہے — ہے تیغ اُس کی قہرِ خدا وقتِ کارزار
تپانچہ؟

ممکن نہیں جو کر سکے ممدوح کی صفت — بیتاب، اب دعا ہی بہتر ہے اختصار
ثنا

عالم کے حق میں آیتِ رحمت بتا دیا — رکھے سلامت اُس کو زمانے میں کردگار
آیۂ

بات یہ ہے وقت پر خوب سمجھا مجھے — فکرِ رسا کا بڑا مجھ پہ یہ احسان ہوا
سمجھا [illegible]

دھوم ہے سرکار میں جشن کا ساماں ہوا — عرش سے لے فرش تک عیش کا طغیاں ہوا

ہے — ہے آج

رنگ محل کا سماں ہو نہیں سکتا بیاں — جس کی نظر پڑ گئی ششدر و حیراں ہوا

دالہ

کثرتِ مُقیّش سے مثلِ جبینِ عروس — روی زمیں پر عجب طرح کا افشاں ہوا

طرز

بزم منور ہوئی مقدمِ نوّاب سے — جیسے کہ وہ رونق فزا جوں مہ کنعاں ہوا

جیسے کہ — وہ

جوں بمعنی مثل و مانند اب متروک ہے، اور چوں لفظِ فارسی الاصل تو آگے بھی متروک رہا ہے۔

دور میں اس کے بجز ابر نہ رویا کوئی — اور جز اس کے سوا کوئی نہ نالاں ہوا

بجز رعد کے

مسندِ اقبال پر یوں وہ نمایاں ہوا — صفحۂ گردوں پہ جوں مہر درخشاں ہوا

(میرزا صاحب نے اسے قلم زد کر کے یہ مطلع لکھا تھا)

دودۂ چنگیز میں جیسا کہ قاآں ہوا — ویسا ہی اس قوم میں کلبِ علیخاں ہوا

(اس پر بیتاب نے لکھ دیا ہے "قصیدۂ ہذا در شانِ یوسف علی خان بہادر مرحوم بود، ازین سبب شعر ہذا نوشتنی نیست)

ہو رہی ہے عجب آراستگی کہنہ سرا — سب فرشتے اسی خدمت پہ ہوئے ہیں مامور

دنیا کی

نہ کھڑے کرتے ہیں سجادۂ طاعت جبریل — ایک طرف ہاتھ میں رکھتے ہیں سرافیل بھی صور

سے

فیضِ ارواح سے معذور ہو عزرائیل — موت کا غم ہی کسی کو نہیں سب ہیں مسرور

کی فکر

اور شجاعت کا یہ عالم ہے کہ زہرہ ہو آب — دیکھ لیں ~~حضرت رستم~~ اگر اس کی تمثال

اے رستم دستاں

ہو بہ حیرت جس میں تھا کہ زمیں پر اللہ — عرش کی سیر کا اک ب کو گر آجائے خیال

کہ میں یہاں — یا رب

~~وعدہ کیا تھا وفا ایک جز لاینفک سے~~ — ~~عہد کا نقض ہوا عہد میں اس کے یہ محال~~

جز لاینفک غلط۔ جزو لاینفک صحیح۔

بھوکے پیاسوں کے خور و نوش کے کیوں آتے نہ دن
یہ مسلم ہے کہ بعد رمضاں ہے شوال

از

فلک پر کوئی اڑ جائے، پسعہ ہی — نصیبوں میں سوا دو گز زمیں ہے

پر آخر

بہ پیچ انجمن کے قابل ہیں معشوق — مگر عشاق پر بھی آفریں ہے

کو

جناب غالب ~~دوراں کا~~ بیتاب — خلوص طبع سے اب خوشہ چیں ہے

کلام حضرت، غالب دوراں لفظاً نامانوس ہے

اے دل تو اس کو دیکھ کے ایسا پھسل گیا — حیراں ہوں میں کہ پہلو سے کیونکر نکل گیا

سینے

دل پر بنی ہوئی تھی اچھل کے نہ آنے سے — اب جاں پہ آبنی تو ذرا دل سنبھل گیا

جو

کیسا مزا دکھاتے ہیں ہم بھی، تو ٹھہر جا — تقریریں کر کے روز یہ ناصح، تو ہل گیا

ٹھہر تو

بھا ہل ہے وہ نیز اب کا، کیوں ہوتے ہو برہم؟ — ہم نے دلِ پر داغ پہ رکھا ہے ~~جو~~ مرہم

تھیں

وہ بات کر دیجئے نہوں نالۂ وافغاں — بیچین ادھر رہتے ہو تم اور ادھر ہم

جس سے

کہوں کیا وہ یوں بنانے کی نہیں ہے — رقیبوں کے سنانے کی نہیں ہے

وہ بات ایسی چھپانے — یہ غیروں کا

~~نہیں سچ باد دلانے کی نہیں ہے~~ — یہ الفت بھی دکھانے کی نہیں ہے

نہ کر مجھ سے کسے میری بلا بیں — مرا

وہاں رقیبوں سے گرم صحبت، یہاں امید وفا ی وعدہ

ہے ایک طرفہ ہی یہ تماشا، تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش

یہ طرفہ تر

محبت تری، اسکی نفرت بڑھی — یہ کیسا پڑا اب دل زار پیچ

لے

مسرور ہوں اغیار، خدا کی قدرت! — اُن سے ہو ترا پیار، خدا کی قدرت

اور بیٹھے رہیں بزم میں تیری ظالم — ہم شکل گنہ گار، خدا کی قدرت

چپکے — مثل

غافل نہ کر اپنی زندگی کو تو خراب — دنیا کا یہ کارخانہ ہے مثل سراب

زندگانی

یا الٰہی، یونہی وہ برسر بیداد رہے — مر چکے ہم تو، نہ غیروں کی بھی بنیاد رہے

مٹ گئے

گر یونہی ٹھہری کہ گلزار نہ آباد رہے — بلبلو، کوچ کریں، باغ میں صیاد رہے

بلبلیں

ضعف میں رگ تو کہاں، ہاتھ نہیں ہاتھ آیا — کیوں تری فصد سے حیرت میں رہے فصاد رہے

فصد — فصاد

اسکی مظلومیں پہ رحم آئے نہ کیونکر بیتاب — قتل کے بعد بھی خوش بیٹھے نہ جلاد رہے

کے مقتولوں — جس سے

نہیں تلوار کے تاننے کی بھی اب کچھ حاجت — تیرے ابرو کے اشارہ نے مارا قاتل

سے ہی

دیکھنے کو جو ہم عشاق کی محفل آئے — سب پکار اٹھے کہ لو مرشد کامل آئے

ہم ہو گا، دیکھئے "جو ہم عشاق" ہیں عین تقطیع سے گر جاتا ہے۔

ہوں وہ میکش جو کہیں ہوش ہوا و عزم کروں — میکدہ لینے کو میرے کئی منزل آئے

کبھی

بدنصیبوں کی نوید وصل کی خوبی دیکھو — کہ وہ آئے بھی تو اغیار کے شامل آئے

شب

بلی تیرے سوا کہتے وہ فریاد کرے — جب کہ بیتاب پہ مولا، کوئی مشکل آئے

کس سے

"بمطالعۂ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیلچند صاحب میر منشی سلمۂ اللہ تعالیٰ مفتوح باد"

[منشی سیلچند راجہ کنور سین کی اولاد ہیں۔ کنور سین قوم کے کائستھ اور نواب سید علی محمد خاں بہادر فاتح روہیلکھنڈ کے معتمد سردار تھے۔ قلعہ سرہند کی فتح میں اپنے ولی نعمت کے ہمرکاب خدمات شائستہ انجام دے کر بادشاہ دہلی کے دربار سے راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ روہیلہ سلطنت کے ٹکڑے ہوئے اور نواب سید فیض اللہ خاں بہادر ریاست رامپور کے والی بنکر اس خطے میں تشریف لائے تو ان کے ہمرکاب تمام وفادار سرداران روہیلہ کے ساتھ منشی صاحب کا خاندان بھی تھا۔ منشی سیلچند کی تاریخ ولادت اور جائے پیدائش کا صحیح حال معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ء کو ان کی عمر اکیاسی سال کی تھی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۸۱۳ء قرار پاتا ہے۔ ان کا ابتدائی تقرر نواب سید احمد علی خاں بہادر کے عہد حکومت میں بعہدہ ناظر نظامت ہوا بعد ازاں عامل (تحصیلدار) مقرر ہوئے ۱۸۴۴ء میں ان کے والد نے وفات پائی، تو ان کی اسامی پر محکمہ دار الانشاء میں بدل دیئے گئے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں ریاست کی طرف سے خبر رسانی و فراہمی رسد وغیرہ کا کام انجام دیا، اور نواب گورنر جنرل بہادر سے بصلۂ خدمات دربار فتح گڑھ میں دوشالہ انعام میں پایا۔ نواب فردوس مکاں نے بھی ان کی خدمات کی تعریف میں روبکار جاری فرمایا اور تلوار عطا کی نواب صاحب کی وفات کے بعد خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں نے بھی ان کی بہت قدر و منزلت فرمائی۔ بالآخر پانچ والیان ریاست کی خدمت کر کے ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ء کو ۸۱ سال کی عمر میں رامپور میں انتقال کیا۔

منشی سیلچند کو فارسی میں دستگاہ کامل حاصل تھی اور ملا غیاث الدین رامپوری مولف غیاث اللغات سے شرف تلمذ تھا۔ شعر بھی کہتے اور منشی تخلص کرتے تھے]

۱۲۲

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیلچند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد دعای دوام حیات و ترقیٔ درجات معلوم فرمائیں۔ اگرچہ از روی خطوط حضور، صحت و عافیت حضور معلوم ہوئی ہے، لیکن یہ کہیں سے نہیں سنا کہ غسل صحت کیا، یا کس دن کریں گے۔ آپ سے یہ فقیر کا سوال ہے کہ مجھ کو لکھیے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکے ہوں، تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔

خیر و عافیت کا طالب، غالب ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء[۱]

۱۲۳

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان،[۲] منشی سیلچند صاحب میر منشی کو خدا سلامت رکھے۔!

مادۂ تاریخ غسل صحت کو تم نے غور نہیں کیا ۱۸۶۶ عدد ہوتے ہیں پھر کیا حضور سال آئندہ غسل صحت فرمائیں گے؟ یہ تو جنوری سال ۱۸۶۵ ہیں۔ اس تاریخ کا قطعہ کیونکر لکھوں؟

یہ جو میں نے قصیدۂ تہنیت[۳] لکھ کر بھیجا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ شاہ کبیر الدین صاحب[۴] رامپور سے آئے، اور انہوں نے کہا کہ نواب صاحب جمعے کے دن ساتویں تاریخ شعبان کو نہائیں گے۔ اب تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ ماہ آیندہ یعنی رجب میں نہائیں گے۔ خیر، وہ کاغذ تو حضور کی نظر سے گزرے گا۔ اگر موقع پاؤ، تو حضور میں یہ ماجرا عرض کر دینا کہ میں نے بموجب روایت شاہ کبیر الدین کے اس کے ارسال میں جلدی کی ہے۔ غالب

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵

۱۲۴

منشی صاحب، عجب اتفاق ہے کہ حضور[۵] اپنے خط میں اپنے مزاج مبارک کا

حال کچھ نہیں لکھتے، اور میرا دھیان لگا ہوا ہے، خدا کے واسطے تم مفصل حال لکھو کہ کیا عارضہ باقی ہے، اور صورت کیا ہے؟ دربار بدستور ہوتا ہے یا نہیں؟ سوار ہوتے ہیں یا نہیں؟

زین العابدین خاں نے جیپور سے اپنے اشعار اصلاح کے واسطے میرے پاس بھیجے۔ میں نے اصلاح دینے سے انکار کیا، اور اشعار مسترد کر دیئے ان کا خط اور اس کی پشت پر اس کے جواب کا مسودہ اس خط میں لپیٹ کے تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ لو، بلکہ اگر موقع اور محل پاؤ، تو حضور کو بھی پڑھوا دو۔ والدعا

اسد اللہ خاں غالب ۱۴۔ مارچ سنہ ۱۸۶۵

۱۲۵

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں منشی سیلچند صاحب میر منشی کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ یہ خط[۲] میں نے ایک ستار ساز کی فکر میں حضور کو لکھا ہے مگر مسودہ جو ہر بار کچھ کا کچھ ہوتا رہا، اس سبب سے میرے پاس نہیں رہا اور خدا کی قسم، کہ میں اب بہت ناتواں ہو گیا ہوں؛ یہ خط لیٹے لیٹے صاف کیا ہے اور اس تحریر کو مجموعۂ نثر میں رکھا چاہتا ہوں۔ آپ اسکی نقل کر کے مفر[۳] مجھ کو بھیج دیجے گا۔ بڑا احسان مجھ پہ ہو گا۔[۴] اسد اللہ۔ فقط

۱۲۶

منشی صاحب سعادت و اقبال[۵] نشاں منشی سیلچند صاحب، طال عمرہٗ!

تین صاحبوں نے اطراف و جوانب سے تین قصیدے میرے پاس بھیجے ہیں حیران ہوں کہ کیا کروں! اگر حضور میں نہ گزرانوں اور ان کو لکھوں کہ میں نے گزران دیئے، تو جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور میں جھوٹ سے بیزار ہوں۔ گزرانتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، ادب رخصت نہیں دیتا۔ ناچار وہ تینوں قصیدے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ یہی اُن صاحبوں کو لکھوں گا کہ میں نے میر منشی کو حوالے کر دیئے[۵]۔ فقط

سید فرزند احمد بلگرامی صفیر تخلص۔ یہ سید نور الحسن خاں بلگرامی کا پوتا اور صاحب عالم، پیرزادہ مارہرہ، کا نواسا ہے۔[1]

حالی تخلص، مولوی الطاف حسین، پانی پت کے رئیس، عالم، شاعر نواب مصطفیٰ خاں کے رفیق۔ قصیدہ عربی[2]

تیسرے قصیدے کے خاتمے پر شاعر کا نام و نشان مرقوم[3]

۱۲۷

منشی صاحب سعادت و اقبال نشاں، عزیز تر از جان، منشی سیلچند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے[1]۔ کیوں صاحب، ہم تو تم کو اپنا فرزند سمجھیں، اور تمہارا یہ حال کہ مراسم فرزندی بجا نہیں لاتے، خط لکھنا تم نے یکلم موقوف کر دیا۔ اور بھائی بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے، نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں۔ آج کے نواب صاحب کے خط میں دو جگہ غلطیاں ہو گئیں مجھ سے۔ لکھنا کچھ چاہتا ہوں لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بس اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا، کل بچا پرسوں مرا۔

اس خط کا جواب، مجھ کو جلد لکھو، اور اس میں یہ لکھو کہ احسان حسین خاں اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں جو لکھنؤ سے آئے ہیں[2] نواب صاحب کی سرکار سے ان کا کیا درماہہ مقرر ہوا ہے، اور تعظیم و توقیر کا کیا رنگ ہے، دربار میں جو آتے ہیں، تو بیٹھتے کہاں ہیں[3]؟

اس خط کے جواب کا طالب غالب۔ ۱۱ جون

۱۲۸

برخوردار، نور چشم، منشی سیلچند مہر منشی کو بعد دعا کے یہ معلوم ہو کہ اگلے مہینے یعنی اگست سنہ ۱۸۶۸ء کی، تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی، اس کا روپیہ اب تک نہیں پٹا۔ میں تو جس دن ہنڈوی آتی ہے،

اُسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہاتھ، کہ وہ بھی مہاجن ہے، بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اُس مختار کار کو، جس کے ہاں ہنڈوی آئی ہے، اُس نے روپیہ ابتک نہیں دیا۔ ۸ ستمبر کو وہ ہنڈوی بیچ کر روپیہ میں نے لے لیا تھا، اور آج ۱۸ ہے۔ مختار کار کو روپیہ اُس نے ابتک نہیں دیا۔ جس سے تم نے ہنڈوی لکھوائی ہے، اُس کو تم تاکید کرو کہ یہاں کے مہاجن کو روپیہ دینے کی تاکید لکھے، تاکہ[۱] مختار کار کا روپیہ پٹ جاوے۔

(مہر: غالب ۱۲۷۸)[۲]

بنام خلیفہ احمد علی صاحب احمد رامپوری

[خلیفہ شیخ احمد علی صاحب احمد تخلص ولد شیخ نادر علی، تقریباً سنہ ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے۔ فارسی کتابیں مولوی عنبر شاہ خاں عنبر اور کبیر خاں تسلیم سے پڑھیں اور عربی علوم و فنون دیگر علما سے شہر سے حاصل کیے۔ ادبیات فارسی کے ذوق نے خلیفہ صاحب کو عربی علوم کے لطائف کی طرف متوجہ ہونے دیا، اور ان کی ساری عمر شیراز و شروان ہی کے مرغزاروں کی سیر میں گزر گئی۔ رامپور کے اکثر فارسی ادب کے علما کا سلسلہ ان تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں طاب ثراہما کی اُستادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ خلیفہ صاحب نے جمعرات کے دن ۲۹ رمضان ۱۳۰۹ ہجری (۲۸ اپریل سنہ ۱۸۹۲ء) کو ۹۰ سال کی عمر میں اپنے مکان واقع محلہ بنگلہ آزاد خاں (رامپور) میں انتقال کیا۔ ان کی فارسی نظم و نثر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔

مرزا صاحب رامپور تشریف لائے، اور خلیفہ صاحب سے ملاقات ہوئی، تو متوخر الذکر نے اثنائے گفتگو میں عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی اور مثالاً یہ دو شعر پیش کیے:

ساکتم، این نغمہ تا در نیم شب | ہمرہِ مرغِ سحر خوان می زنم
شاہدی سوز کہ یک نفس گوشتی | ہدلِ درد پسرہ اندازد

میرزا صاحب نے عرفی کی حمایت کی۔ لیکن اُس وقت بحث ناتمام رہی اور یہ طے پایا کہ خلیفہ صاحب شب کو آکر گفتگو کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس رات کو تشریف نہ لیجا سکے، اِس لیے میرزا صاحب نے اپنے دلائل لکھ کر اُن کی خدمت میں بھیج دیے۔

تذکرۂ کاملانِ رامپور (ص ۲۴) میں اختلافی شعر یہ لکھا ہے:

من کہ باشم عقلِ کل را تا دکاں نداز ادب مرغِ توصیف تو از اوجِ بیان انداختہ

مگر میرزا صاحب کی آیندہ تحریر کی روشنی میں اس کی صرف یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ مذکورۂ بالا دو شعروں کے ساتھ یہ بھی معرضِ بحث میں آیا ہوگا، ورنہ میرزا صاحب خط میں اسی کا ذکر کرتے]

(۱۲۹/۱)

جناب مولوی صاحب مخدوم احمد علی صاحب کی خدمت میں بعدِ سلام مسنون الاسلام عرض یہ ہے کہ فقیر شب کو آپ کا منتظر رہا، آپ تشریف نہ لائے، ناچار تقریر کو تحریر کا پیرایہ دے کر آپ کی جناب میں بھیجتا ہوں۔ سنینِ فارسیہ کا حال بسبیلِ اجمال ایک دو ورقے پر مندرج ہے۔ بنظرِ اصلاح مشاہدہ ہو۔

بعد اُس کے مُدعا عرض ہے کہ ہرچند "سحر" اور "صبح" مرادف یا بلفظے ہیں، اور وہ انجامِ لیل اور آغازِ نہار ہے، مگر بخلافِ صبح، "سحر" بطریقِ مجاز بعدِ نصفِ شب سے صبح تک مستعمل ہے۔ طعامِ آخرِ شب کو "سحری" اور "سحرگہی" کہتے ہیں، اور مرغانِ خوش آواز، کہ بلبل بھی اُن میں ہے، اکثر پہر سوا پہر رات سے بولتے ہیں۔ نصفِ شب کو مرغِ سحر خواں کا ہم آواز ہونا محلِ اعتراض نہیں ہے "گوش" کا استعمال "انداختن" کے ساتھ، اگر شعرای ہند کے کلام میں آیا ہوتا، توہم اُس کی سند اہلِ زبان کے کلام سے ڈھونڈتے۔ جب وہ خود عرفی[۲] نے لکھا ہے، توہم سند اور کہاں سے لائیں؟ قواعدِ زبانِ فارسی کا ماخذ تو ان حضرات کا کلام ہے۔ جب ہم انھیں کے قول پر اعتراض کریں گے، تو اُس اعتراض کے واسطے قاعدہ کہاں سے لائیں گے؟ اِن سب باتوں کو جانے دیجیے اس کو ملاحظہ کیجیے کہ عرفی اکبر شاہ[۳] کے عہد میں تھا اور اُس عہد میں قطعِ نظر اور اہلِ کمال سے ابوالفضل[۴] اور فیضی[۵] یہ دونوں شخص کیسے فاضل تھے۔ اور پھر عرفی کا ممدوح حکیم ابوالفتح[۶] اس کا وہ پایہ علم میں تھا کہ فیضی اور ابوالفضل کو بھی خیال میں نہ لاتا تھا۔ اگر یہ دونوں شعر عرفی کے غلط ہوتے، تو

یہ تینوں آدمی اُس کی دھجّیاں اُڑا ڈالتے، حال آنکہ فیضی و ابوالفضل اُس کے دشمن تھے۔ پس جب ان دونوں نے باوجودِ عداوت اعتراض نہ کیا، تو اب عرفی پر کون اعتراض کرسکتا ہے؟ عرفی کی زبان سے جو نکل جائے، وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے، اور ہم اُس کے مقلد اور مطیع ہیں۔ غالب

بنامِ مولوی محمد حسین خاں مالکِ مطبع

[مولوی محمد حسین خاں، ابنِ مولوی محمد حسن خاں، ابنِ شاہ محمد خاں مہمند افغان رامپور کے ایک شریف و باعزت خاندان کے فرد تھے۔ ان کے پردادا، نواب سید محمد فیض اللہ خاں بہادر کے ہمراہ افغانستان سے تشریف لائے اور فوج میں بعہدۂ جمعداری مقرر ہوئے۔ مولوی محمد حسن خاں نے تیغِ نیاگاں کو قلم سے تبدیل کر لیا، اور اُس زمانے کی مروج تعلیم حاصل کر کے نواب فردوس مکاں کے حسب ایما سنہ ۱۸۵۶ء میں مطبعِ حسنی قائم کیا۔ بعد ازاں نواب خلد آشیاں کے حسب الحکم ۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۸۳ (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) کو اخبارِ دبدبۂ سکندری کا پہلا پرچہ شائع کیا۔ مولوی محمد حسن خاں نے مولوی محمد حسین خاں کو اپنی زندگی ہی میں مطبع کا مہتمم اور اخبارِ دبدبۂ سکندری کا مدیر بنا دیا تھا۔ منگل کے دن ۲۹ شعبان $\frac{۱۳۲۲ھ}{۱۹۰۴ء}$ کو ان کا انتقال ہو گیا، تو چند سال تک ان کے چھوٹے بھائی مولانا شاہ فاروق حسن خاں صاحب صابری، رحمہ اللہ نے اپنے مشاغلِ طریقت کے ساتھ دبدبۂ سکندری کو بھی مرتب کیا کچھ مدت بعد سے فرائضِ ادارت اُن کے فرزندِ اکبر مولانا فضلِ حسن خاں صابری انجام دے رہے ہیں۔ مؤخر الذکر بزرگ نے اپنے گرامی نامۂ موسومۂ عرشی میں تحریر فرمایا ہے: "اخبار دبدبۂ سکندری کی ہندوستان بھر کے اخبارات میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ۷۴ سال کی مدتِ مدید میں برٹش گورنمنٹ اور لوکل گورنمنٹ نے کبھی اس کے ایک حرف پر نہ کوئی اعتراض کیا، نہ اس سے کبھی ضمانت طلب ہوئی، نہ اس پر کسی نے آج تک کوئی مقدمہ چلایا۔" دبدبۂ سکندری، ج ۷۴، نمبر ۳۵، ۱۳، مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۴۰ء]

۱۳۰
۱

مشفقی اور مکرمی محمد حسین خاں صاحب کو غالبِ آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے پھیرے، کئی خط آپ کے پھیرے اور آپ اخبار بھیجے جاتے ہیں۔ الٰہی! آپ کا خط خط تھا، یا کوئی جھوٹ کی پوٹ۔ بیشتر مجذوبوں کی سی بڑ، اور جو کچھ سمجھ میں آیا، وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ۔ یہ غلط محض ہے کہ مطبع[1] حضور کا ہے اور تم مہتمم ہو حضور کی طرف سے۔ اللہ۔ اللہ! ڈگیجے سنگھ[2] کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک ورق سیاہ کرتے ہو، اور اپنے والئ ملک اور اپنے پادشاہ یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خاں بہادر کے نام (کے)[3] آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کے لکھتے ہو بس، اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہے، تو گویا ڈگیجے سنگھ[2] کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہو گی۔ ہندوستانی علداری[4] میں وہ ایک زمیندار اور مالگذار تھا۔ اب گورنمنٹ ہند نے اُس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خاں، رئیسِ ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔[5] اس سے معلوم ہوا کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی، "یک در گیر و محکم گیر"۔ اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم، تو آخر رعیت تو ہو۔ یہ کیا ہے کہ اپنے پادشاہ کا ذکر سب سے پیچھے لکھتے ہو کبھی صفحے پر کبھی حاشیے پر؟ ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمہارا اخبار موقوف کیا ہے، اور اب پھر تمہیں لکھتے ہیں کہ دوہائی خدا کی، میں یکم جنوری ۱۸۶۸ء سے دبدبۂ سکندری کا خریدار نہیں ہوں! نہ بھیجا کرو، واسطے خدا کے، نہ بھیجا کرو! اس سے زیادہ کیا لکھوں!

(مہر: غالب، ۱۲۷۸)[6] (۲۵ فروری سنہ ۱۸۶۸ء)

تم بالخیر۔ والحمد للہ اولاً و آخراً

حواشی

صفحہ ۱

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے۔

صفحہ ۳

(۱) میرزا صاحب کے اس قطعۂ تاریخ کا پتا نہیں چلا۔
(۲) مولانا فضل حق، مولانا فضل امام صاحب کے صاحبزادے اور خیرآباد کے رہنے والے تھے سنہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۲ صفر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو انڈمان میں وفات پائی۔ موصوف نے علوم عقلیہ و نقلیہ اپنے والد ماجد سے اور حدیث مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے پڑھی تھی۔ امیر مینائی لکھتے ہیں:

"فنونِ حکمیہ میں مرتبۂ اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی، خلیق و ذلیق، انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق ... جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ عدالتین کے سررشتہ دار تھے، مگر بڑے ذی اقتدار و صاحب اختیار تھے۔ جھجر میں مشاہرۂ جلیلہ پر نوکر رہے۔ الور و سہارنپور اور ٹونک سب جگہ معزز و موقر رہے۔ لکھنؤ میں صدرالصدور رہے تھے، اور اس دارالریاست (رامپور) میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر مرافعۂ عدالتین پر مامور تھے۔ جناب نواب فردوس مکاں کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے، اور بندگانِ حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ پھر یہاں سے تشریف لے گئے۔" (انتخابِ یادگار: ۲۹۱)

مولانا کی تصانیف یہ ہیں: (۱) مجموعۂ قصائد عربی (۲) رسالۂ غدریہ (۳) رسالہ امتناع النظیر (۴) ہدیہ سعیدیہ۔ آخری کتاب نواب سید محمد سعید خاں بہادر کے نام پر (نواب فردوس مکاں) کے لیے لکھی گئی تھی۔ میرزا غالب ان کے مخلص دوست اور معتقد خاص تھے۔ مولانا نے سررشتہ داریِ عدالتِ دہلی سے استعفا دیا اور نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر جھجر تشریف لے جانے لگے، تو اہلِ دہلی کو بے حد قلق ہوا۔ میرزا صاحب مولوی سراج الدین احمد کے نام خط میں مولانا کی علمی منزلت کے متعلق تحریر کرتے ہیں: "نہفتہ مباد کہ بے تمیزی و قدرناشناسی حکام رنگِ آں ریختہ کہ فاضلِ بے نظیر و المعی یگانہ، مولوی حافظ محمد فضل حق، از سررشتہ داری

عدالتِ دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وارہاند۔ حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضلِ حق آن مایہ بکاہند کہ از صد یک وا مانند، و باز آن پایہ را بسررشتہ داریِ عدالتِ دیوانی سنجند، ہنوز این عہدہ دونِ مرتبۂ وی خواہد بود۔" (کلیاتِ نثر: ۱۴۷)

(۳) اس عریضے میں میرزا صاحب نے جس سابق تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے وہ رشتۂ استادی تھا۔ نواب فردوس مکاں اپنے والد ماجد کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ان کے چچا نواب سید عبداللہ خاں بہادر، صدر الصدور میرٹھ، اور نواب سید عبدالرحمن خاں بہادر میرزا صاحب کے محبِّ خاص تھے۔ غالباً انھیں دونوں کے حسبِ تجویز، نواب صاحب نے میرزا صاحب سے فارسی کی تعلیم پائی۔

اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۵ فروری سنہ ۵۷ کو ارقام فرمایا: "منیقۂ انیقۂ بلاغت آگین مشعرِ رسیدِ خطِ مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضلِ حق صاحب با دیگر مراتبِ محبت و اشفاق بعبارتِ رنگین و دقیق در عینِ انتظار سرمہ کشِ عیونِ وصول نشاط شمول گردیدہ، باطلاعِ خیریتِ مزاج سرمایۂ تا محصور افزودہ، از مزید شفقت و ائتلافِ قلبی منصور شد۔ مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاقِ موزونیتِ یک مصرعہ ہم نشدہ بود، لیکن محض بجہتِ سماعتِ کلامِ سامی زبانی مولوی صاحب صدر الصدور دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چوں سہلی باز بن منظر نرسید، لہذا چند ابیات را ہیاتِ موزون نمودہ، نیز صدا اصلاح پیشِ آن یگانۂ آفاق مرسل گشت۔ چشم داشت کہ بعد اصلاح، غزلہای مذکورہ مع کدام طرحِ جدید لطف فرمودہ شوند۔ از انجا کہ انجاحِ شیرینی ہم درین خصوص از دستور است، لہذا ہنڈوی مبلغ دو صد و پنجاہ روپیہ شیرینی ملفوف رقیمۂ الوداد بہ خدا میرسد۔ بمقتضای الطاف منظور فرمودہ از رسیدِ آن مطلع فرمایند۔ و مخلص را لیل و نہار متمنی اخبار باخبار تصور فرمودہ، اکثر با یصالِ تمائق انائق خیریت وثائق بعبارتِ سلیس، کہ در خواندنش تاملی بہ قوہ نباید، مسرور و ممکن می فرمودہ باشند۔"

صفحہ ۵

(۱) اس قصیدے کے لفافے پر میر منشی صاحب لکھتے ہیں: "قصیدۂ ہا ناگہ گوہر جان فرستم بتاریخ ۱۹ شعبان سنہ ۱۲۷۳ھ بمواجہۂ میرزا نوشہ صاحب بحضور پر نور گزرانیدہ شد۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے قیام رامپور کے زمانے میں نواب صاحب نے قصیدہ دار الانشا سے منگا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ چونکہ اس کا شاملِ مثل ہونا تحقیق تھا، اس لئے کلیاتِ فارسی (ص ۳۲۵) سے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ قصیدے کے متعلق نواب صاحب کی رائے چوتھے عریضے کے حاشیے میں درج ہوگی۔ پتے کے نیچے میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"از غالب بکر بنگ، بیرنگ (ارزو)، احتیاط، چہارشنبہ، یازدہم فروری سنہ ۱۸۵۷"

روانگی قصیدہ کی یہی تاریخ تیسرے عریضے میں بھی مذکور ہے۔

(۲) مولانا فضلِ حق خیرآبادی مراد ہیں۔

(۳) ڈاک خانے کے اس نئے بندوبست سے میرزا صاحب کا مطلب وہ نیا انتظام ہے جو لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں عمل میں آیا تھا۔ ہر نئے انتظام کے وقت کچھ دشواریاں ضرور پیدا ہوتی ہیں، بعید نہیں کہ اس نظم سے بھی لوگوں کو شروع شروع میں ایسی دقت اٹھانا پڑی ہو۔

(۴) اس سے وہ قصیدہ مراد ہے، جو ابھی نمبر ۲ پر گزر چکا ہے۔

(۵) سفنجہ ہنڈی کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ فارسی کا لفظ سفتہ ہے، جس کے آخر میں تصغیر کے لیے چہ بڑھائی گئی ہے۔ عربی میں سفتہ کو سفتجہ کہتے ہیں۔

صفحہ ۶

(۱) یہ پرانا محاورہ خود میرزا صاحب کے صرف چند خطوں میں نظر آتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں فصحائے دہلی اس سے بچنے لگے تھے۔

(۲) یہاں پر "اس" کی جگہ "ان" ہونا چاہیے، اس لیے کہ اوپر مسودوں کا ذکر ہے۔ غالباً میرزا صاحب کے ذہن میں لفافہ آگیا جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ اس کے خیال سے جمع کی جگہ واحد ضمیر استعمال کر گئے۔

(۳) ط نقطہ کی طغرائی شکل ہے۔ اکثر پیراگرافوں کے خاتمے یا پورے مضمون کے خاتمے پر بنائی جاتی تھی۔ میرزا صاحب نے بھی جگہ جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ ہم نے سہولت قرأت کے خیال سے ہر جگہ نقطہ لکھ دیا ہے۔

(۴) تیسرے اور چوتھے عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکان نے ۳ رجب سنہ ۱۲۷۳ ہجری یکم مارچ سنہ ۵۷ء کو تحریر فرمایا: "...... دو فقرۂ صحیفۂ خیر بہر کی مشعر ترسیل قصیدۂ مضمون انتظام دہم در جواب رقیمۂ الوداد و رسید اشعار و سفتجہ، مرسلۂ اینجا، و ثانی مع اشعار مذکور بعد نظیر اصلاح و تجویز چند الفاظ جہت تخلص مخلص با بہا ہی پسند از آنجملہ بمضامین برجستہ و عبارات دلپسند متواتر بسبیل ڈاک گلگونہ آرائی چہرۂ وصول فرحت شمول گردید ..... و مطالعۂ قصیدہ نادرۂ فصاحت تضمین کہ اگر ہر شعر تغزش را گنجینۂ معانی و معدن لآلی سخندانی خوانند بجا، و گلدستۂ برچیدۂ چمنستان علوم و کمال نامند زیبا، غواص فکر در بحر زخار استعارات و نکات متینش مستغرق گرداب نارسائی، و اوہام عقلای زمان در دریافت خوبی و بلاغت آں خزینۂ اسرار معترف بہ کوتاہی، قصائد عرفی و خاقانی بمقابلۂ متانت و برجستگی مضامین نزہت آگینش ہیچ، و معانی فیض قرین در الفاظ نادرش چون زلف ماہرویان پیچ در پیچ، الواب افادہ و انشراح بی اندازہ بر روی دل صفا منزل کشود و زنگ کتانت طبعی از تجمل خواطر مستفیضان زدود۔ و غزلیات کہ بنظر اصلاح آہن کہ بپارس آشنا شد۔ فی الفور بصورت طلا شد۔ فائز گشتہ لطف شد ند، مخلص صمیم مشکور الطاف و بذل توجہات بیغایات آں مستغنی الصفات گردید۔ العظمۃ للہ! تغیر و تبدل الفاظ نادرہ در اشعار مذکور چون نقش بر نگین زینبی تازہ گرفت و طلای طبع خام بر محک فیض عام جلوہ پذیرفت ...... و مجملۂ الفاظ تخلص لفظ "ناظم" مطبوع طبع نیاز گشت۔"

(۵) اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۲۵ رجب سنہ ۱۲۷۳ھ/ ۲۳ مارچ سنہ ۱۸۵۷ء کو تحریر فرمایا: "صحیفۂ مسرت آگین ...... مشعر رسید رقیمۂ الوداد و اینکہ صحائف مشتمل الف عبارت اردو و بعد ملاحظہ چاک شدہ باشند ...... وصول نشاط شمول گردید ...... مشفقا حسب الارقام سامی صحیفۂ موصوفہ بعد استفادۂ مضمونش چاک نمودہ شد۔ و آئندہ ہم در بارۂ ہیچ مکاتیب تعمیل ایمائی سامی ملحوظ خواہد ماند۔" اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کی یہ خط و کتابت بصیغۂ راز تھی، ورنہ ۱۵ فروری سنہ ۵۷ء کا خط بھی اردو ہی میں تھا۔ اس کے

چاک کرنے کی ہدایت کیوں نہ کی؟ اور کی تھی تو یہاں تعمیل کیوں نہ ہوئی؟ واللہ اعلم

صفحہ ۷

(۱) یہاں بھی "اس" کی جگہ "ان" ہونا چاہیے، کیونکہ غزلوں کے بھیجنے کا ذکر ہو رہا ہے، غزل کا نہیں۔ شاید لکھتے وقت میرزا صاحب کے خیال میں غزلوں کی جگہ خط آ گیا تھا۔

(۲) نواب فردوس مکاں نے اس عریضے کے جواب میں ۴ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ (۹ مئی سنہ ۱۸۵۷ء) کو تحریر فرمایا: "۔۔۔۔ مشفقا! این مرتبہ کہ توقف در تسطیر رقیمۂ الاخلاص بظہور آمدہ، باعثش آں عدم فرصتی تصور نتوان فرمود۔ حالانکہ فرصت دست داد، بہ ترقیم مافی الضمیر اتفاق افتادہ"

(۳) اصل میں "پہونچا" ہے لیکن یہ سہو قلم معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اسی سطر میں یہ لفظ میرزا صاحب نے درست لکھا ہے۔

(۴) میرزا صاحب تلفظ کے اتباع میں "مجکو" بحذف ہائے مخلوط لکھا کرتے ہیں۔ ان کے دیوانِ اردو کے اس نسخے میں بھی جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے، مجکو اور مجے تحریر ہے۔ مگر میں نے صحیح املے کو ترجیح دیتے ہوئے ہر جگہ مجھ کو بنا دیا ہے۔

(۵) میرزا صاحب کے دیوانِ اردو کا یہ نسخہ کتاب خانے میں موجود ہے۔ ناپ ۱۱½ × ۷¾ ہے، اوراق ۱۰۴ اور فی صفحہ ۱۵ سطریں ہیں۔ خط صاف اور روشن نستعلیق اور ابتدائی دو صفحے طلاکاری ہیں۔ ہر غزل کے خاتمہ پر رنگین بیل بوٹے اور تمام صفحات کی جدولیں رنگ آمیز ہیں۔ آخر میں تبرکی تقریظ ہے۔ اس نسخۂ دیوان کے متعلق میرزا صاحب نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے: "اب تم سنو۔ دیوانِ ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں، میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھکو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لیکر کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔" (اردوئے معلیٰ: ۱۰۳) بعد ازاں ۲ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء کو اس کے مکمل ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں: "میاں تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم و اکمل ہے۔ وہ اور کونسی دو چار غزلیں ہیں جو میرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں، اور اس دیوان میں نہیں؟ اس طرف سے اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں ہے۔ معہذا ان سے بھی کہوں گا، اور وہ غزلیں ان سے منگا کر دیکھوں گا۔" (ایضاً: ۲۸۳) اس نقل سے منشی شیو نرائن نے اپنے مطبع واقع شہر آگرہ میں دیوان کی طباعت کا انتظام کیا تو اس کے متعلق میرزا صاحب نے علائی کو لکھا: "اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں، اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا۔" (ایضاً: ۲۲۶) لیکن شیو نرائن نے طباعت میں تاخیر کی، تو میرزا صاحب نے آغاز سنہ ۱۲۷۸ھ (جولائی ۱۸۶۱ء) میں اسی نسخے سے مطبع احمدی، دہلی میں دیوان طبع کرا لیا۔ بعد ازاں آخر سنہ مذکور (مئی سنہ ۱۸۶۲ء میں) چند اشعار کے اضافے کے ساتھ اس کی مصحح نقل مطبع نظامی کانپور میں چھپوا کر شائع کی۔ شیو نرائن کا نسخہ سرورق کی تاریخ کے مطابق سنہ ۱۸۶۳ء میں لکھا جانا شروع ہوا، اور غالباً اسی سال میں چھپ بھی گیا۔ اگر وہ دیر نہ کرتے، تو نسخۂ رامپور کو

دیوانِ غالب مطبوعہ کی اصل بننے کا شرف حاصل ہوتا۔ تاہم دیوانِ غالب کے جس قدر ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، وہ سب کے سب، اپنی تکمیل میں نسخۂ رامپور کے رہینِ منت ہیں۔

(۲) یہاں معناً لفظ "دے" ساقط معلوم ہوتا تھا، اس لئے اضافہ کر دیا گیا ہے۔

صفحہ ۸

(۱) مرزا صاحب نے "اس" کی جگہ "یہ" لکھا ہے۔ چونکہ اسی جملے کے بعد "رامپور" کی سا ہوکار کے لئے اشارۂ بعید استعمال کیا ہے، اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس جگہ ازراہ سہو "اس" کی بجائے "یہ" لکھ دیا ہے۔

(۲) یہاں سے آگے کے الفاظ حاشیے پر ہیں، اور حوالے کے لئے (۵) کا ہندسہ متن کی عبارت کے خاتمے اور حاشیہ کی عبارت کے آغاز میں لکھا ہے۔

(۳) فردوس اسکال کے محولۂ بالا فرمان کی نقل مثل میں شامل ہے۔ اس میں سے قابلِ مطالعہ حصہ یہ ہے: "مکرر آنکہ خط مولوی وجیہ الزماں خاں صاحب مستعدین سرکار بنام منشی شہاب الدین کہ ہمراہی ہا بریلی در آنجا رفتہ اند، ملفوف ہیر سدہ براہ نوازش نزد مکتوب الیہ فرستادہ جواب طلب فرمودہ بدست قاصد روانہ رامپور باید فرمود کہ قاصد مذکور ابرسند از سرکار خواہد یافت وچوں دریں ایام شورش سبیل ترسیل مبالغ بحیز منڈوی بہم مشکوک ہست احتمال در وصول نیز متخیل، لہٰذا در صورت وصول و عدم وصولِ زر مطلع باید فرمود۔" مرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں سرکار نے ۱۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۴ھ کو ہنڈوی کا پتہ اور پہلے خط کی نقل روانہ فرما دی تھی۔

(۴) نصر اللہ بیگ خاں کے لئے دیباچہ "خاندان" بھی ملاحظہ ہو۔

(۵) مرزا صاحب نے اس لفظ کا املا ہر جگہ "لاڈ" لکھا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ "لارڈ" ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دلی والے اس لفظ کو "ڑ" اور "د" کے ساتھ بولتے تھے۔

(۶) لارڈ لیک سنہ ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۷۵۸ء میں پیدل فوج میں نام لکھا یا اور مختلف عہدوں پر فائز رہ کر سنہ ۱۷۹۰ء میں جنرل مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۸۰۵ء تک ہندوستانی افواج کے کمانڈر انچیف اور کونسل کے ممبر رہے۔ انہوں نے مرہٹوں سے جنگ کر کے ۱۸۰۳ء میں آگرہ اور ۱۸۰۵ء میں دہلی فتح کی۔ بعد فتح شاہ عالم ثانی کے حضور میں باریاب ہوئے تو بادشاہ نے "صمصام الدولہ اشجع الملک خان دوراں شاہ لیک بہادر فتح جنگ" خطاب عطا کیا۔ (تاریخ ہندوستان: ج ۳: ۲/۷) لیک نے انگلستان واپس جا کر ۲۰ فروری سنہ ۱۸۰۸ء کو انتقال کیا۔

(۷) گزیٹیر آف انڈیا (ج ۱۳: ۲۱) میں سونکھ نام کے ایک قصبہ کا ذکر ہے جو شہر متھرا سے ۱۶ میل دور بھرت پور جانے والی سڑک پر واقع اور تحصیل و ضلع متھرا میں شامل ہے سنہ ۱۸۸۱ء میں اس کی آبادی ۴۲۲۹ نفوس پر مشتمل تھی باشندے کھاتے پیتے اور صاحب حیثیت تھے، پختہ بازار اور پتھر کی پرکاری کے مکانات جگہ جگہ نظر آتے تھے پیرا در منگل کو بازار بھی لگتا تھا تھانہ اور ڈاکخانہ دونوں قصبے کے اندر تھے۔

اگر یہ وہی سونکھ ہے جس کا مرزا صاحب نے ذکر کیا ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ سونف نامی

کوئی براہر کا گاؤں تھا جو اس زمانے میں سونکھ کے نام کے ساتھ بولا جاتا تھا۔

(۸) نواب احمد بخش خاں کے لئے دیباچہ، خاندانِ نسبی ملاحظہ ہو۔

(۹) احمد بخش خاں کے جانشین سے نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والیٔ فیروزپور مراد ہیں۔ دیگر اہلِ خاندان کی طرح میرزا غالب بھی ان سے ناراض تھے، اسی لئے ان کا نام نہیں لیا ہے۔ محمد علاؤ الدین خطیب فرحت تخلص ساکن بمبئی کی ایک قلمی بیاض جامع مسجد بمبئی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ: "یکے از نوابانِ دہلی کمشنر دہلی را کشت، درعوض آں نواب را پھانسی دادند۔ کسی شاعر در تاریخ او گفتہ است۔ خوب گفت در صنعتِ منقلب: کیا چرخ نے نوابی سہراب کو اُلٹا" "نوابی سہراب" را منقلب کنند "بارہ سے باون" می شوند" میں نے کمشنر دہلی کے قاتل نواب سے، میرزا شمس الدین احمد خاں بہادر کی طرف اشارہ خیال کیا تھا۔ مگر اس صورت میں ایک عدد کی بیشی ہوتی ہے، اس لئے کہ نواب صاحب کو جمعرات کے دن ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی تھی، جو ۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۵۱ھ کے مطابق ہے۔ میرے والد کے مخلص دوست اور بچپن کے رفیق، پروفیسر فدا علی خاں ایم اے مرحوم نے اپنی قواعد اردو (نسخۂ خطیۂ مصنف، ص۱۶) میں اپنے دادا محمد مظفر خاں گرم رامپوری شاگردِ ذوقؔ (متوفی ۱۲۸۲ھ = ۱۸۶۵ء) کے متعلق لکھا ہے کہ سنہ ۱۲۵۲ھ میں مضافات دہلی کے رؤسا میں سے نواب سہراب جنگ نامی ایک رئیس کو بجرم بغاوت پھانسی دی گئی تھی۔ اس سانحۂ روح فرسا کی تاریخ ذیل کے قطعے میں جودتِ طبع نے بالکل جدید پیرائے میں یوں رقم کی ہے

بہ دستِ درازیٔ ستم کس نے بیاں ہو	بے جرم و گنہ مسندِ نواب کو اُلٹا
تاریخ مصے میں نئی طرز سے لکھو گرمؔ	کیا چرخ نے نوابیٔ سہراب کو اُلٹا

میں نے تاریخ کی کتابوں میں مضافات دہلی کے کسی اور نواب کی بغاوت اور سزا کے متعلق تلاش کی مگر ناکام رہا۔ اس صورت میں یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ گرمؔ مرحوم نے حسبِ عادتِ شعرا اس بے نظیر تاریخ میں ایک عدد کی بیشی گوارا کر لی اور پروفیسر صاحب نے نوابیٔ سہراب سے۔ نواب سہراب جنگ نام سمجھ کر بجائے نواب شمس الدین خاں کے اُن سے قطعے کو متعلق کر دیا

یہ بات اور ظاہر کرنے کی ہے کہ ہجری تاریخ کا تعین انڈیا آفس کی ایک بیاض سے ہوتا ہے، جس میں نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی کے متعلق لکھا ہے: "بتاریخ ۱۳ یوم پنجشنبہ سنہ ۱۲۵۱ھ جمادی الثانی نواب شمس الدین جنت رسید شد۔ یعنی بہ تہمتِ خونِ فریزر انگریز آن را سولی دادند کہ بردار کشیدند" (مکتوب جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو بنام عرشی) اس اقتباس سے آرزو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نواب صاحب کے معاصرین میں ایسے لوگ بھی تھے، جو انہیں بے گناہ اور بے قصور جانتے تھے

(۱۰) چونکہ "ٹ" فارسی میں نہیں ہے، اور میرزا صاحب نے اس انگریزی لفظ کو مضاف کیا تھا، اس لئے قواعد اضافت کی غلطی سے بچنے کی خاطر اسے مفرس کر لیا ہے۔

صفحہ ۹

(۱) بہادر شاہ، ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے آخری چشم و چراغ تھے۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں لال قلعہ کے بادشاہ بنے سنہ ۱۸۵۷ء میں قوم پرستوں نے پوری دلی کا بادشاہ بنایا۔ بعدِ فتح دہلی الزام بغاوت میں رنگون کو جلا وطن کیے گئے۔ اور وہیں ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء کو فوت ہوئے۔ مرزا صاحب نے ایک خط میں مجروح کو لکھا ہے: "۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن۔ ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔"

(اردوی: ۱۶۳)

(۲) مرزا صاحب کے عہد میں دلی والے اسی طرح بولتے تھے۔ اب صحیح تلفظ پنشن رواج پا گیا ہے

(۳) حکیم غلام نجف خاں کو دو شنبہ ۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۷۴ھ کو لکھتے ہیں: "میاں" حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں ابھی تک بلایا نہیں گیا، معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔"

(اردوی، طبع لاہور: ۱۴۴)

تفتہ کو تحریر کیا ہے: "میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں تو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں، اور یہاں قریب کیا دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے، اور نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا، امیر و غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے، اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔

میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی: غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی پاس آوے، شہر میں ہے کون۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر سنہ ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔" (ایضاً: ۵۹)

شنبہ ۲۳ جنوری ۱۸۵۸ء کو لکھا ہے: "بھائی میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا شہر میں

ہونا جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا؛ دار و گیر سے محفوظ ہوں کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروی کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا اور خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست نہیں کی۔ مئی سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہونگے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔" (ایضاً: ۶۰)

جمعہ ۵ مارچ سنہ ۵۸ء کو لکھا ہے: "حاکم اکبر نے آکر کوئی بندوبست بارہ نہیں کیا یہ صاحب میرے آشنائے قدیم ہیں۔ مگر میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیجا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔" (ایضاً: ۶۲)

۱ اپریل سنہ ۱۸۵۸ء میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں: "پنسن کی درخواست دے رکھی ہے، بشرطِ اجرا بھی میرا کیا گزر رہوگا؟ ہاں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قول عوام: چہ شے دلدار نہ ہوگا۔" (خطوط: ۲۲۱)

شنبہ ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو حکیم احسن اللہ خاں کے اپنے مکان میں آجانے کا تذکرہ کر کے خود اپنے متعلق تفتہ کو لکھتے ہیں: "رہا میں، نو بیکسی و غریبی، تراکری پڑی۔ نہ جزا نہ سزا، نہ نفرین نہ آفرین، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر۔" (اردوی، طبع لاہور، ۱۰)

(۴) تفتہ کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۸۵۸ء سے قبل میرزا صاحب نے تحریری راہ و رسم پیدا کرنے کی سعی شروع کر دی تھی۔" (اردوی، طبع لاہور، ۲۰۶)

(۵) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اردوی: ۵

(۶) زین العابدین خاں بہادر کے لئے وہ نوٹ ملاحظہ ہو، جو اُن کے نام کے خطوط سے قبل مندرج ہے

(۷) نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے چچا تھے۔ اپنے والد ماجد کی شکست پر رامپور چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بچپن لکھنؤ میں گزارا۔ جوان ہوکر گورنمنٹ کی ملازمت کی، اور اپنی لیاقت کی بدولت صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے۔ مرشد زادۂ آفاق میرزا محمد شاہرخ بہادر کی زوجہ اُن کی قرابت دار تھیں، اس وجہ سے لال قلعے سے بھی تعلقات تھے۔ (بہادر شاہ کا روزنامچہ: ۸۲) عرصے تک میرٹھ کے صدر الصدور رہے تھے۔ پنشن کے بعد وہیں توطن اختیار کر لیا۔ ستر برس کی عمر میں بعارضۂ تپ سنہ ۱۲۷۴ھ کو رحلت فرمائی، اور درگاہ چشتی کے پہلو ان میں مدفون ہوئے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی، میرزا غالب، مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور حکیم مومن خاں وغیرہ جیسے ذی علم اور صاحبان ذوق سے پرخلوص تعلقات تھے۔ میرزا غالب کا اُن کے نام جو خط پنج آہنگ میں چھپ چکا ہے، اُس سے باہمی تعلقات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ انتخاب یادگار (ص ۲۱) میں اُن کا یہ شعر مندرج ہے:

منحصر تجھ پر شفا دینا ہے، کھلا جائیں کہاں؛ اے شفیع عاصیاں، ہم بیزار امان چھوڑ کر

(۸) سید اصغر علی خاں مرحوم نواب سید عبداللہ خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب فردوس مکاں کے چچا زاد بھائی تھے۔ انتخاب یادگار (ص ۲۵) میں لکھا ہے: "شاعر خوش مذاق ہیں آفرینش مضامین عاشقانہ میں طاق ہیں۔ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگرد تھے۔ کلام ان کا لائق د..."

قابلِ شنید۔ ۴۰ برس کی عمر پائی۔ بارھویں رجب کو بارہ سو تہتر ہجری تھے کہ عارضہ خناق میں مبتلا ہو کر میرٹھ میں رحلت پائی، وہاں سے جنازہ اُن کا دہلی کو لایا گیا، اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔" یہی سنہ خمخانۂ جاوید (ج اص ۴۲۲) میں مندرج ہے۔ لیکن دارالانشار کی مراسلت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ۱۲۷۲ھ میں انتقال کیا تھا۔ اُن کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

(۹) نواب سید عبدالرحمٰن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب فردوس مکاں کے چچا تھے۔ جنگ دو جوڑہ کے بعد اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ بھی رامپور چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور نواب سید محمد سعید خاں بہادر کی تخت نشینی تک دہلی اور میرٹھ وغیرہ مقامات پر رہے۔ بعد ازاں نواب صاحب کے ساتھ رامپور آئے اور قدیم تنخواہ میں معقول اضافہ پا کر یہیں مقیم ہو گئے۔ ۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۷ء تاریخ انتقال اور مدفن رامپور ہے۔ (پروانہ بنام جانکی پرشاد محکومہ ۲۰ اگست ۱۸۵۷ء خلیل ۱۱۸۸)

صفحہ ۱۰

(۱) میرزا صاحب نے "بلی ما" لکھ دیا ہے، چونکہ خود انہوں نے متعدد خطوں میں اس محلے کا نام بلی ماران لکھا ہے اور آج تک ہر دہلوی وغیرہ دہلوی نے اسے بلی ماران ہی کہا اور لکھا ہے اس لئے سہو قلم یقین کرتے ہوئے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

(۲) یہ عربی کا ایک مرکب ہے جس کے معنی ہیں "اس کا"۔ کسی کی نظم و نثر کا کوئی ٹکڑا نقل کرنے کے بعد پھر اسی کی کچھ عبارت نقل کرتے ہیں تو اس کے شروع میں "لہ" لکھ دیتے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ بھی سابق الذکر ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

(۳) اگر میرزا صاحب کے تخمینے کو صحیح مانا جائے تو انھیں سنہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۰ء سے محلہ بلی ماران میں مقیم ہونا چاہیئے۔ مجروح کے نام کے خط میں سنہ ۱۸۵۰ء کی تصریح موجود ہے: اس لئے بظاہر یہی سنہ درست معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں "... یہ لکھا کہ اسد اللہ خاں پنشندار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے" (عود ۸۳؛ اردو ۱۶۲)۔ لیکن تفتہ کو ۲ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء کو لکھا ہے کہ میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں اور بلی ماران میں ایک حویلی کرایہ پر لیکر اس میں رہتا ہوں (غالب: ۱۰۴)۔ تفتہ سے اُن کی مراسلت برابر رہتی تھی۔ اس لئے انتقالِ مکان کے چند دن بعد ہی پر اطلاع دینا چاہیئے۔ میرزا صاحب نے شاہ نصیر الدین عرف کالے صاحب کے سنہ ۱۲۶۸ھ میں انتقال کے بعد اُن کا مکان چھوڑا تھا۔ (تاریخ دہلی: ۱۰۱) شاہ صاحب نے سہ شنبہ ۹ دسمبر ۱۸۵۱ء مطابق ۱۵ صفر ۱۲۶۸ھ کو انتقال کیا ہے (دہلی اردو اخبار شمارہ ۵۰ ج ۱۳ مورخہ ۱۴ دسمبر و ۲۰ صفر)۔ لہٰذا میرزا صاحب کو ۹ دسمبر سنہ ۱۸۵۱ء اور ۲ مارچ سنہ ۵۲ء کے درمیان مذکورہ مکان کی سکونت ترک کرنا چاہیئے۔

(۴) اس خط میں القاب کے ختم ہوتے ہی اُنھی سطروں سے مطالب شروع کر دیئے ہیں۔

(۵) اس چار جزو کے رسالے سے "دستنبو" مراد ہے، جیسا کہ عریضے کے آخر میں اس کے نام کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔ کتاب خانے میں یہ نسخہ اب تک محفوظ ہے اور اسی کاتب کا نوشتہ

ہے جس نے دیوان اُردو کا وہ خوش خط نسخہ نقل کیا ہے جو میرزا صاحب کی طرف سے مئی ۱۸۵۷ء کی کسی ابتدائی تاریخ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں پر میرزا صاحب نے اپنے قلم سے مشکل لفظوں کے معانی لکھے ہیں۔
کتاب خانے میں ایک مطبوعہ نسخہ بھی ہے جو سنہ ۱۸۶۵ء میں لٹریری سوسائٹی بریلی کے مطبع میں چھپا تھا۔ اس کے صفحات ۲۴، ۲۵، ۳۳، ۴۸، ۳۹، ۵۱، ۱ اور ۵۵ کے حواشی پر بھی میرزا صاحب کے قلم کے معانی درج ہیں۔

صفحہ ۱۱

(۱) یہ شاہی اعلان واقعات دارالحکومت دہلی: ۱/ ۴۸۶ میں مندرج ہے۔
(۲) دراصل میرزا صاحب حکام انگریزی کی نظر میں شاہِ ظفر کے سکّے کے لئے شعر کہہ کر دینے کے ملزم تھے خود میرزا صاحب کے متعدد خطوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ستر در بار ہر دی کو لکھتے ہیں "سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گرا پ۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ ... ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر ... نے دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس سے علاوہ وہ لوگ موجود ہیں، جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکّے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے۔ اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گیا اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔" اردوی: ۱۰۲/ عود
یوسف میرزا کو تحریر کیا ہے: "میں نے سکّہ نہیں کہا۔ اگر کہا، تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر گناہ بھی ہے، تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اسے نہ مٹا سکے؟ سبحان اللہ، گولہ انداز کا بارود بنانا، اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں" اردوی ۱)
(۳) میرزا صاحب نے لفظ سارٹیفکٹ میں پہلی "سٹا" "کوٹ" تحریر کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ سارٹیفکٹوں سے میرزا صاحب کی مراد وہ دو خط ہیں، جو قصیدے اور عرض داشت کی رسید اور ان کی وفاداری کے اعتراف میں دو گورنر جنرلوں نے انھیں بھیجے تھے۔
(۴) اصل میں القاب کے بعد اسی سطر سے مطالب شروع کر دیئے گئے ہیں۔
(۵) نواب فردوس مکاں نے عرائض مورخہ ۴ نومبر و ۱۷ نومبر کے جواب میں تحریر فرمایا: "... دو قطعہ صحیفۂ تلطف طراز، اولیں حادی حالات نہ ملنے زر پنشن آپ کے، اور دوسرا مورخہ اٹھارویں ماہ نومبر سنہ حال، متضمن نوید خیریت مزاج وہاج کے ۶ متواتر رنگ افروز چہرۂ وصول نشاط شمول کا ہوا۔ اور ادیہ مراتب مندرجہ کے مسرور اور مطلع فرمایا۔ مشفقا! جو کہ مخلص کو اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجۂ کمال ہے، اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمایئے، اور قطعۂ ہنڈوی مبلغ دو سو پچاس روپے کا واسطے مصارف خدام آپ کے ملفوف رقیمۂ الوداد ہذا کے مرسل ہے۔ قبول فرمایئے۔ مکرر آنکہ چند غزل ہمراہ بعد اصلاح مرسل ہیں۔ بعد ملاحظہ کے واپس ہوں فقط

۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۲۵ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کا عریضہ نمبر ۱ ہنڈوی کی رسید اور رامپور نہ آنے کے عذر پر مشتمل ہے۔

(۶) اصل: روپیہ۔ مرزا صاحب سے یہ سہو اور جگہوں پر بھی ہوا ہے۔ میں نے جہاں کہیں مفرد کا قرینہ نہیں پایا، وہاں بعینہٖ جمع لکھ کر حواشی میں بار بار حوالہ دینا مناسب نہیں جانا۔ اہلِ تحقیق پہلے ایڈیشنوں سے مقابلہ کر کے اُن تمام مقامات کا تعین کر سکتے ہیں۔

(۷) یہاں مرزا صاحب نے ۱۲ کا ہندسہ لکھا ہے، جو لفظ صد کا عدد ہے اور فل اسٹاپ کی جگہ مستعمل تھا۔ اس کے استعمال کی جو توجیہ انھوں نے کی ہے، وہ بحث املا، علامات اوقاف میں درج ہے۔ آج کل متروک ہونے کی وجہ سے یہاں اور دوسرے مقامات پر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۲

(۱) نواب فردوس مکاں کے مسودۂ فرمان میں یہ مضمون تحریر نہیں۔ ممکن ہے کہ مبیضے میں اپنے قلم سے اضافہ کر دیا ہو یا کوئی اور تحریر اس کے علاوہ بھیجی گئی ہو۔

(۲) نواب مرزا خاں داغ تخلص خلف نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والی فیروز پور جھرکہ مراد ہیں۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں اپنی پھوپھی عمدہ خانم کے توسط سے ابتداءً حضور و انعام و عطایا اور بعد ازاں ملازم سرکار ہوئے۔ نواب خلد آشیاں کے عہد میں سو روپے ماہوار پر اصطبل اور فراش خانے کے داروغہ بنائے گئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد رامپور کی بزمِ علم و ادب منتشر ہوئی تو حیدرآباد جا کر حضورِ نظام مرحوم کے استاد مقرر ہوئے اور وہیں سنہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں انتقال کیا۔ مرزا داغ کو شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلوی سے کلام پر اصلاح لی تھی، اور رامپور میں شعرائے دہلی کے نمائندے شمار ہوتے تھے۔

(۳) اس بزم آرائی کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ بعید نہیں کہ آتشِ فتنہ و فساد کے سرد پڑ جانے کی خوشی منائی گئی ہو۔

(۴) آمدہ کی جگہ آمد کا استعمال سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے۔

(۵) جناب عالیہ، نواب فردوس مکاں کی والدہ محترمہ فتح النسا بیگم کا لقب تھا، جو نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کے بھائی محمد نور خاں ولد محمد شاہ خاں بڑیچ کی صاحبزادی تھیں (گلشن فتوت، قلمی؛ ذکر نواب فردوس مکاں؛ اخبار الصنادید: ۲/ ۱۷۳)

(۶) دیکھو حاشیہ ۹ صفحہ ۸

صفحہ ۱۳

(۱) یہ عریضہ ۱۷ فروری سنہ ۱۸۵۹ء سے قبل لکھا گیا ہوگا، کیونکہ اس تاریخ کے فرمان میں سرکار نے لکھا ہے: "ملاطفہ صحیفہ آپ کا حاوی ...... نہ ہونے حکم نسبت مقدمۂ پنشن کے پیشگاہ حکام سے ...... علیٰ انتظار میں سرمہ کشِ عیون و وصول فرحت شمول کا ہوا۔"

(۲) یہاں مرزا صاحب نے روانا الف کے ساتھ لکھا ہے۔ چونکہ مکتوب نمبر ۵ وغیرہ میں انھوں نے روانہ لکھا ہے، اور صحیح بھی یہی ہے، اس لیے ہر جگہ ہ کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔

(۳) لفافے پر ۱۷ اپریل ۱۸۵۹ء تحریر ہے۔

(۴) نواب فردوس مکاں کا محولۂ بالا خط حسبِ ذیل ہے: "۔ ۔ ۔ حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا، اور دلِ صفا منزل مشتاق اور منتظر دریافتِ سرورِ ملاقات کا ہے۔ اس واسطے حوالۂ خامۂ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ آپ براہِ عنایت کے تو بد تشریف فرمائی اس وقت سے، کہ کب تک ممکن الوقوع ہے، مطلع اور مطمئن فرمایئے۔ ۔ ۔ ۔

۹ رمضان سنہ ۱۲۷۵ھ/۱۳ اپریل سنہ ۱۸۵۹ء"

(۵) لارڈ کیننگ بہادر سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل اور سنہ ۱۸۵۸ء میں پہلے وائسرائے بنائے گئے۔ غدر انہیں کے عہدِ حکومت میں رونما ہوا۔ حکومت اودھ کی مکمل ضبطی بھی اسی عہد کا واقعہ ہے۔ مارچ سنہ ۱۸۶۲ء میں انگلستان واپس گئے، اور ۱۷ جون سنہ ۱۸۶۲ء کو وہیں فوت ہوئے۔ اپنے عزم، استقلال، تدبر، اور خوبیٔ انتظام کی بدولت انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

صفحہ ۱۴

(۱) اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا: "سابق اس سے دو قطعہ "تلطف صحیفہ ملاطفت افزا آپ کے، اول مشعر مراتبِ تعزیتِ رحلت جنابِ والدہ صاحبہ مغفورہ کے اس جہانِ فانی سے، اور دوسرا بانتظارِ جواب اور قطعۂ تاریخ رحلت جناب ممدوحہ کے متواتر وصول ہوئے۔ ۔ ۔ سبحان اللہ! کیا عمدہ تاریخ آپ نے تصنیف فرمائی ہے کہ الفاظ جامع مختصر ہیں اور تعمیہ بطرزِ نادر اور بے تکلف ہے"

صفحہ ۱۵

(۱) فردوس مکاں کے ۲۹ صفر سنہ ۱۲۷۶ھ (۸ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ء) کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے ان کے سفرِ انگلستان کے متعلق استفسار کیا تھا۔ نواب صاحب نے جواب میں لکھا: "مشفقا، جو آپ نے نسبت عزیمت مخلص کے سمت انگلستان استفسار فرمایا ہے، حال یہ ہے کہ فی الحقیقت ارادہ مخلص کا جانے انگلستان کو مصمم ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی زمانہ جانے کا مقرر نہیں ہوا ہے۔ اس واسطے حوالۂ خامۂ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ جس وقت زمانہ جانے ولایت کا قرار پا دیگا، آپ کو پیشتر سے اس خصوص میں اطلاع دہی عمل میں آویگی"۔ میرزا صاحب کا چودھواں عریضہ اسی فرمان کا جواب ہے۔ نواب صاحب کا یہ سفر ملکۂ وکٹوریہ سے صلۂ خدماتِ غدر پانے کے سلسلہ میں ہونے والا تھا، جو اس وجہ سے ملتوی ہو گیا کہ گورنمنٹ نے خود گورنر جنرل کے ہاتھوں خلعت وغیرہ دینا مناسب خیال کیا، چنانچہ فتح گڑھ میں یہ دربار منعقد ہوا، جس میں فردوس مکاں بھی شریک ہوئے۔ دربار کی تفصیل عریضۂ ۱۷ کے حاشیے میں ملاحظہ ہو۔

(۲) میرزا صاحب کے اس عریضے کا آخری حصہ پھٹ گیا ہے۔ اس لئے لفافے سے تاریخ نقل کی جاتی ہے۔

(۳) لمبر وہی انگریزی لفظ نمبر ہے۔ پرانے لوگ نون کی جگہ لام بولتے تھے۔ میرزا صاحب بھی انھیں میں سے ہیں، چنانچہ آپ نے شاہزادہ بیدار بخت کے سہرے میں بھی لکھا ہے کہ:
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا۔

(۴) سات پارچوں کی تفصیل عریضہ نمبر ۸ میں ملاحظہ ہو۔ جیغہ، جوترکی لفظ ہے، ایک مرصع زیور کا نام ہے جسے پگڑی پر باندھتے ہیں۔ یہ مخمل کی ۷ انچ لانبی اور ۲ انچ چوڑی پٹی ہوتی ہے اس پر زردوزی کا نہایت عمدہ کام بنا ہوتا ہے اور سونے کی ایک پتر، جس پر جواہر جڑے ہوتے ہیں اس پر بھی ہوتی ہے۔ سرپیچ (جسے سرپیش بھی کہتے ہیں) سونے، چاندی یا ہیرے موتی کا ایک زیور ہوتا ہے، جسے پگڑی میں سامنے کے رخ پر باندھتے ہیں
بعض اوقات اس میں سونے کی چوکور پتریں ہوتی ہیں، جو آپس میں بندھی ہوتی ہیں، اور ہر ایک میں قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔

(۵) لارڈ ہارڈنگ صاحب ہندوستان کے گورنر جنرل تھے سنہ ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے جولائی سنہ ۱۸۴۴ء سے جنوری سنہ ۱۸۴۸ء تک گورنر جنرل اور سنہ ۱۸۵۲ء سے سنہ ۱۸۵۴ء تک کمانڈر انچیف رہے کر اسی سال کے ستمبر میں فوت ہو گئے۔ سکھوں کی لڑائی میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انتظام مملکت میں مفید اصلاحات نافذ کیں۔ جگہ جگہ اسکول قائم کئے۔ ریلوے اور پیمائش کے محکموں میں اضافہ کیا، اور اتوار کی عام تعطیل مقرر کی۔ ان کے جلسے دربار میں میرزا صاحب نے خلعت ہفت پارچہ اور تین رقمیں جواہر کی پائی تھیں، (احسن الاخبار بمبئی مورخہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء شمارہ ۱۵ جلد ۲) اور بہادر شاہ کے روزنامچہ (ص ۳۸) کے مطابق ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۴۵ء کو دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ ان دونوں حوالوں میں شرکا کی فہرست بھی شائع ہوئی ہے اگر اس کے اعداد ترتیب کو ظاہر کرتے ہیں، تو میرزا صاحب کا نمبر پندرھواں ہونے کے سبب ان کا یہ بیان محل نظر رہے گا کہ "دائیں صف میں دسواں نمبر مقرر ہے"۔

(۶) لارڈ ڈلہوزی سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۸۴۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر کئے گئے، اور ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۴۸ء کو اس عہدے کا جائزہ لیا۔ انہوں نے سکھوں کو زیر کر کے سنہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق کیا۔ ریل کے محکمے میں نئے ضابطے نافذ کئے اور صوبوں کے درمیان تار برقی کا سلسلہ قائم کیا۔ شاہی ڈاکخانے کا نظم بھی انہیں کا رہین منت ہے۔ محکمہ امور عامہ، جیل، جنگلات، پیمائش، اور محکمہ تعلیمات قائم کیا۔ مجلس قانون ساز کا از سر نو انتظام کر کے اسے وسعت دی۔ برما پر حملہ کیا، اور خان قلات اور امیر افغانستان سے معاہدے مرتب کئے۔ صوبہ برار فوجی مصارف کے لئے حاصل کیا۔ ان کے ہاتھوں بہت سی دیسی ریاستوں کا خاتمہ ہوا ہے۔ حادثہ غدر کی ذمہ داری بھی انہیں کے کاندھوں پر رکھی جاتی ہے۔ ان کے سوانح کا خلاصہ فتح، استحکام اور ترقی ہے۔ ڈلہوزی لندن واپس جا کر سنہ ۱۸۶۰ء میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔ میرزا صاحب کا یہ کہنا سہو پر مبنی ہے کہ لارڈ ڈلہوزی یہاں نہیں آئے وجہ یہ ہے کہ اخبار فوائد الناظرین (شمارہ ۲۲، ۲) مورخہ ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۸۴۸ء میں پہلے یہ اطلاع شائع ہوئی کہ لارڈ ڈلہوزی ۱۲ ویں نومبر کو دہلی آئیں گے۔ بعد ازاں ۲۳ نومبر کے پرچے میں (جس کا شمارہ مسلسل ۱۴۴ ہے) اخبار دہلی کے ماتحت لکھا گیا کہ "کل کے دن ۲۱ ویں تاریخ ماہ نومبر کو گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی صاحب بکمال اقبال، تقریباً ۱۱ بجے کے دہلی داخل ہوئے اور سلامی ہوئی"

اور کوٹھی سر ٹامس مٹکاف صاحب بہادر میں اترے۔ خبر ہے کہ لارڈ صاحب موصوف ۲۲ ویں تاریخ ماہ حال کو، یعنی آج دن شام کے دہلی سے روانہ ہوں گے۔" اس شہادت کے بعد صرف دہلی میں دربار کا انعقاد زیر بحث آسکتا ہے۔ بظاہر یہ واقعہ ہے کہ ڈلہوزی نے دہلی میں دربار نہیں کیا ورنہ اس کی اطلاع کبھی اخباروں میں شائع ہوتی۔ اور جب انہوں نے دربار نہیں کیا، تو ان کی آمد ایک معمولی واقعہ رہ گئی جسے یاد رکھنے کی مرزا صاحب کو کیا ضرورت تھی۔ اسی سبب سے انہیں یہ خیال گزرا کہ لارڈ ڈلہوزی دہلی نہیں آئے۔

(۷) لارڈ کیننگ بہادر وائسرائے مراد ہیں۔

(۸) سکرتر، انگریزی لفظ سکریٹری کا مورد ہے۔ آگے چل کر بول چال میں پہلی "ر" بھی "ت" میں تبدیل ہو گئی اور لوگ "سکتر" کہنے لگے۔

(۹) ایڈ منسٹن صاحب ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں اضلاع شمال و مغرب میں تقرر ہوا۔ ستلج کی فتح کے بعد وہاں کی ریاستوں کے کمشنر بنا دئے گئے۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں پنجاب کے کمشنر مالیات ہو گئے۔ سنہ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۷ء تک حکومت ہند کے فارن سکریٹری اور جنوری سنہ ۱۸۵۹ء سے فروری سنہ ۱۸۶۳ء تک ممالک مغربی و شمالی کے گورنر رہے۔ انھوں نے ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ء کو انتقال کیا۔

صفحہ ۱۶

(۱) یہ فارسی کے محاورۂ "برہم زدن" کا ترجمہ ہے

(۲) عرفی کا نام جمال الدین محمد اور وطن شیراز ہے۔ ہندوستان آکر حکیم ابو الفتح شیرازی اور عبدالرحیم خان خاناں سے وابستہ رہا۔ خانخاناں نے دربار اکبری میں تقریب کرکے شاہزادہ سلیم کا اتالیق مقرر کرا دیا۔ ۹۹۹ء میں خانخاناں کے ساتھ مہم سندھ پر روانہ ہوا تھا کہ شوال میں بمقام لاہور ۳۶ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کے کلام میں شوکت اور جوش بہت ہے۔

(۳) نواب فرید دس سکال نے جواباً تحریر فرمایا: "مشفقا! بہنگام ملاقات کے اکثر بعضے صاحبان بہادر ذیشان سے تذکار محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدردانی سرکار دولتمدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج منزلت آپ کے قدیم سے ہیں، پیشگاہ گورنمنٹ بہادر سے بھی اسی کے مطابق ظہور میں آوے گا، کس واسطے کہ اہالی سرکار ابد قرار قدردان و قدر شناس ہیں۔"

(۴) کورٹ آف ڈائرکٹرز مراد ہے۔ سنہ ۱۷۰۸ء میں بمقام انگلینڈ ایک کچہری مالکوں کی واسطے نگرانی کاروبار ہندوستان کے مقرر ہوئی۔ لقب اس کا کورٹ آف پروپرائٹرس مقرر ہوا اس لئے کہ ہندی کچہری کے کاروبار کے لئے اچھے شخص منتخب کریں اور ترکیب اور ترتیب قوانین کی کریں۔ دوسری ایک کچہری ایسی مقرر ہوئی جو ہند کے جملہ کاروبار کے واسطے رہنمائی کرتی تھی۔ اصل میں ۲۴ آدمی تھے ان کا لقب کورٹ آف ڈائرکٹرز ہوا۔ اس زمانے تک بادشاہ انگلستان کو کاروبار ہند میں مداخلت نہ تھی۔ صاحبان کمپنی مطابق حکم اور حقوق مندرجہ فرمان بادشاہی کے کام کرنے لگے۔ "تاریخ سلطنت انگلشیہ: ۵۰، مطبع خورشید ہند مراد آباد ۱۸۶۷ء" کمپنی کی جماعت میں بہت لوگ ہیں۔ لیکن ان ہی ۲۴ ناظم مناظم امورات ہیں۔ ان کی منظوری کے بدون کسی امر اہم کی تجویز قطعی نہیں ہوتی، اور انہیں کو کورٹ آف ڈائرکٹرز بولتے ہیں۔ سب حکام انھیں کے

حضور سے مقرر ہوتے ہیں۔ مگر گورنر یعنی مدار المہام اور کمانڈر انچیف یعنی سپہ سالار کے نصب کرنے میں پسند و منظوری تخت نشین سلطنت کی لازم ہے۔" (تاریخ ہند، سدا سکھ لال ۱۰۹، مطبع نور الابصار ۱۸۵۷ء) یکم نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کے ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے اعلان کے ذریعے گورنر جنرل کو وائسرائے یعنی نائب سلطنت کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ اور کمپنی سے عنانِ حکومت لے کر براہ راست تاج برطانیہ سے ملکیتِ ہندوستان کا تعلق کر دیا گیا۔ چنانچہ لارڈ کیننگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے آخر گورنر جنرل اور ملکہ کے اول وائسرائے تھے (تاریخ سلطنتِ انگلشیہ؛ ذکاء اللہ، ج ۳، ۲۱۱)

(۵) نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں مراد ہیں۔

(۶) میرزا صاحب نے اس عریضے میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ اخبار الصنادید (۲) ۹۷-۱۱۰ کے مطابق حسب ذیل ہے۔

"لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل نے ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۵۵ء مطابق ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ھ کو مقام فتح گڑھ میں ایک عالیشان دربار منعقد فرمایا۔ ۔ ۔ ۔ اس دربار میں بہت سے دیسی رؤسا اور بہت سے یورپین معزز حکام خصوصاً کمانڈر انچیف صاحب شریک تھے ۔ ۔ ۔ دربار عام میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں سے مخاطب ہو کر کہا: "مجھکو بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ اُن خدمات کے عوض جو آپ نے ملکۂ معظمہ کی کیں، آج آپ کا شکریہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ آپ اپنی ذاتِ خاص سے زمانۂ غدر میں نہایت مستعد اور صادق رہے، اور آپ نے باوجود خوفِ جان ریاست کے گرد و نواح میں نہایت مشقت اور مستعدی سے حکومت برقرار رکھی، اور ملکہ معظمہ کے افسروں کی مدد بقدر امکان بخوبی کی۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ آپ نے ایک مجمع کثیر ہم قوم ملکۂ معظمہ کی جانیں بچائیں۔ اُن کو سب آفتوں سے محفوظ رکھا، اور اُن کو ہر طرح کی آرائش دی؛ حالانکہ وہ زمانہ چاروں طرف خوف سے گھرا ہوا تھا۔ میں بڑی خوشی سے روبرو سپہ سالار افواج ہند ملکہ معظمہ اور بہت سے معزز افسر اور حاکمانِ ملکی کے، جو گرد و نواح اور دیگر مقامات ہندوستان میں عہدہ ہائے جلیلہ پر منصوب ہیں۔ آپ کے حسن خدمات کا اقرار کرتا ہوں۔ مجھکو یقین ہے کہ آپ کی کارگزاریوں کو لوگ ہرگز نہ بھولیں گے۔"

اس دربار میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں کو تین ہزار روپے کا خلعت عطا کیا۔ اور سلامی کے فیر گیارہ کے بجائے تیرہ مقرر ہوئے۔ علاوہ اس کے فرزند دلپذیر کا خطاب عنایت ہوا۔ القاب و آداب ان الفاظ کے ساتھ قرار پایا:

"نواب صاحب مشفق بسیار مہربان کرم فرمای مخلصان سلامت۔"

بعد ازاں ۲۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل بہادر کے سکریٹری نے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کے سکریٹری کے نام حسب ارشاد گورنر جنرل بہادر ایک خط لکھا۔ اس خط کی دفعہ ۲ میں تحریر تھا، "گورنر جنرل نے ۔ ۔ ۔ ۔ نواب صاحب کو مطلع کیا کہ اُن کی مستحکم وفاداری اور اعلیٰ درجے کی امداد کے سبب، جو انھوں نے گورنمنٹ کو دی ہے، اُن کو پرگنہ کاشی پور

ضلع مرادآباد، جس کی جمع ایک لاکھ چار ہزار چار سو روپے سالانہ ہے، معافی میں بخشا ہے، جس کو وہ اور اُن کے وارث اپنی جاگیر کے ایک ٹکڑے کے طور پر اپنے قبضے میں رکھیں۔"

بعد ازاں ضلع بریلی کے شمال سے جنوب کی جانب ایک پتلی دھجی کی طرح کا لمبا علاقہ، جو ۱۴۶ مواضعات جمعی ایک لاکھ ۲۸ ہزار ۵ سو روپے ۴ آنے پر مشتمل ہے، ۲۳ جون ۱۸۶۰ء کے مورخہ عہدنامے کی رو سے ہمیشہ کے لئے عطا ہوا (عہدنامجات: ۲/۱۰۰)

اس عطیے کی تہنیت میں میرزا صاحب نے نواب فردوس مکاں کو لکھا

ای آنکہ خود بمہر ہی پرورِ ری مرا — از غیب، مزدِ کار بہ نواجر عظیم باد
رای تو در زمانہ، بامضای کارہا — با اہتمام سہم سعادت سہیم باد
در صبح دولت تو، زگلہای رنگ رنگ — دائم مشام دہر رہینِ شمیم باد
آں دم کہ مردہ را باثر زندہ ساختی — در باغ طالع تو بجای شمیم باد
مانند آب، گر، بہ ہمت بہر ربیع گرد — ہر قطرہ زاں، نمونہ درِ یتیم باد
ہر صیغہ کہ وضع وی از بہر امر نیست — فارغ ز ننگ زحمت تقدیم میم باد
گر بہر خویش نیز دعائی کنم چہ باک! — این نغمہ ہم گزیدۂ طبع سلیم باد
آزادہ ام، خلوص و نا شیوۂ من ست — راہم درای مسلک امید و بیم باد
چوں رہروی کہ بر نمط جادہ رو رود — پیوستہ سیر من بخطِ مستقیم باد
مانند فکرِ من، رخ بختِ تو دلفروز — مانندِ کلکِ من، دل دشمن دونیم باد
پابستہ زمان و مکاں نیست در مند — گر خود درود بکعبہ برین در مقیم باد
شادم بگنج امن و نگویم کہ بندہ را — خشتی ز زر خالص و خشتی ز سیم باد
مقصود از لباس ہماں پوشش تن است — پوشش گر از حریر نباشد، گلیم باد
بالجملہ این سہ بیت کہ سرچشمی فکر نست — درخور در لطفِ خاص و عطای عمیم باد
نواب مہر فرِ منوچہر چہر را — حاصل کلام یوسف و قرب کلیم باد
چوں غنچہ کز پہلوی گل بشگفد بباغ — ملکِ جدید، شاملِ ملکِ قدیم باد
ہر دم ترا بخلوتِ راز و بزم انس — روح الامین مصاحب و غالب ندیم باد

(کلیاتِ غالب فارسی: ۲/۲۲)

اس قطعے کی تاریخ نظم کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن ۲۲ نومبر کے مکتوب میں اس کا مذکور نہ ہونے کے باعث خیال ہے کہ اس تاریخ کے بعد لکھا گیا، اور اسی مہینے کی کسی آخری تاریخ کو یا ماہ دسمبر کے شروع میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال ہوا۔ نواب صاحب کی تاریخ روانگی و آمد صاحب اخبار الصناد ید نے ذکر نہیں کی۔ خود نواب صاحب نے ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۷۶ھ (۸ نومبر سنہ ۵۹ء) کو لکھا ہے: "یہ مخلص بتاریخ ۱۲ اس مہینے کے طرف فرخ آباد کے روانہ ہوگا اور بتاریخ ۱۸ اس مہینے کے معاودت کرکے رامپور پہنچے گا۔"
(مثل نمبر ۶۷) بعد ازاں ۲۵ ربیع الثانی مطابق ۲۲ نومبر کو تحریر فرمایا ہے کہ "بتاریخ ۱۷ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء مخلص بخیریت تمام فائز اینجا گردید" (مثل نمبر ۶۸)

صفحہ ۱۷

(۱) میرزا صاحب نے اس لفظ کو سہواً "گھوں" لکھ دیا ہے۔

(۲) یہاں میرزا صاحب کو اصولاً "روپے" بصیغۂ جمع لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن محاورے میں کبھی "دو ہزار روپیہ آیا" بصیغۂ واحد بھی بولتے ہیں اسی سبب سے میں نے یہاں محسوب نہ ہوا، اور مرحمت ہو، کے پیش نظر "روپیہ" مفرد ہی رہنے دیا ہے۔

(۳) اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ (۱۴ دسمبر ۱۸۵۹ء) کو تحریر فرمایا: "مشفقا! بپاس ارقام سامی کے کہ مخلص کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے محبت اور موانست قلبی ہے، ہنڈوی مبلغ دو سو روپے کی سوائے مشاہرہ معینہ معطوف رقیمۂ الوداد ہذا کے مرسل ہے، اور چشمداشت آپ کی لطف فرمائی سے یہ ہے کہ رسید ہنڈوی مذکور سے مطلع اور مطمئن فرمائیں۔ اور سابق میں چند مرتبہ در باب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں۔ لیکن اب تک آپ نے سرور ملاقات بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔ اب لازم اشفاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی فرماویں اور مخلص کو مشکور الطاف کا کریں۔"
اس ارشاد کی تعمیل میں میرزا صاحب صبح پنجشنبہ ۱۹ جنوری سنہ ۶۰ء کو دلی سے روانہ ہو کر جمعے کے دن ۲۷ جنوری کو وارد رامپور ہوئے۔ سفر کی تفصیل کے لیے دیباچہ ملاحظہ ہو۔

(۴) لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے دوران قیام رامپور میں یہ عریضہ لکھ کر فتح محمد خاں صاحب کے توسط سے کیمپ میں پیش کیا تھا۔ مقام کا نام لفافے پر درج نہیں لیکن جوابی فرمان کے مسودے میں "از مقام کھرپا" درج ہے۔ جو تحصیل مسوار کا ایک

صفحہ ۱۸

(۱) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اپنے بھائی میرزا یوسف خاں کی پنشن کے اجرا کی کوشش کی۔ یوسف خاں ایام غدر میں بڑی بےکسی اور تنہائی کی حالت میں فوت ہوئے تھے اور میرزا صاحب ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شرکت نہ کر سکے تھے۔ امن قائم ہو جانے پر میرزا صاحب نے ان کی پنشن کے لئے کس طرح سلسلہ جنبانی کی اور آیا اپنی بیوہ بھاوج اور بھتیجی کے لیے یہ سعی تھی یا اپنے لیے، اس کا حال معلوم نہ ہو سکا، اس لیے کہ آئندہ کسی خط میں میرزا صاحب نے ان کی پنشن کے متعلق نہیں لکھا۔

(۲) اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۲۸ رمضان سنہ ۱۲۷۶ھ (۱۴ اپریل سنہ ۱۸۶۰ء) کو القاب و آداب کے بعد تحریر فرمایا: "مشفقا! جب کوئی مسرت پیش آنے والی ہوتی ہے تو آغاز ہی سے مقدمات سرور پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے سامان نظر آتے ہیں کہ بے اختیار دل کو انبساط، طبیعت کو نشاط ہو۔ حسن اتفاق دیکھیے کہ ۱۹ تاریخ اپریل سنہ حال پہلے تو ایک لاکھ بیس ہزار یا ۲۸ ہزار ہی کی جاگیر پر دخلدہی کا خریطہ آیا۔ میں اسے پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کا نامہ ۔۔۔ در افزا آیا۔ اس سے آپ کی پنشن کی بحالی کا مژدہ پایا

نشۂ سرور دوبالا ہو گیا اور اس قدر بالیدگی اور خوشی حاصل ہوئی کہ زینہار بیان اس کا مجال زبان و قلم نہیں۔ بار خدایا مبارک ہو: سپاس منعم حقیقی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت میں بلا نقصان تنخواہ کا جاری ہونا محض شانِ قدرتِ باری ہے۔ شکر اس کے احسانات کا کہاں تک ادا کیجیے! عجب قدرت نمائی فرمائی ہے۔ دل کو طرفہ مسرت ہاتھ آئی ہے" تفتہ کے نام کے ۴ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کو زرِ پنشن وصول کیا گیا (اردوی: ۹۰) وصول شدہ رقم دو ہزار دو سو پچاس روپے کے خرچ کی پوری تفصیل کے لئے (اردوی: ۱۸۳) خط بنام مجروح ملاحظہ ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب میرزا صاحب کے خط میں ماہ اپریل کی ۲۲ تاریخ درج ہے، تو اس صورت میں سرکار کا ۱۹ تاریخ کا خط اس کا جواب کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ میرزا صاحب کی تاریخ میں سہو ہوا ہے۔ دراصل انھوں نے ۱۲ تاریخ کو خط لکھا ہوگا جس کا ۲۲ بنجانا بہت آسان ہے۔ چونکہ مثل میں اور کوئی خط ایسا نہیں ہے، جس میں پوری پنشن کی بحالی کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ اس لیے مذکورہ قیاس کو مزید تقویت بہم پہنچتی ہے۔

(۳) اصل خط میں "بریلی کے ملک" ہے۔ حالانکہ "بریلی کا ملک" یا "بریلی کے ملک کے ملنے کی" ہونا چاہیے۔ چونکہ خط میرزا کے قلم کا نہیں ہے، اس لئے میں نے سہو ناقل پر محمول کر کے اصلاح کر دی ہے۔

(۴) یہ خط جو بعد میں خرید ا گیا ہے، اصل مکتوب کی بغیر تاریخ کی نقل ہے، اس لئے تاریخ تحریر کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ البتہ اس میں بریلی کا علاقہ ملنے کا ذکر ہے، جو اپریل سنہ ۶۰ء میں فردوس مکان کو ملا تھا، اس لئے قیاس یہ ہے کہ سرکار کے مکتوب مورخہ ۱۲ اپریل سنہ ۶۰ء کے جواب میں میرزا صاحب نے اپریل یا مئی سنہ ۶۰ء کی کسی تاریخ کو لکھا ہوگا۔ سنہ ۶۵ میں میرزا صاحب نے بریلی کا علاقہ ملنے کی مبارکباد جس بنا پر دی تھی اس کے بارے میں ابھی تک یقینی علم حاصل نہیں ہو سکا۔ لہٰذا میرا یہ خیال ہے کہ میرزا صاحب نے دہلی میں یہ افواہ سنی اور اسے باور کر کے قصیدے میں ذکر کر دیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ کاشی پور کا علاقہ ملا ہے، جس سے میرزا صاحب کے علم کی تغلیط ہو گئی آخر میں بریلی ہی کے علاقہ میں سے گاؤں دیئے گئے۔ اس کی اطلاع پا کر میرزا صاحب نے یہ خط لکھا اور اپنی پچھلی اطلاع کی صداقت کھل جانے پر اپنے آپ کو لسان الغیب کا خطاب دیا۔

صفحہ ۳۰

(۱) کلیات غالب: ۳۳۷ - ۳۳۰ میں یہ قصیدہ چھپ چکا ہے۔

(۲) ۲۷ محرم سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۶ جولائی سنہ ۶۰ء) کو سرکار نے تحریر فرمایا ہے کہ میر منشی کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ آئندہ سے آپ کے حسب ایما ہنڈوی روانہ کی جایا کرے (مثل نمبر ۱، صیغہ احباب عہد فردوس مکان)

(۳) عریضہ نمبر ۲۲ تا ۲۶ میں خلاف معمول لفظ "حضرت" ساقط ہے۔

(۴) میرزا صاحب کا یہ نسخہ کلیات فارسی حسب التصریح فرمان مورخہ ۱۸ رمضان سنہ ۱۲۷۷ھ (۳۰ مارچ سنہ ۶۱ء) ڈاک کے ذریعہ حضور میں پیش ہوا۔ نواب صاحب نے اس کو مذکورہ

فرمان میں آئینۂ جہاں نما بل مخزن نکات مسرت افزا" اور فرمان مورخہ ۲۱ رمضان و ۱۷ اپریل میں "ایک دریائے مواج ہے مملو نثر اراں لآلی معنی سے" تحریر کیا ہے - یہ نسخہ کتب خانۂ سرکاری میں محفوظ ہے - خط نہایت صاف کاغذ نیلا اور متعدد مقامات پر میرزا صاحب کی تحریر سے مزین ہے اس کے کاتب کے بارے میں میرزا صاحب نے نواب ضیاء الدین خاں بہادر کو لکھا تھا: "آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا - بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں. پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ یہ خفقان ہے. کتاب کیوں تلف ہوگی؟ اچھا! اگر ایسا ہوا، اور دلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بسبیل ڈاک، رامپور رہا دوں گا، اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا" (اردوی: ۲۸۹)

صفحہ ۲۱

(۱) تورہ، مختلف اقسام کے لذیذ کھانے جو کم از کم ۱۱ اور زیادہ سے زیادہ ... لگا کر بڑے تکلف کے ساتھ تقریبات میں تقسیم ہوتے ہیں. نور اللغات: ۲، ۴۴۲

(۲) اس عریضے میں نواب فردوس مکان کے منجھلے صاحبزادے سید حیدر علی خاں بہادر کی شادی کا حوالہ ہے - یہ شادی نواب سید احمد علی خاں بہادر ابن نواب سید محمد علی خاں بہادر ابن نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کی نواسی کے ساتھ ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۷ جون سنہ ۱۸۶۱ء) کو قرار پائی تھی - مہینوں سے تیاریاں ہو رہی تھیں، ملازمان ریاست کو خلعت اور عام باشندگان شہر کو کھانا تقسیم ہوا تھا - سارے شہر میں جابجا رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کی گئی تھیں. ریاست کے بیرونی متوسلین اور احباب کے نام دعوت نامے جاری ہوئے تھے - میرزا صاحب نے علائی کو ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کو لکھا ہے "والی رامپور نے بھی تو مرزا دے کی شادی میں بلایا تھا - یہی لکھا گیا کہ میں معدوم محض ہو گیا ہوں - تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے - اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو" (اردوی: ۴: ۳۴ و ۳۰۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگر ضعف پیری سفر سے مانع رہا

میرزا صاحب نے آگے پیچھے ایک تہنیت نامہ اور دو قطعات مبارکباد نواب کی خدمت میں روانہ کیے. قطعات مثل میں تو نہیں ہیں. لیکن کلیات فارسی (نولکشوری ایڈیشن: ۱۳۱) میں شائع ہو چکے ہیں. فرماتے ہیں -

دیده ور یوسف علی خان از فروغ رای او — مهر تابان بر در قسط ... یافتم
از دلبندش سخن رانم که چون ماه مهر — طلعتش را دیده روشن ساز عالم یافتم
وان دگر فرزانه فرزند فرهمندش کیست — کوکب کش در دل افروزی مسلم یافتم
خواست تا سازد آیین ... — شادکشتم چون خبر زین جشن اعظم یافتم
بهره بردم در تصور زان همایون انجمن — لیکه در خود طاقت رنج سفر کم یافتم
بزم طوی فرخ حیدر علی خان را بدهر — خوشتر و خرم تر از بزم ... وجم یافتم

سال ایں دولت تر ا شادی با معانی نظر — "مشتری" با "زہرہ" در "طالع" فراہم یافتم

اس قطعے میں مصرع آخر کے الفاظ (زہرہ، مشتری، طالع) سے سال جشن کے اعداد ۱۲۷۷ نکلتے ہیں نواب فردوس مکاں کے فرمان مورخہ ۵ رمضان سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۷ مارچ ۱۸۶۱ء) میں اس کا ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے آغاز مارچ سنہ ۶۱ء میں لکھ کر یہاں بھیجا تھا

دوسرا قطعہ برسات میں بھیجا گیا تھا اس میں فرماتے ہیں

بہار ہند کہ نامند برشکال آں را — پس از دو سال بر اہل جہاں مبارکباد
بیا غ دشگفت و بیابان دکوہ، سر تا سر — سحاب و سبزہ و آب روان مبارکباد
گزشت عہد سموم و وزید باد خنک — زجان بہ تن، دگر از تن بجان مبارکباد
اگر چہ رحمت عامست، لیک با تخصیص — برامپور کراں تا کراں مبارکباد
زبرگ برگ نیستاں کہ گرد آں شہر است — رسد بگوش چناں کز زبان مبارکباد
ز انبساط ہوا ست آں چناں کہ از رگ ابر — بجای قطرہ تراود ہمال مبارکباد

سپس بداد گر آیم کہ اہل دانش را — شود ہر آئینہ خاطرنشاں مبارکباد
خود ابر و باد بگیتی ز دریا ز نبود... — عطیہ ایست کہ بر ہمگناں مبارکباد
معاف باشم، اگر خود ز خویشتن پرسم — برامپور خصوصاً چساں مبارکباد
چو را مپور بود وجہ تازہ روئی دہر — زہر چہ این ہمہ گل کرد آن مبارکباد
ز فیض ہمت فرمانروای آں شہر است — کہ در دخلق بود ہر زماں مبارکباد
ظہور ہمت کدخدائی فرزند — برآں رئیس سپہر آستاں مبارکباد
کہ میہمان حق است آن دیا طفیلی او — نزول مائدہ بر میہماں مبارکباد
بجیب و دامن مردم ز بخشش نواب — متاع خاصۂ دریا و کاں مبارکباد
کشائش در گنجینہ و انگہ از در گنج — بہ پرستار فن پاسباں مبارکباد
بطالبان زر و سیم، سیم و زر فرخ — بہ تالان تہی کاسہ نان مبارکباد
بمن کہ تشنہ لب بادہ ہای بزم و رم — از آں میان دو سہ رطل گراں مبارکباد
گلو زشادی اہل زمین کہ می گویند — فرشتگان بلند آسماں مبارکباد
بدیں ترانہ کہ ہاں ای امیر شاد نشاں — نوید فرخی جاوداں مبارکباد
بشہر یار و ولیعہد و شاہزادۂ عہد — خوشی و خوبی و دامن داماں مبارکباد
ازاں جہت کہ ستائش نگار نوابی — ترا ہم، ای اسد اللہ خاں مبارکباد

نواب فردوس مکاں نے غرہ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۱ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء) کو تحریر فرمایا... "قطعات مبارکباد اور تہنیت نامۂ شادی کتخدائی برخوردار کامگار محمد حیدر علی خاں بہادر ایام فرحت التیام میں سرور افزائی خاطر نیاز ہوئے، اور بمرتبہ ہزاراں مسرت در شادمانی کا ارزانی کیا سبحان اللہ ہر ایک شعر قطعوں اور تہنیت نامے کا مضامین بہجت آگیں اور معانی لطافت تضمین سے ایسا مملو تھا کہ وصول اس کا اضافۂ تحریر و تقریر سے متجاوز ہے۔ اللہ تعالیٰ آپکو ابدالدہر سلامت باجمعیت رکھے۔" (مثل نمبر ۲، صیغہ احباب فردوس مکاں)

اس فرمان سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورۂ بالا قطعۂ مبارکباد موسم برشگال میں ۱۱ جولائی سے قبل سرکار کے حضور میں پیش ہو گیا تھا اب صرف تہنیت نامہ باقی رہ جاتا ہے۔ بظاہر عریضہ ۲۴ تہنیت نامہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کو مذکورۂ فرمان تہنیت نامہ قرار نہیں دے سکتے اول یہ کہ فرمان سے مترشح ہے کہ تہنیت نامہ بھی منظوم تھا، اور یہ عریضہ منثور ہے۔ علاوہ بریں اس کو تہنیت نامہ قرار دینا اس لئے ناممکن ہے کہ یہ لفافے کی انگریزی تاریخ کے مطابق ۱۵ جولائی کو لکھا گیا تھا، اور تہنیت نامہ کا ذکر نواب صاحب کے ۱۱ جولائی کے فرمان میں آچکا ہے۔

خزانے کے آورجے سے پتہ چلتا ہے کہ توڑہ اور خلعت کے روپے جس کا میرزا صاحب کے مکتوب میں شکریہ ادا کیا گیا ہے، پہلی محرم سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۱ جولائی ۱۸۶۱ء) کو یہاں سے بھیجے گئے تھے۔ یہی تاریخ سرکار کے اس فرمان کی ہے جس میں میرزا صاحب کے قطعات مبارکباد اور تہنیت نامے کا ذکر ہے۔ تو گویا فرمان سرکار کے ساتھ ہی ہنڈی بھی روانہ ہو گئی تھی۔

(۳) میرزا صاحب کے اس حسن طلب پر سرکار نے انھیں کچھ بھیجا یا نہیں، اس کے متعلق تمام کاغذات خاموش ہیں۔ غالباً سرکار نے اسے میرزا صاحب کی ظرافت پر محمول کیا ورنہ ضرور روپیہ ارسال فرماتے۔

(۴) حسن علی خاں کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون صاحب تھے

(۵) علی بخش خاں شیخ محبوب بخش ابن شیخ امان اللہ کے بیٹے تھے۔ یہ ۱۴ شوال ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) کو نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اور نانا ریاست کے پرانے نوکر اور خدمت گزار تھے۔ انھوں نے بھی ایام غدر میں بڑی جانفشانی اور خیر خواہی سے کام کیا، اور صلے میں گورنمنٹ سے پانچ ہزار روپے کا خلعت، تلوار طلائی، گھوڑی اور تین ہزار چھ سو روپے سالانہ کی جاگیر ضلع مرادآباد میں انعام پائی۔ نواب خلد آشیاں نے تخت نشینی کے ایک سال بعد انھیں چالیس ہزار روپے نقد یکمشت عطا کیے اور جب یہ بیمار ہوئے تو دو بار بہ نفس نفیس ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ انھوں نے ۲ محرم سنہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) کو رامپور میں انتقال کیا اور مولانا جمال الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ آل محمد مارہروی نے (دیوان تواریخ ۶۴) یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے:

علی بخش خاں مرد نامی گذشت | بہ امرز من فضل رب غفور
بتاریخش آل محمد نوشت | شدہ جنتی نایب رامپور

اولاد میں مولانا محمد علی مرحوم بین الاسلامی شہرت کے قومی رہنما ہوئے ہیں۔ (اخبار الصنادید: ۱، ۲۰۱؛ تذکرۂ کاملان رامپور: ۲۶۴)

(۶) میر سرفراز حسین میر مہدی مجروح کے بھائی اور میر افضل علی عرف میرن صاحب ان کے دوست تھے۔ میرزا صاحب کے بھی ان دونوں سے خوردانہ تعلقات تھے۔ اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں ان کے نام متعدد خطوط درج ہیں۔ میرزا صاحب نے ان کی پریشان روزگاری کا حال دیکھا تو خاں صاحب کے نام تعارفی خط دے کر رامپور بھیجا

نحوست بخت سے اس وقت یہاں ملازمت نہ مل سکی، اور یہ دونوں سو روپے کی زیرباری کے بعد واپس چلے گئے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء کو میر مہدی کو لکھا ہے: " سید صاحب، کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے ان کی زبانی سن لو گے، میں کیا لکھوں! میں نے بھی جو کچھ سنا ہے انہیں سے سنا ہے۔ ان کا اس طرح ناکام پھرنا میری تمنا اور میرے مقصود کے خلاف ہے۔ لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں کچھ نہ ہوگا سو روپے کی ناحق زیرباری ہوئی۔ چونکہ یہ زیرباری میرے بھروسے پر ہوئی، تو مجھے شرمساری ہوئی۔ لیکن میں نے اس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور رسوائیاں بہت اٹھائی ہیں جہاں ہزار داغ ہیں، ایک ہزار ایک سہی، میر سرفراز حسین کی زیرباری سے دل کڑھتا ہے" (اردوی: ۱۸۵) بعدازاں ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۱ء کو پھر لکھتے ہیں " بھائی تم سچ کہتے ہو۔ بر سرِ اولادِ آدم ہرچہ آید بگذرد، لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیرباری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہوئی۔ جس طرح سے یہ آئے ہیں۔ اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے منافی ہے، لیکن واللہ میرے عقیدے اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے یعنی میں یہی سمجھا تھا کہ البتہ یوں ہی ہوگا" (ایضاً: ۱۸۴)

نواب فردوس مکاں کے ایک فرمان مورخہ ۱۶ اگست سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا صاحب کی ہدایت کے مطابق اُن کی جولائی کی تنخواہ میں سے پچیس روپے نقد میر سرفراز حسین صاحب کو آغا لباڑا دراد کے لیے، منشی سیلچند کی معرفت دیئے گئے تھے۔ (مثل نمبر ۱۹، صیغہ اعیاب عہدِ فردوس مکاں)

(۷) اس لفظ کو میرزا صاحب نے "یا الہ" لکھا ہے۔

صفحہ ۴۴

(۱) نواب صاحب کے مذکورہ سفر کی تفصیل یہ ہے کہ " . . . جنابہ ملکہ معظمہ وکٹوریہ آنجہانی کا ایک فرمان ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء کو صادر ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

ما بدولت نے اپنی مرضی خاص اور علم کامل اور عزم مبارک سے ایک رتبۂ جدید عالی جو آج سے دوام کے لیے خطاب "موسٹ اگزالٹڈ آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا" سے موسوم ہو کر مشہور ہوگا، تجویز اور ایجاد کیا ہے؛ اور ما بدولت کا ارشاد ہوتا ہے کہ رتبہ مذکور میں ایک شخص سادرن وسردارِ اعلیٰ، ایک گرانڈ ماسٹر، سردار مجلس و نائٹ، (بہادر) شریک رہیں اور والیانِ ہند اور سردارانِ ہندوستانی اور ہماری رعایا میں سے ۲۵ اشخاص، جو اس قسم کی لیاقت رکھتے ہوں اس رتبۂ عالی سے محروم نہ کیے جائیں ما بدولت کی تجویز اقدس سے ما بدولت کا عزیز مشیرِ اکبر چارلس جان ارل کیننگ، گورنر جنرل ہندوستان، اس . . . رتبے کے اول سردار مقرر ہوئے اور یہ مقتضائے دانشمندی اور مصلحت ہے کہ رتبۂ مذکور کا امتزاج ایسے

اشخاص کو جو وقتاً فوقتاً ما بدولت کی تجویز اقدس سے نامزد ہو کر اس رتبے کے بہادر مقرر کیے جائیں، عہدۂ موسومہ نائٹ بچیلر عطا کرنے کا مجاز ہے۔"......

اس کام کے واسطے لارڈ کیننگ صاحب نے ایک دربار الہ آباد میں مقرر کرنے کی تجویز کی اور نواب سید یوسف علی خاں بہادر کو بھی بلایا۔ نواب صاحب مع خدم و حشم الہ آباد گئے۔ یکم نومبر سنہ ۱۸۶۱ء کو ایک شاہانہ دربار منعقد ہوا...... جب تمام اہالی جلسہ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو نواب صاحب بہادر تخت شاہی کے محاذی تشریف لے گئے۔ اور گورنر جنرل نے اپنے ہاتھ سے اس رتبے کے نشان عطا فرمائے اور کھڑے ہو کر بیان کیا:"...... چونکہ یہ رتبہ سب سے پہلے آپ صاحبوں کو عطا ہوا ہے امید ہے کہ آپ ہند کے باشندوں میں ایسا طریقہ اختیار کریں گے کہ آپ کا طرزِ عمل دیکھنے سے ہند کے سرداروں یا باج گزاروں کو ملکہ معظمہ کے ساتھ محبت قلبی اور اتحاد قلبی پیدا ہو۔" بعد اس تقریر کے دربار برخاست ہوا، اور نواب صاحب گورنر جنرل سے رخصت ہو کر اپنے دارالریاست کو واپس تشریف لائے۔" (اخبار الصنادید ۲، ۱۳۱-۱۲۰)

نواب صاحب کے فرمان بنام غالب مورخہ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۷۸ھ (۸ اکتوبر سنہ ۶۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۶۱ء کو الہ آباد روانہ ہونے کا ارادہ اور تقریباً ایک ماہ رامپور سے باہر رہنے کا خیال تھا (مثل نمبر ۴۴)، لیکن میرزا صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں تشریف لے آئے تھے۔

(۲) میرزا صاحب کو قولنج کا پہلا دورہ ۲۴ مئی سنہ ۱۸۵۸ء کو ہوا تھا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں: "بھائی وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا...... کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔" [illegible]

اس کے بعد ۲۹ ستمبر ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں: "نہ تندرست ہوں، نہ رنجور [illegible] بے [illegible] رنجور ہوں۔" (ایضاً: ۱۲۰) ۱۱ نومبر ۱۸۶۱ء کو سرکار کے خط [illegible] ایک مہینے سے بیمار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت ستمبر کے آخر ہی میں چاد [illegible] ان سے ہٹ گئی تھی، اور تقریباً ۱۱ یا ۱۲ اکتوبر کو قولنج کا جو دورہ ہوا، اسی کا یہ پیش خیمہ تھا۔ سنہ ۱۸۶۲ء کے آخری مہینوں میں یہ دورہ جلد جلد ہونے لگا تھا۔ ۴ نومبر سنہ مذکورہ کو نواب میر غلام بابا خاں کی دعوت قدوم سورت پر لکھتے ہیں: "ایک ہفتہ، دو ہفتے کے بعد ناگاہ قولنج دوری کی شدت ہوتی ہے۔" (اردوی: ۹)

۳) میرزا صاحب نے اس لفظ کو مشدد یا لکھا ہے۔

۴) ان دونوں لفظوں کو میرزا صاحب نے ایک الف زائد کے ساتھ "بالفعل" اور "بالکل" لکھا ہے۔

۵) اس مثنوی کے متعلق لفافے کی پشت پر نوٹ ہے "تاریخ نزد منشی سیلچند ماند" سرکار نے اس کی تعریف میں، ۸ نومبر کو تحریر فرمایا: "سبحان اللہ ہر تاریخ بے بدل اور ..."

نادر اور نخر جب بے مثل ہے۔"

صفحہ ۲۳

(۱) نور الدین ظہوری، ترشیز (ایران) کا باشندہ تھا۔ سنہ ۹۸۸ھ (۱۵۸۰ء) میں دکن آیا اور ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں تقرب حاصل کیا، اور سنہ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں فوت ہو گیا۔ اس کی سہ نثر اور کلیات مشہور ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "فرمایئے"، "بشدید یا" لکھا ہے۔

(۳) خدا جانے کس بات سے میرزا صاحب کو شک گزرا کہ سرکار کچھ کشیدہ ہیں۔ ورنہ منقولوں میں تو سرکار کے سنہ ۷۲ء کے لکھے ہوئے خیریت جوئی کے فرمان خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

(۴) یہ عبارت عریضے کے آخر میں مہر کے بعد تحریر ہے۔

صفحہ ۲۴

(۱) لفافے پر "یوم جمعہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ء" لکھا ہے۔

(۲) سر رابرٹ منٹگمری صاحب مراد ہیں۔ یہ فروری سنہ ۱۸۵۹ء سے جنوری سنہ ۱۸۶۵ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے تھے۔ قدر بلگرامی کے نام کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ان کے دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ دربار کے بعد منٹگمری صاحب نے بلا کر اپنی طرف سے خلعت عطا کیا، اور وہیں دربار انبالہ کے متعلق گفتگو ہوئی۔ فرماتے ہیں: "...... رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ بہادر قلمرو پنجاب یہاں (دلی) آئے، دربار کیا، میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن دس بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا، بہت عنایت فرمائی، اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا" (اردوی: ۲۰۶، لاہور ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء) شیو نرائن کے نام کے خط میں فرماتے ہیں: "...... بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے۔ دربار کیا، چیز کردہ، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا، اور کہا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی، یہ آخر فروری ہے، اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس داہنے ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں، اٹھنا دشوار ہے۔ بہر حال سوار ہوا، گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا، پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور نہیں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی، یعنی عنایت سی عنایت، اخلاق سے اخلاق، وقت رخصت خلعت دیا، اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہ محبت دیتے ہیں، اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی نمبر المبر اور خلعت کھل گیا انبالے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔ حال عرض کیا گیا۔ فرمایا: "خیر، اور بھی کے دربار میں شریک ہونا" اس پھوڑے کا برا ہو، انبالے نہ جا سکا" (اردوی: ۸۴-۳۸۳)

(۳) لارڈ الگن بہادر مراد ہیں۔ یہ لارڈ کیننگ کے بعد ہندوستان کے وائسرائے ہوئے، جنوری سنہ ۱۸۶۲ء میں جائزہ لیا اور ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۶۳ء کو فوت ہو گئے۔ میرزا صاحب ایک مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں: "۱۱ جمادی الثانی سال غفر، مطابق ۱۲ دسمبر سال کیا

غضب ہے یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔" (اردوی: ۴۰۵)

صفحہ ۲۵

(۱) میرزا صاحب نے ۱۳ رمضان (۴ مارچ سنہ ۶۳ء) کو تفتہ کے نام حسب ذیل خط لکھا ہے: "...... ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو ۷ پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدۃ العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا تم بھی انبالے جاؤ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی، کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گذری گویا مردہ جی اٹھا۔ مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سنتا گزرا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں؟ اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدے کی فکر، ادھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کریگا۔ لیکن ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں لکھیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب کو لکھ کر بھیجی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالے سے آکر خط لکھوں گا" (اردوی: ۱۱۰)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے محولہ بالا "سطریں" چار پانچ کو یا اس سے ایک دو دن قبل نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ سوئے اتفاق سے ان سطور والا عریضہ مثل میں موجود نہیں۔ البتہ نواب صاحب کا جواب شامل ہے القاب و آداب کے بعد ارشاد فرمایا ہے: "...... مشفقا! ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ برائے مصارف تشریف فرمائی سامی برائے ملازمت جناب مستطاب معظم الیہم معطوف رقیمۃ الوداد ہذا مرسل خدمت شریف است"

یہ فرمان ۱۱ مارچ سنہ ۶۳ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ میرزا صاحب کے عریضے میں اسی کا حوالہ ہے۔ اصل عریضے کے جواب میں۔ نواب فردوس مکان نے ۱۹ مارچ کو تحریر فرمایا: "..... چونکہ خط نواب صاحب کمشنر بہادر سے عدم حصول شرف ملازمت جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہم کا بمقام انبالے مستنبط ہے، اس واسطے تشریف لیجانا آپکا انبالے کو بلا استجازت ضرور معلوم نہیں ہوتا۔ آئندہ جو رائے زریں آپ کی اس خصوص میں مقتضی ہو اور خط مسطور بجنسہ واپس بھیجا جاتا ہے......"

(۲) قصیدۂ مذکور کے لیے مثنوی ابر گہر بار ص ۳۵-۴۳ اکمل المطابع، دہلی، سنہ ۱۲۸۰ھ ملاحظہ ہو

(۳) میرزا صاحب کا یہ جملہ غمازی کرتا ہے کہ انھیں لفٹنٹ گورنر اور گورنر جنرل کے میر منشی دونوں سے بحالی دربار کی اطلاع سُن لینے کے بعد بھی یقین نہیں ہوا تھا، جس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھیں بحالی کی تحریری اطلاع نہیں دی گئی تھی، ورنہ ذرا ذرا سی بات پر نا امید نہ ہوتے۔

صفحہ ۲۶

(۱) صاحب سکرتر بہادر کے محولہ بالا خط کی نقل حسب ذیل ہے:

نقل خط جناب صاحب سکرتر بہادر

سرنامہ

در شہر دہلی

خانصاحب بسیار مہربان دوستان، مرزا اسد اللہ خاں، سلمہ اللہ تعالیٰ:

خط برکاغذ افشاں:

خانصاحب بسیار مہربان دوستان سلامت

قصیدہ باآب وتاب در مدحت بندگان نواب مستطاب معلی القاب وائسرای و گورنر جنرل بہادر، دام اقبالہ، وصول گردیدہ، بریخ ارادت آں مہربان آبی، و بر جبین عقیدت ایشاں تابی افزود، وازگرانمایہ گوہر ہائی بحر فکر یکتا سخنور معنی پرور، کہ گنج بر گنج نہادہ بود، از نظر قبولی بندگان نواب صاحب ممدوح گزشتہ، طرب پیرای خاطر ہمایون ایشاں گشت۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید [دستخط انگریزی] مرقوم ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء۔

یہاں یہ امر قابل اظہار ہے کہ میرزا صاحب کے اس روحانی سرور کے حصول میں اُن کے ایک جسمانی عارضے نے خلل اندازی کی، ۲ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں: "رجب کے مہینے میں بیدے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی کا پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔ ابنالے نہ جانے کی بھی یہی وجہ ہوئی" (اردوی: ۱۵۲) بعد ازاں ۳ مئی کو شیو نرائن کو لکھا ہے ".... اس پھوڑے کا برا ہو! انبالے نہ جا سکا" (ایضاً: ۳۸۴) تفتہ کو ایک غیر مورخہ خط میں اطلاع دی ہے: "... لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا، اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا بیمار ہوں۔ ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے" (ایضاً ۷۸ ۳ لاہور ایڈیشن سنہ ۱۹۲۶ء)

(۲) آموں کی بہنگیاں ۲۹ جون سنہ ۱۸۶۴ء کو یہاں سے روانہ کی گئی تھیں

صفحہ ۲۷

(۱) حسین علی خاں کے لئے دیباچے کی بحث، خاندانِ مینی ملاحظہ ہو۔

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کا املا (بالکل) لکھا ہے۔

(۳) نواب فردوس مکان اس سال عارضہ سرطان میں مبتلا ہو کر مسلسل چھ ماہ تک علیل رہے

میرزا صاحب سے اُن کے تعلقات شاگردانہ اور کریمانہ تھے۔ جب انھیں علالت کی اطلاع ملی، تو بہت متردد ہوئے اور بذریعہ عریضۂ ہٰذا حقیقتِ مرض سے آگاہ کرنے کی درخواست کی۔ مثل میں اس عریضے کا جواب موجود نہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً شدتِ مرض کے سبب جواب میں تاخیر ہوئی، اور جب اس عرصے میں میرزا صاحب کا آیندہ خط بھی موصول ہوگیا، تو دونوں کے جواب میں مرض کی حقیقت سے انھیں اطلاع دی گئی۔

صفحہ ۲۸

(۱) اصل میں یہ لفظ "ٹھہرنا" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب اسے صرف ایک ہی "ہ" کے ساتھ بولتے تھے۔

(۲) یا تو عبارت یوں ہونا چاہیے: "اس خط کا جواب آنے کی مدت سے پہلے" اور یا "اس خط کے جواب کے آنے کی مدت سے پہلے"۔ بظاہر یہاں سہوِ قلم نظر آتا ہے۔

(۳) اس عریضے کے جواب میں ۱۹ نومبر کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "مشفقا! اب فضلِ الٰہی سے پھوڑہ لاحقہ میں بہت تخفیف اور قریب الاندمال کی ہے"۔ عریضۂ ۳۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۲۷ نومبر کو موصول ہوا

صفحہ ۲۹

(۱) اشعارِ مذکورہ کے متعلق عریضے کے لفافے پر نوٹ ہے: "حسب الحکم تاریخ بنز مولوی امیر احمد صاحب فرستادہ شد، یکم دسمبر ۱۸۶۴ء"۔ امیر مینائی مرحوم نے "انتخابِ یادگار" (ص ۲۵۰) میں تہنیتِ غسلِ صحت کے نام سے یہ شعر درج کیے ہیں۔

دانم شنیدہ کہ در اقصای مغربست — سرچشمہ کہ خضر شد از وی بقا پذیر

جوی بریدہ اند ... کردہ اند آب — حمام را بحوض ازان فرخ آب گیر

ہنگام شب کہ زیرِ زمیں باشد آفتاب — از تابِ مہر گرم شد آں آب ناگزیر

حمام حوض بنگر و گل جامش آسماں — واں را سفید کردہ فروغِ مہِ منیر

آمد برای غسل بہ گرمابہ اندروں — مانندِ معنیے کہ درآید در ضمیر

اینک فراغ و اخترِ نیک و خجستہ روز — پیدا است از لباسہ لفظ نہ تاریخ دلپذیر

"سبدِ چین"، ص ۱۵، طبع دہلی ۱۲۸۳ھ ۱۹۳۸ء میں ان ۷ کی بجائے ۲۶ شعر کا ایک قصیدہ طبع ہوا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا صاحب نے ان میں سے سات شعر چن کر نواب فردوس مکاں کے حضور میں پیش کیے تھے۔ نواب صاحب نے اس قطعے کی تعریف میں حسبِ ذیل گرامی نامہ ۴ شعبان ۱۲۸۱ھ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کو تحریر فرمایا:

"ہماری صحت کی تہنیت میں قطعہ مبارکباد کا جو آپ نے لکھا ہے، وہ پہنچا۔ اس کے آنے سے سرورِ صحت دوبالا ہوگیا۔ ایسی نظم، ایسی تاریخیں دوسرے سے کب ہو سکتی ہیں! اچھا! کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے۔ جس کمال کو دیکھیے اس میں آپ کی ذات فردِ کامل ہے۔ فی الحقیقت ہم نے اس مرض میں بڑی تکلیف اٹھائی۔ بہت ایذا پائی۔ اللہ نے بڑا فضل فرمایا۔ دوستوں کی دعا کو قبول کیا۔ شفا حاصل ہوگئی ہے

اندک زخم اندمال ہونے کو باقی ہے۔ غالب ہے کہ دس بارہ دن میں مرہم لگانا موقوف ہو جائے۔ آپکا ہدیۂ مرسلہ اکثر نقل محفل رہتا ہے جو سنتا ہے، جو دیکھتا ہے وارفتہ ہو جاتا ہے سچ ہے ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں، ہزاروں برس فلک چرخ لگاتا ہے۔ تب کہیں ایک شخص اس کمال کا پیدا ہوتا ہے۔ اللہم بحق دعا فیت طول عمر عطا کرنے، اور تا دیر گاہ اہل جہاں آپ کی ذات سے مستفید ہو کریں۔ باقی خیر یت!"

صفحہ ۳

(۱) یہ انگریزی لفظ "کیمپ" سے بنایا گیا ہے۔ کیمپ کے معنی ہیں پڑاؤ۔ بعض پرانے بزرگ کمپو بھی بولتے اور لکھتے تھے۔

(۲) اصل: ہر یک۔ لیکن یہ سہو قلم ہے۔

صفحہ ۳۱

(۱) میرزا صاحب نے "تو نگر" لکھا ہے۔

(۲) اس سے یہ شبہہ نہ ہو کہ میرزا صاحب علم نجوم کے عالم تھے۔ انھوں نے خود سرور بار ہروی کو لکھا ہے: "۔۔۔ تحویل آفتاب بحمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوتی ہے۔ کبھی ۲۱ اور کبھی ۲۳ بھی آ پڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں رہا طالع وقت تحویل دیکھنا کہ زائچے کتب فن اور مبلغ علم ممکن نہیں۔ میرے پاس یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔"
(اردوی لاہور ایڈیشن: ۱۰۲)

(۳) میرزا صاحب نے یہاں ہمزہ لکھا ہے۔

صفحہ ۳۲

(۱) میرزا صاحب نے ہمزہ لکھا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "ہولناگ" لکھدیا ہے۔

(۳) قطعۂ تاریخ غسل عریضہ (۳۹) کے حاشیہ میں درج کیا جا چکا ہے۔ قصیدہ تہنیت جو منشی سیل چند کے نام کے خط مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کے مطابق ۸ شعبان سنہ ۱۲۸۱ھ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء) اور ۲۵ رجب ۱۲۵۱ (۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء) کے درمیان لکھا گیا تھا، شامل نہیں ہے۔ لیکن اردو دیوان غالب مع شرح نظامی (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۲ء) کے صفحات ۳۴۴-۲۴۷ پر ایک قصیدہ پایا جاتا ہے، جو نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم، جاگیردار ریاست لوہارو، سے رسالہ کمال، دہلی کو حاصل ہوا تھا اور اس کی اشاعت جنوری سنہ ۱۹۱۰ء سے مولانا نظامی نے نقل کیا ہے۔ مولانا کے خیال میں یہ قصیدہ نواب خلد آشیاں کے غسل صحت کی تہنیت میں لکھا گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ میرزا غالب کا محولہ بالا قصیدہ ہے اس لئے کہ اس میں جشن کے موقع پر عید، نوروز اور ہولی کا جمع ہونا بکثرت کیا گیا ہے۔ اور امیر مینائی کے قطعۂ تاریخ (انتخاب یادگار: ۵۰، و مرآۃ الغیب: ۲۴۰، مطبع نولکشور، کانپور سنہ ۱۹۰۴ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ ہولی کا یہ اجتماع نواب فردوس مکاں کے غسل صحت کے وقت ہوا تھا۔ ان کے قطعے کا آخری مصرعہ ہے: "تہنیا عید کا، نوروز کا دن، روز صحت ہے"

مرزا صاحب کا قصیدہ حسب ذیل ہے

مرحبا سالِ فرخی آئیں
عیدِ شوال و ماہِ فروردیں

شب و روز افتخارِ لیل و نہار
مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں

گرچہ ہے بعدِ عید کے نوروز
لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

سو اس اکیس دن میں ہولی کی
جابجا مجلسیں ہوئیں رنگیں

شہر میں کو بکو عبیر و گلال
باغ میں سو بسو گل و نسریں

شہر گویا نمونۂ گلزار
باغ گویا نگارخانۂ چیں

ہیں تو بارہ اور ایسے خوب
جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں
منعقد محفلِ نشاط قریں

محفلِ غسلِ صحتِ نواب
رونق افزائے مسندِ تمکیں

بزمگہ میں، امیر شاہ نشاں
رزمگہ میں حریفِ ضیغمِ کیں

پیشگاہِ حضور، شوکت و جاہ
خیر خواہِ جناب، دولت و دیں

جن کی مسند کا آسماں گوشہ
جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

جن کی دیوار قصر کے نیچے
آسماں ہے گدائے سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزم سرور
نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں

انجمن چرخ، گوہر آگیں فرش
نور سے، ماہ ساغرِ سیمیں

راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے
ہے وہ بالائے سطحِ چرخ بریں

وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال
یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم
کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے
ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِ ثمیں

نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا
جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مطلوب
ہاں وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں

سرورِ دہر ہوا جو سوار
بہ کمالِ تجمل و تزئیں

سب نے جانا کہ ہے پری توسن
اور بال پری ہے دامنِ زیں

نقشِ سمِ سمند سے یکسر
بن گیا دشت دامنِ گل چیں

فوج کی گردِ راہ مشک فشاں
رہ رووں کے مشام عطر آگیں

بسکہ گنتی سے فوج کو [illegible]
فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں

موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا
جس طرح ہے سپہر پر پرویں

چھوڑ دینا تھا شور کو بہرام
ران پر داغِ تازہ دیتے دہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سریں

بندہ پرور، ثنا طرازی سے
مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں

آپ کی مدح، اور میرا منہ!
گر کہوں بھی، تو آئے کس کو یقیں

اور کچھ اب کہ ضعفِ پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و نیستی خدا کی پناہ دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا ہے قلم کی جو سجدہ ریز جبیں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں تم رہو زندہ جاوداں آمیں

دیوانِ غالب اُردو کے طاہرا ایڈیشن میں بھی یہ قصیدہ شائع ہو چکا ہے۔

صفحہ ۳۳

(۱) اس نثر کی رسید میں ۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۳ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "نثر نژہ نثار آپ کی آئی۔ جشنِ صحت کی مسرت بڑھائی۔ زبانِ خامہ کو مجالِ صفت نہیں۔ خامۂ زبان کو یارائے مدحت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ آپ کی ذات ہر کمال میں فرد کامل ہے ہر فقرے میں قوتِ اعجازی حاصل ہے۔ انصاف کی تو یہ بات ہے کہ یہ تحریر نہیں کرامات ہے۔ اس جشن میں اگرچہ بظاہر آپ شریک نہیں ہوئے، مگر میرے نزدیک شریکِ غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت و قوت عطا فرمائے۔ مشتاقوں کو لطفِ مجالست ہاتھ آئے۔ وست: عالمند ہے۔ تو یہ صحت کی طبیعت آرزومند ہے۔ حال اپنا اکثر لکھتے رہیئے۔ زیادہ شوق ہے۔" میرزا صاحب کے خط کے لفافے پر امیر مینائی نے لکھا ہے: "بندہ نواز منشی تیلچند صاحب، حسب الامر سرکار مسودہ جواب خط مرزا نوشہ صاحب نوشتہ بخدمت میفرستم۔ حسب ضابطہ روانہ بادفرمود۔ امیر فقیر" اخبار الصنا دید (ج ۲، ۱۲۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حسبِ تجویز صاحبزادہ سید کاظم علی خاں بہادر عرف چھوٹے صاحب، باغ بے نظیر میں یہ جشن منایا گیا تھا۔

صفحہ ۳۴

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے

صفحہ ۳۶

(۱) ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو جمعے کے دن نصف النہار کے وقت نواب فردوس مکاں نے انتقال کیا۔ یہ خبر دوشنبہ اکو دلی پہنچی تو میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے نام ۲۷ ماہ اپریل کو ایک ... عریضہ لکھا۔ اصل تحریر مثل میں موجود نہیں، تفتہ کے نام کے مکتوب سے جو ۱۲ مئی سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا گیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عریضہ تعزیتِ وفات اور تہنیتِ جلوس پر مشتمل تھا۔ فرماتے ہیں: "رامپور سے اپریل کے مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آ گیا۔ آئندہ جو خدا چاہے" (اردوئے معلیٰ: ۳۵۹ لاہور ایڈیشن، سنہ ۱۹۲۲ء) نواب خلد آشیاں نے یکم مئی کو اس عریضے کے جواب میں تحریر فرمایا:

".. صحیفۂ شریفہ مورخہ ۲۷ ماہ گذشتہ اسمیٔ مخلص وصولِ الطاف آوردہ بما فیہا مطلع نمود مستفسر! آنچہ متظاہر آں کرم فرما از عہد نواب صاحب قبلہ فردوس مکاں مقرر است، انشاء اللہ تعالیٰ بدستور جاری ماندہ حسب ضابطہ بنامی خدمت رسیدہ خواہد ماند" اس کے بعد سرکار نے ماہ اپریل کی تنخواہ کی ہنڈوی کا ذکر کیا ہے۔ میرزا صاحب کا عریضہ اسی زبان کی رسید ہے۔

(۲) یہ رباعی جدا ورق پر لکھ کر میرزا صاحب نے مکتوب ۵۴ کے ساتھ منسلک کر دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۲ مئی کو بکرعید ہوئی تھی۔

(۳) قصیدہ تہنیت متل میں نہیں پایا جاتا۔ یہاں عود ہندی (ص ۱۷۱) اور سبد چین (ص ۱۳) سے نقل کیا جاتا ہے۔

تجلیی که ز موسیٰ ربود هوشش بطور — بشکل کلب علی خان دگر نمود ظهور

خجسته سرور سلطان شکوه را نازم — که رشک بر کلهش دارد افسر فغفور

هوای لطف وی، از جان مسیح پرورش — نگاه قهر وی، از روی مه رباید نور

دم نگارش وصف کلام شیرینش — بپیچ خیل شود، دوده بر ورق حروف سطور

فضای رزمگهش، شاه راه قهر و غضب — بساط بزمگهش، کارگاه سور و سرور

بخوان شرع بهین، همنواله شبلی — به بزم عشق بهین، هم پیاله منصور

ز روی رابطهٔ حسن، با جناب جمال — بحسب ضابطهٔ جاه، آفتاب ظهور

بحکم مرتبه او حاکم و فلک محکوم — ز راه قاعده، شرع آمر ست و او مامور

چو آب نیل روانی که ایستد بمغاک — بود همیشه به فنجان وی شراب طهور

زهی وزیر وحی شهسوار دانا دل! — تو شاه کشور حسن و خرد ترا دستور

بنای منظر جاه ترا، زحل معمار — ثوابت کره چرخ هشتمین مزدور

ثناگر تو سکندر به بارگاه جلال — تفاخر تو ارسطو بدرسگاه شعور

برای بزم نشاط تو شمع چون ریزند (ق) — نه پیه گاو بکار آورند نی کافور

ز فیض نسبت خلق تو، عنبر سارا — بجای موم برآید ز خانه زنبور

بدین خرام و بدین قامت و بدین رفتار (ق) — ز مهر تا نخرامی اگر بسوی قبور

جهان جانی و جان جهان، عجب نبود — که از ورود تو هر مرده رقصد اندر گور

به پیشگاه تو، زانوزنی زند انصاف (ق) — که ای برحم و کرم در جهانیان مشهور

در انتقام کشی شیوه کرم مگذار — برار کام دل بدسگال از ساطور

تویی بعقل فزاینده عروج علوم — تویی بعلم کشاینده عقود صدور

صریر خامه من بین که میرباید دل — چنانکه از لب داؤد استماع زبور

سواد صفحه من بین و تابش معنی — عیان چو شمع فروزنده در شب دیجور

امیر زنده دل، آن والی ولایت نظم — به گنج خانه گنجینه‌ها نشسته گنجور

غروب مهر و طلوع مه دو هفته بود — رسیدن تو بدین اوج بعد آن فغفور

چو او بزیر زمین رفت، آن ولایت یافت — تو باش والی روی زمین فزون ز دهور

به انجمن نرسیدم ز ناتوانایی — ولی بعرض ثنا و دعا ایم معذور

بخاک پای تو اگر دستگاه داشتمی — نبودمی بجهنم دوری از تو صبور

من آن کسم که از افراط ورزش اخلاص — بجنبیت است مرا دعوی دوام حضور

تویی رحیم دل و من سقیم، دوری به — مباد، رنجه شوی از نظاره رنجور

کنی بدست تهی تنز ز کیسهٔ دلاک — دلی لب... بسی تنگ‌تر ز دیده مور

کھی نہ باد کرم از شما، بلا تشبیہ ... ز کردگار بود رحمت و ز بندہ قصور
نظر بخستگی و پیری و تہیدستی ... قبول کردن تسلیم من خوش است ز دور
شعار غالب آزادہ جز دعا نبود ... کہ باد سعی دعاگوی در دعا مشکور
چہ بہر تا بود آئین کہ در نوا آرند ... رباب و بربط و قانون و نی بمحفل سور
بہ بزم عیش تو ناہید باد زمزمہ سنج ... نسیم عطر فروشش از شمیم طرہ حور
محب ز لطف تو بالندہ، چوں نواز سحا! ... عدو ز بیم تو نالندہ، چوں خر طنبور

میں نے اس قصیدے کا مقابلہ ایک قلمی ورق سے بھی کیا،٭ جو کلیم رامپوری مرحوم کے پاس تھا۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ یہ وہی پرچہ کاغذ ہے جس کو خود غالب نے میر عوض علی خوشنویس کو بھیجا تھا، تاکہ سرکار میں پیش کرنے کے لئے اس کی خوشخط نقل کر دیں۔ لیکن اس کا خط میرزا صاحب کا نہیں ہے۔ اس بنا پر میں یہ گمان کرتا ہوں کہ کسی نے رامپور بھیجی ہوئی اصل سے نقل کیا ہے۔ چونکہ اس قسم کے نوادرات کلیم مرحوم کو امیر مینائی کے یہاں سے دستیاب ہوئے تھے، کیا عجب ہے کہ یہ نقل بھی انھیں کے لئے تیار کی گئی ہو۔ اس میں جزئی اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً مصرع "امیر زندہ دل آں والی ولایت نظم"، کو "ناظم قلمرو نظم" کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ قصیدۂ مذکور میرزا صاحب ہی کے مسیضے کی نقل ہے، ورنہ دوسرا شخص شعر میں اتنا تغیر کبھی نہ کرتا۔

نواب خلد آشیاں نے ۱۷ محرم الحرام سنہ ۸۲ ۱۲ھ (۱۱ جون سنہ ۱۸۶۵ء) کو اس قصیدے کے متعلق تحریر فرمایا: ". . . . دو قطعہ سامی صحیفہ لطف آگیں، اول مع قصیدۂ تہنیت مسند نشینی راقم بریاست موروثی ملک رامپور و ثانی مع سلام من تصانیف جناب مغفرت مآب نواب صاحب و قبلہ فردوس مکاں در وسعد از منہ یا یمن ریزہ دامن وصول فرحت شمول گشتہ . . . . حبذا قصیدہ کہ لآلی مدحت مضامین برجستہ و معانی دل نشستہ اش را برشتہ نظم کشیدن آب دریا بگلیں پیمودن است و شمہ از توصیف فصاحت و بلاغت آں احیطہ تحریر درآوردن تو اہب سیارہ را بہ پنج انگشت شمردن . . . . در نیولاد بانی نواب مرزا اعظم سامی بابہا طرفا مسموع گشتہ، موجب کمال مسرتہا ست، چہ اگر راقم نیز متمنی ملاقات شریف است، اللہ تعالیٰ شب طویل فراق بزودی ہرچہ تمامتر بایام وصال مبدل گرداند"۔

یہ خط میرزا صاحب کو ۱۷ جون کو موصول ہوا۔ ۱۸ جون کو انھوں نے اس کا جواب تحریر کیا جو نمبر (۹۴) پر درج ہے۔

(۴) میرزا صاحب نے "مد ساکنہ" لکھا ہے۔

(۵) اس شعر کو میرزا صاحب نے اپنے دو شعروں کے ایک ایک مصرع سے بنا لیا ہے۔ وہ دونوں شعر پچھلے اور آیندہ عریضوں میں بار بار دہرائے جا چکے ہیں۔

(۶) لفافے پر ۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۵ء درج ہے اور اس کی پشت پر لکھا ہے: "در خط در سید قصیدۂ وسلام مرسلہ نوشتہ شد والمرقوم ۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۳۱ مئی سنہ ۱۸۶۵ء"۔

صفحہ ۳۷

(۱) میرزا صاحب نے "اکھاڑ و لے" لکھا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے جود و کرم کے اس واقعے کا ذکر متعدد خطوں میں کیا ہے حکیم غلام رضا خاں کو لکھتے ہیں: "...... نواب صاحب حال بمقتضای "الولد سِرّ لابیہ" حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ کے برابر، بلکہ بعض شیوہ روش میں اُن سے بہتر ہیں۔ بجرد مسند نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کیا، علی بخش خاں خانساماں کو ۳۰ ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکار بخش دیا...." (اردو: ۴۵۲) تفتہ کے نام کے خط میں قدرے تفصیل کی ہے فرماتے ہیں "... نواب صاحب از روی صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے پٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی" (ایضاً: ۲۹۸) تخریب قمارخانہ اور بخشش محصول غلہ کا ذکر اخبار الصنادید (۲، ۹۷) میں بھی کیا گیا ہے۔

(۳) قافیہ شایگاں ہو گیا ہے۔

(۴) اصل: ردار

(۵) اصل: قصیدہ۔ لیکن ازروی قواعد یہاں بصیغۂ جمع استعمال کرنا ضروری تھا۔ بنابریں اسے سہو قلم پر محمول کر کے متن میں اصلاح کر دی گئی ہے۔

(۶) یہ رسید بندہ عریضہ سابق کے ہمراہ بھیجی گئی تھی، اس لئے لفافے کی عبارت دونوں سے متعلق شمار کی جائے

صفحہ ۳۸

(۱) محولہ بالا فرمان کا اقتباس عریضہ (۴۶) کے حاشیے میں دیا جا چکا ہے

(۲) یہ قصیدہ عریضہ (۴۶) کے حاشیہ میں درج ہو چکا ہے۔

(۳) کلیات فارسی کے رامپوری نسخے میں اس کا اندراج نہیں ہے، حالانکہ جوابی فرمان، مورخہ ۱۵ جولائی، میں سرکار نے اس کا وعدہ فرما لیا تھا۔

(۴) اصل: بوڑھے مگر اس لفظ کو ۹ جون سنہ ۶۶ء کے عریضے کے ساتھ والی غزل میں "بوڑھا"، "رٹے" کے ساتھ لکھا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ آخر میں میرزا صاحب نے تلفظ اور املا دونوں بدل لئے تھے

(۵) سفر کی تفصیل کے لئے دیباچہ ملاحظہ ہو۔ یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ میرزا صاحب ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء کو دلی سے عازم رامپور ہوئے۔ اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو واپس دلی پہنچے (اردو: ۲۴۳)

(۶) نواب یمین الدولہ وزیر الملک محمد علی خاں بہادر صولت جنگ ریاست ٹونک کے نواب

تھے۔ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء میں گدی پر بیٹھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۷ء میں ٹ۔وا میں سکھا کردں کا قتل عام کرانے کے الزام میں حکومت ہند نے انھیں معزول کر دیا۔ سنہ ۱۸۷ء میں ریاست پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے زیر انتظام آگئی، اور حافظ ابراہیم علی خاں بہادر نواب بنا دیئے گئے۔ نواب امین الدولہ بنارس چلے گئے، اور ۲۸ سال تک مقیم رہنے کے بعد ۱۶ صفر ۱۳۱۳ھ (۲۸ اگست سنہ ۱۸۹۵ء) کو بنارس میں انتقال کیا۔ (آثار ریاست: ۲۳۵) نیز ملاحظہ ہو مکتوب ۱۳۰ کا حاشیہ ۶۔)

(۷) احمد شاہ درانی ضلع ہرات کا باشندہ اور ابدالی نامی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ نادر شاہ اس کو ایران پکڑ لے گیا، اور اپنی خدمت گرز برداری پر مقرر کیا۔ اس نے رفتہ رفتہ فوج کے بڑے عہدے تک ترقی کر کے ۱۲ مئی سنہ ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ کی وفات پر بغاوت کر دی، اور تھوڑے عرصہ میں افغانستان، سندھ اور لاہور کا بادشاہ بن بیٹھا۔ احمد شاہ نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے، لیکن اس کی شاندار ترین جنگ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے عظیم الشان لشکر سے واقع ہوئی، جس میں احمد شاہ کامیاب ہوا اور بعد فتح شاہ عالم کو تخت و تاج ہند سونپ کر افغانستان چلا گیا۔ احمد شاہ نے ۲۴ سال حکومت کر کے سنہ ۱۱۸۶ھ (سنہ ۱۷۷۲ء) میں ۵۰ سال کی عمر میں وفات پائی (مفتاح التواریخ: ۲۵۰)

(۸) جد امجد سے نواب سید غلام محمد خاں بہادر مراد ہیں۔ احمد شاہ کے عطا کردہ خطابات کے سلسلے میں انتخاب الفساد ید (۷۱، ۷۶) ملاحظہ ہو۔

(۹) میرزا صاحب کے اس خیر خواہانہ عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "۔۔۔ استعمال الفاظ خطاب دستور ایں ریاست نبودہ است حسب الترقیم قصیدہ و سلام مذکور در دیوانہا مندرج کنانیدہ خواہد شد۔۔۔ ۲۰ صفر سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۵ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء" میرزا صاحب نے اس فرمان کے جواب میں حسب ذیل قطعہ لکھ کر ارسال کیا (دستنبو ص ۸۴)

ہزار و دو صد و ہشتاد و دو شمار کنند بحسب ضابطہ از ہجرت رسول اللہ
چہار شنبۂ آخر بود ز ماہ صفر کہ می در آورم ایں قطعہ را بنظم بگاہ
سفیدۂ سحری کاغذ است و من راقم سواد صفحہ نمط، رودی بدسگال سیاہ
ہمی نویسم و دو نفس نوشتنم باشد ولی ز بیم لبالب، چو لب بعذر گناہ
خدا کند کہ مشرف شود چو ایں قرطاس بہ پیش مسند عالی ز بندۂ درگاہ
امیر کلب علی خاں بہادر از رہ لطف بسوی غالب خویش جگر کند نگاہ
کہ ایں فلک زدہ گر عرض کرد مصلحتی بزعم بندہ ز اخلاص بود، ور ناگاہ
خلاف طبع مبارک فتاد آں تقریر یکی خطا رود از بندگان دولت خواہ
تو بادشاہ و شہنشاہ تاجدار فرنگ خطاب می طلبد یا دہندہ ز شاہنشاہ

چو رائی من نپذیری، ز جرم من بگذر
بحق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ"

صفحہ ۱۳

(۱) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے ۳۰ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۲ھ (۲۴ اگست ۱۸۶۵ء) کو تحریر فرمایا: "..... صحیفۂ لطف آگیں مجلا صدگی بارش باران رحمت در آں نواح واستفسار اک خیریت مزاج راقم مع قطعہ دعائیہ غازہ آرای چہرہ و محصول نشاط شمول گردید و بدینہا مطلع نمود۔ و ترسیل قطعہ مذکور از مزید الطاف فرمائیہا تصور رسیدہ۔ مشفقا! سابق ازیں فی الحقیقہ طبیعت راقم بعارضۂ تبخیر چیزی کسل مند شدہ بود، لیکن حالا بعنایت الٰہی مزاج مخلص خوش و خرم است۔ ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ برای آں مشفق، کہ بتقریب صحت از ما رضیہ لاحقہ دیگر تما حیاں مستحقین نیز ازیں سرکار عنایت شدہ بود، معطوف رقیمۂ الوداد ہذا بطریق عنایات مسمت تبلیغ یافتہ....."
مرزا صاحب کا یہ قطعہ دعائیہ "غالب نامہ" کے دوسرے ایڈیشن میں محمد اکرام صاحب نے چھاپ دیا ہے۔

صفحہ ۱۴

(۱) مرزا صاحب نے اس جگہ کے علاوہ مکتوب نمبر ۹۰ میں بھی نوازش نامہ لکھا ہے۔
(۲) اس سے نامۂ غالب مراد ہے۔ مرزا صاحب نے فارسی لغت کی مشہور کتاب "برہان قاطع" کے بعض اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ مسمی بہ "قاطع برہان" ۱۸۵۹ء میں تصنیف کر کے نواب فردوس مکاں کی امداد سے شائع کیا تھا۔ اس میں رد و قدح کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا تھا وہ غیر عالمانہ ہی نہیں، کسی قدر سوقیانہ بھی تھا۔ چنانچہ مفتی محمد عباس شوشتری بھی جو مرزا صاحب کے حامیوں میں تھے، ان کے ایک خط کے جواب میں "قاطع برہان" نام کی درشتی و لطف ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا: "..... معنی صاف ہیں، معترض نا الہٰا جات ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خود نام سے نام پیدا ہے، کہ اس نے برہان قاطع کو الٹ دیا۔ ان دونوں کا ایک غلط یہ ہونا ہے، [illegible] ظاہرا اس کا مطلب اور آپ کا مقصد واحد ہے۔ [illegible] جب اس نے غالباً معنی ثانی مراد لیے ہیں اور آپ معنی اول استعمال میں لائے ہیں۔ بہر صورت برہان کی طرف ظاہرہ قاطع کی اضافت ہے، اور اس ترکیب میں سراسر لطافت ہے۔ اس میں کچھ شک و ریب نہیں کہ ایہام میں حسن ہے، کچھ عیب نہیں۔ لیکن تقصیر معاف

ظرافت نہ کی تھی، یہ کیسا کیا درشتی نے آفت کو برپا کیا

(صحف الناس، عباس کے (بیاض قلمی مملوکہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب) سچ تو [illegible] ہندوستانی تقلید کے دلدادہ تھے، اور کچھ اس کا انداز بھی دل آزار تھا، کتاب کے شائع ہوتے ہی مخالفت کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ برہان کے حامیوں نے اس کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان سب سے ایک کا نام "ساطع برہان" تھا۔ اس کے مصنف کے متعلق مرزا صاحب سیاح کو لکھتے ہیں: "وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے۔ وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملا کی [illegible] دانش کا خبط ہے۔ ... رحیم بیگ اس کا نام ہے۔ میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے [illegible] بھی ہے" (اردوئے معلی ۲۷ و ۳۱)

شاکر کو لکھا ہے: "رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اور دل سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ در پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہوا" (عود: ۱۶۱) اس کتاب کے جواب میں میرزا صاحب نے "نامہ غالب" لکھا، اور اس کو ۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۵ء سے قبل طبع کرا کے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں بطریق ارمغان پیش کیا۔ یہ رسالہ عود ہندی (ص ۱۴۱ - ۱۵۵) میں بھی چھپ چکا ہے۔ مولہ جداگانہ مطبوعہ نسخے کی کوئی جلد کتابخانے میں موجود نہیں اور نہ کہیں بازار میں ملتی ہے۔ جناب مختار الدین احمد آرزو صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ اسے مرتب کر کے عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔

(۳) شاہ عباس ثانی، صفوی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا، اس نے سنہ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) سے سنہ ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) تک ایران پر حکومت کی۔ میرزا صاحب کا یہ بیان کہ اس بادشاہ کے عہد حکومت میں ایرانیوں نے داستان امیر حمزہ بنائی۔ کسی طرح درست نہیں۔ (آئین اکبری (۱: ۴۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کی طرح رموز حمزہ کا بھی ایک خوشخط اور مصور نسخہ ۱۲ دفتروں میں تیار کرایا تھا۔ آئین کا سال تالیف بیورج کے بیان کے مطابق ۱۵۹۰ء (۹۹۸ھ) ہے۔ خان عبد المقتدر مرحوم نے کتاب خانہ بانکی پور، پٹنہ (ج ۷: ۴۹) میں لکھا ہے کہ آئین اکبری، اکبرنامہ کی تیسری جلد ہے، اور اکبرنامہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۶ء) میں تمام ہوا تھا۔ بعد ازاں سنہ ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔

شاہ عباس ثانی کی پیدائش کا سنہ ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳ء) ہے۔ مذکورۂ بالا بیان سے واضح ہے کہ شاہ عباس کی پیدائش سے ۳۹ یا ۴۵ برس پہلے رموز حمزہ، اکبر کے کتابخانے میں تیار کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی پرانے نسخے ہی کی نقل ہو گی۔ یہ تو رہا شمالی ہندوستان کا معاملہ۔ کتابخانہ بانکی پور میں ایک کتاب بنام زبدۃ الرموز محفوظ ہے۔ اس کا مصنف حاجی قصہ خواں ہمدانی دیباچے میں لکھتا ہے کہ میں ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں عراق حیدرآباد پہنچا اور سلطان عبد اللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ از سنہ ۱۰۲۰ - ۱۰۸۳ھ = ۱۶۱۱ - ۱۶۷۲ء) کے دربار میں داخل ہوا۔ میں اپنے ساتھ رموز حمزہ کے کئی نسخے لایا تھا۔ بادشاہ کے حضور میں انہیں پیش کیا۔ تو حکم ہوا کہ ان کا خلاصہ تیار کر دو۔ اس حکم کی تعمیل میں یہ کتاب زبدۃ الرموز مرتب کی ہے (فہرست کتابخانہ بانکی پور: ۱۶۹۶ء) اس بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عباس ثانی کی پیدائش سے ۲۰ برس پہلے یہ کتاب عراق سے دکن میں پہنچ چکی تھی اور چونکہ کئی نسخے دکن میں لائے گئے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا قرین عقل ہے کہ عرصے سے ایران و عراق میں اس کا رواج تھا۔

صفحہ ۴۲

(۱) اصل میں الزام ہے

(۲) اس قصیدے کے چند اشعار تذکرۂ انتخاب یادگار میں بذیل ذکر غالب اور پورا قصیدہ سبد چین (ص ۱۸) میں شائع ہو چکا ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے اس نام کا املا اور تلفظ دونوں غلط لکھے ہیں۔ یہ نام "عمرد" بسکون میم در یادۂ واؤ بعد راء ہے میں نے ازراہ احتیاط اعراب کا اضافہ کر دیا ہے تاکہ "عمر" بضم میم و فتح میم سے التباس دور ہو جائے

(۴) "سبد چین" کے دونوں ایڈیشنوں میں "عنطلیہ" ہے۔ اور یہی صحیح ہے، اس لئے کہ رموز حمزہ (ج ۲، جزء ۸، طبع ایران ۱۲۷۸ھ) میں بھی ہر جگہ عنطلیہ ہی پایا جاتا ہے۔

صفحہ ۴۳

(۱) بد اشکل خوشا، بسیار بد۔ (منہ)

(۲) بہارہ مخفف بہاراں (منہ)

(۳) آدم ادباری، ادباریدن بمعنے ناخاسیدہ فرد بردن ادبار صیغہ امر و در آخر تحتانی، مردم آزاری مثلہ (منہ)

(۴) میرزا صاحب نے یہ لفظ بضم الہار لکھا ہے۔ لیکن صحیح "اسپہبد" بفتح الباء ہے۔

صفحہ ۴۴

(۱) فرد ہل بمعنی بگزار۔ از بیجا التزام موقوف است۔ (منہ)

(۲) گزیں بجای گزیدہ مستعمل اہل زبان۔ نمرِ بہ تحتانی مکسور و میم مضموم درفر کی فولا در اگویند و اسم شاہی است از اولاد التقوا۔ و اینکہ جمہور نوبسند، طرز املا ست اعراب بالحرف (منہ)

صفحہ ۴۵

(۱) قرضخواہ کی جگہ قرضدار کا استعمال بے پڑھے لکھوں کی زبان پر آج بھی جاری ہے۔ میرزا صاحب جیسے میں میکہ نکالے والے سے تعجب ہے کہ کس طرح اس کو جائز رکھا۔ چونکہ انھوں نے میر قربان علی بیگ سالک اور تفتہ کے نام کے خطوں میں بھی قرضخواہ کی جگہ قرضدار استعمال کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فصحا کی زبان پر بھی کبھی کبھی یہ غلط لفظ آجاتا تھا۔ ملاحظہ ہو، غالب: ۲۰۳، طبع ثانی و خطوط غالب: ۱۷۱۔

(۲) حکیم میر علی خاں کے متعلق صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ یہ دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ ان کے بیٹے حکیم اسد علی خاں کا ذکر سخن شعرا (ص ۴۱۱) میں مضطر تخلص کے تحت کیا گیا ہے اور انھیں میرزا قربان علی بیگ سالک کا شاگرد لکھا ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں حکیم میر علی خاں بقید حیات تھے۔ ایک حکیم میر علی خاں، حکیم کاظم علی خاں کے والد تھے۔ تو امین العلاج (نمبر ۱۴۳ طب فارسی) نسخے کے آخری ورق پر ان کا نام ملتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دوسرے شخص ہوں اور نسخۂ مذکورہ متن انہیں کا مرتبہ ہو۔

صفحہ ۴۶

(۱) یہاں کوئی ایک لفظ ساقط معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اس عریضے کے جواب میں ۶ ربیع الثانی سنہ ۸۲ھ (۲۹ اگست سنہ ۶۵ء) کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "سہ قطعہ مقاومۂ لطف آگیں، اول مع قصیدۂ نادرہ کہ مضامین عالیش جلوہ ہزاراں دررغرر معانی بود، وثانی مشعر رسید ہنڈوی مبلغ دوصد روپیہ وثالث مثنوی برنسخہ ہائی معجون وغیرہ براہ محبت معنوی مشتوفرہ باسمین ریزگریبان وصول نشاط شمول گشتہ ... حالا مزاج راقم بوجوہ خوش وخورم است۔"

صفحہ ۴۷

(۱) سکندر زمانی بیگم، نواب خلد آشیاں کی اہلیہ کی وفات پر یہ خط اور قطعۂ تاریخ لکھا گیا ہے۔ ان بیگم کے والد صاحبزادہ سید امداد اللہ خاں ولد صاحبزادہ سید کفایت اللہ خاں ولد نواب نصر اللہ خاں بہادر، اور والدہ آفتاب بیگم بنت صاحبزادہ سید کریم اللہ خاں خلف نواب سید فیض اللہ خاں بہادر تخفیف۔ سنہ ۱۲۶۲ ہجری میں ان کے ساتھ نواب خلد آشیاں کی شادی ہوئی۔ نواب سید مشتاق علی خاں بہادر، عرش آشیاں انھیں کے بطن سے تھے۔ (انتخاب یادگار: ۲۲۵، ۲۲۶ و اخبار الصنادید: ۲، ۲۳۰)

(۲) یہ قطعۂ تاریخ دوسرے ورق پر لکھ کر اس عریضے کے ساتھ ملفوف کیا گیا تھا۔ اب سبد چین میں بھی چھپ چکا ہے۔

(۳) استاد سے مراد قلندر بخش جرأت دہلوی ہے۔ اس کا مصرع تھا: "جو تم پھر آؤ تو پیارے پھریں ہمارے دن"۔ میرزا صاحب نے پیارے کی جگہ حضرت کر دیا۔ یہی وہ تغیر لفظ ہے جس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

صفحہ ۴۸

(۱) یہ عریضہ میرزا صاحب نے رامپور سے لکھا ہے۔ اس زمانے میں نواب خلد آشیاں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ میرزا صاحب رضوان کو لکھتے ہیں: "آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں۔ فرما گئے ہیں کہ دو ہفتے میں آؤں گا۔ آکر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمائش گاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے۔" (اردوی: ۲۰۳) حکیم غلام نجف خاں کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ نومبر کی صبح تک واپس تشریف نہیں لائے تھے۔ فرماتے ہیں: "نواب صاحب دورے سے آج شام کو یا کل آجائیں گے جشن جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" (ایضاً: ۲۳۱)

نواب خلد آشیاں نے ۱۰ نومبر کو اس خط کا جو جواب دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے خیریت مزاج معلوم کرنے کے لیے دو عریضے لکھے تھے ان میں سے آخری کے جواب میں سرکار نے تحریر فرمایا کہ: "عنقریب اتفاق مراجعت برامپور خواہد شد"

(۲) صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے متعلق صاحب انتخاب یادگار (ص ۳۰۷) کہتے ہیں:

"نیز، صاحبزادہ محمد ممتاز علی خاں ولد صاحبزادہ محمد اعجاز علی خاں ولد صاحبزادہ نیاز علی خاں

ولد صاحبزادہ حسن علی خاں ولد جناب مستطاب نواب محمد فیض اللہ خاں صاحب بہادر، عرش منزل ، طاب ثراہم ۔ ستائیس برس کا سن ہے ۔ میر احمد علی رسا کے شاگرد ہیں ۔ یہ صاحبزادے نہایت اہلیت شعار ہیں ، خوش خلق و خوش اطوار ہیں ۔ یہ ان کا کلام ہے :

شوق ہر چند یہ کہتا تھا کہ بوسے لیجیے پر ترا نقش قدم مجھ سے مٹایا نہ گیا

صاحبزادے صاحب کو نواب سعید الدین احمد خاں فاروقی کی صاحبزادی منسوب تھیں ۔ اس تقریب سے مراد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ، اور وہیں انتقال کیا ۔

(۳) نواب سعید الدین احمد خاں ، نواب حمید الدین احمد خاں کے بیٹے اور نواب مجید الدین احمد خاں عرف نواب مجو خاں مراد آبادی کے چھوٹے بھائی تھے ۔ ان کے آباؤ اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی عصمت اللہ فاروقی ، نواب عصمت اللہ خاں بہادر کے لقب سے مفتخر اور عہد عالمگیر میں مختلف صوبوں کے گورنر رہ چکے تھے ۔ خود نواب مجو خاں بھی بڑی جاگیر کے وارث تھے ۔ غدر سنہ ۵۷ء میں بجرم بغاوت انھیں پھانسی دے دی گئی اور اس وقت سے اس خاندان پر زوال آ گیا ۔ مراد آباد میں اس خاندان کے اخلاف اب بھی موجود ہیں ۔ نواب سعید الدین احمد خاں کی ایک تصنیف "لب لباب رمل" کتاب خانہ ریاست میں محفوظ ہے ۔ یہ نسخہ بڑے اہتمام سے لکھا گیا ہے ۔ خیال ہوتا ہے کہ خود مصنف نے تیار کرایا ہوگا ۔ دیباچے میں مصنف نے اپنے خاندان کی ابتدائی تاریخ اور بعد ازاں سنہ ۵۷ء میں اس کی بربادی پر ایک مختصر نوٹ لکھا ہے ۔ نواب سعید الدین احمد خاں نے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۳ھ (۲۰ جنوری ۱۸۸۶ء) اور ۱۰ جمادی الاولی سنہ مذکورہ (۱۳ فروری سنہ مذکورہ) کے درمیان انتقال کیا ۔

(۴) لارڈ ولیم بنٹنگ نے دیوانی عدالت میں ہندوستانی حاکموں کے واسطے تین درجے مقرر کیے تھے : (۱) صدر الصدور ، اس کا مشاہرہ ۵۰۰ سو روپے تھا ، اور دیوانی مقدمات میں ججوں کے برابر اختیارات دیے گئے تھے ، (۲) صدر امین ، اس کا مشاہرہ دو سو سے تین سو روپے تک تھا ، اور ہزار روپے تک مقدمات فیصل کر سکتا تھا ، (۳) منصف ، اس کا مشاہرہ سو روپے سے ڈیڑھ سو روپے تک تھا ، اور تین سو روپے تک کے مقدمات فیصل کرنے کا اختیار رکھتا ۔ منصفوں کی ترقی صدر امینی پر اور صدر امینوں کی ترقی صدر الصدوری پر ہوتی تھی ۔ منصف بننے کے لیے وکیل کمیٹی کے سامنے امتحان دینا پڑتا تھا ۔ اس کے بعد ترقی کارگزاری کی عمدگی پر موقوف تھی ۔ تاریخ ہندوستان ، ذکاء اللہ ج ۳ ق ۲ : ۴۹۷ ۔

(۵) مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مراد آباد ولد مفتی ابو المحسن ، بانس بریلی کے باشندے تھے ، علم و فضل کے ساتھ شعر گوئی کا بھی شوق تھا اور سپہر تخلص کرتے تھے ۔ سخن شعرا (ص ۲۱۷) میں ان کا یہ شعر درج ہے ۔

اب جیسی دل میں تھا گلہ کس سے اے امیر زلفوں میں کیوں چھپا تھا یہ کالے بلا ہی دل

ان کی ایک فارسی تصنیف "اصل الاصول" کتاب خانے میں محفوظ ہے ۔ یہ نحو عربی کا ایک رسالہ ہے ۔ جسے سنہ ۱۲۵۳ھ میں تصنیف کیا اور مطبع نظامی کانپور میں سنہ ۱۲[illegible]ھ میں

طبع کرایا تھا۔ ان کے فرزند مولوی نجم الحسن خاں کے مکتوب مورخہ ۲۶ اپریل ۱۸۷۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر الصدور تاریخ تحریر مکتوب سے ۵ سال قبل (تقریباً سنہ ۱۸۷۳ء میں) انتقال کر گئے تھے۔ ان کے برادر خرد مولوی حامد حسن خاں صاحب صدر الصدر فروری سنہ ۱۸۷۸ء میں فوت ہوئے ہیں۔

(۶) نواب مصطفیٰ خاں بہادر، فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر جہانگیر آباد کے جاگیردار اور بڑے صاحب علم و خوش گفتار شاعر تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ (اردوی : ۱۰۱) ابتداءً حکیم مومن خاں سے مشورہ سخن رہا۔ ان کے انتقال کے بعد میرزا صاحب سے اصلاح لینے لگے۔ انہوں نے اردو شعرا کا ایک قابل استناد تذکرہ "گلشن بیخار" فارسی زبان میں تصنیف کرکے خود شائع کیا تھا۔ آشوب غدر میں شیفتہ کو ۷ سال کی سزا ہوئی۔ لیکن آخر کار رہا ہو گئے۔ میرزا صاحب سے ان کے بہت مخلصانہ روابط تھے جب میرزا صاحب قمار بازی کے الزام میں قید رکھے گئے، تو انہوں نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا "حبسیہ" میں میرزا صاحب نے اس خلوص کا اس طرح اعتراف کیا ہے

خود چراغون خورم از غم؟ کہ بہ غمخواری من	رحمت حق بہ لباس بشر آمد، گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسش وی	پایہ خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار من است	گر بمیرم، چہ غم از مرگ؟ عزادار من است

شیفتہ نے ۶۳ سال کی عمر پا کر سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں وفات پائی۔

(۷) میرزا صاحب کو یہ مصیبت رامپور سے واپسی کے وقت برداشت کرنا پڑی تھی۔ دیباچے میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۹۴

(۱) دراصل یہ قطعہ سفر کلکتہ کے سلسلے میں لکھا گیا تھا، چنانچہ رای چھج مل کھتری کے نام ایک فارسی خط میں "پنج آہنگ : ۱۰۰" چھپا بھی چکا ہے۔ لیکن وہاں بجائے "فلیہ لکھ کے" "مطلوب عمم" اور بجائے مصرع ثالث "گو بید زندہ تا بہ بنارس رسیدہ ست" تحریر ہے۔

(۲) لفافے پر ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء تحریر ہے۔

(۳) نواب خلد آشیاں کو میرزا صاحب کے مصائب سفر کی روداد نواب مصطفیٰ خاں بہادر کی زبانی معلوم ہوئی، تو انھوں نے مراد آباد کے پتے پر میرزا صاحب کو تحریر فرمایا: "نواب صاحب، مشفق مہربان، کرمفرمای مخلصاں، سلمہ اللہ تعالیٰ! بعد اشتیاق مواصلت موفور المسرت کہ منتہا و زالتقریر ہے، مشہور روضمیر مودت تخمیر کے ہو۔ زبانی نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر کے دریافت ہوا کہ مراد آباد میں کچھ طبیعت آپ کی علیل ہو گئی ہے۔ باستماع اس امر کے باعث کمال تردد کا ہوا۔ اس واسطے حوالہ خامہ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ حال خیریت مزاج سے مطلع کیجئے۔ اور اگر ہنوز طبیعت مائل بہ اعتدال نہ ہو، اور آپ کا ارادہ قیام مراد آباد کا تا درستی ہو، تو آپ رام پور میں تشریف لائیے۔ یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئیگا، فقط زیادہ جمعیت اور فرحت ظاہر ہو۔ المرقوم ۷ شعبان سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق

۵ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء محمد کلب علی خاں"۔

مثل میں اصل فرمان موجود اور اس کے لفافے پر تحریر ہے کہ "خط ہذا ہرکارہ بہ مدد از مرادآباد بجہت تشریف فرما شدن مرزا نوشہ صاحب بہ دہلی واپس آورد۔ مرقوم ۱۲ شعبان سنہ ۸۲ھ"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کو فرمان موصول نہ ہوا۔ مگر اس عرصے میں ان کا عریضہ (۶۰) رامپور پہنچ گیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۱۵ جنوری کو تحریر فرمایا: "جو کہ وقت اطلاع انحراف طبیعت آپ کے مرکز اعتدال سے بمقام مرادآباد رقیمۂ الوداد اس مضمون سے کہ اگر ارادہ قیام مرادآباد کا واسطے معالجے کے ہو تو رامپور کو معاودت کیجیے، یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئیگا۔ بہ دست ہرکارہ کے بھیجا گیا تھا۔ لیکن آپ وہاں سے روانہ دہلی کے ہوگئے تھے ہرکارہ خط واپس لایا۔ اس روز سے کمال انتظار وصول مفاوضۂ خیریت کا تھا۔ الحمدللہ کہ وصول صحیفۂ لطف آگیں باعث اطمینان ہوا۔" میرزا صاحب کا عریضہ (۶۱) اسی فرمان کا جواب ہے۔

صفحہ ۵۰

(۱) غلام نوخرد سے حسین علی خاں مراد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے ۲۱ جنوری کے عریضے کے بعد کوئی اور خط بھی لکھا تھا، جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ کی استدعا کی گئی تھی۔ مثل میں یہ خط اور اس کا جوابی فرمان دونوں موجود نہیں ہیں، اس لیے سوال و جواب کی نوعیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال موجودہ مراسلت میں یہ پہلا عریضہ ہے۔ جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ کا ذکر کیا ہے۔

(۲) آل محمد مارہروی نے دیوان تواریخ (۱۶۴) میں ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے، جس کا عنوان ہے: "تاریخ کر شدن مرزا اسداللہ خاں، المتخلص بہ غالب والمشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی"

خود قطعہ یہ ہے۔

کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ — بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے!
دوستو! تاریخ اس کی عجب ہے — یوں سنی نیر نے کہ "غالب کر ہوئے"!!

اس مادہ تاریخ سے اعداد ۱۲۷۴ نکلتے ہیں، جو سال ہجری ہے اور ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء تا ۱۷ اگست سنہ ۱۸۵۸ء سے تطابق رکھتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آئندہ عرض کروں گا۔ یہ تاریخ ایک غلط فہمی کی بنا پر نکالی گئی ہے۔ دراصل میرزا صاحب اس سے برسوں پہلے بہرے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو تفتہ کے نام کے خط میں لکھتے ہیں: "بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں" (اردوی: ۳۱)، یکشنبہ ۱۹ دسمبر سنہ کو منشی نبی بخش کے خط میں، جن کی بینائی میں ضعف آگیا تھا، لکھتے ہیں کہ: "کاروان بارا ہمیں شنیدن و دیدن و گفتن و رفتن متاع است، چرا تنبا راج نرود۔ یکی را گوش گران است، تا ہمنشیں چہ سراید؟ یکی را چشم نگران است تا کہ را آید" (باغ دو در: ۶۱ الف)۔ بہرے ہونے کی تاریخ سے متعلق ان کے لفظی اور تصریحی بیانات ہیں۔ لیکن ہم اس تاریخ کو آگے پیچھے جا سکتے ہیں۔ ایک فارسی خط میں شفق کو تحریر کیا ہے: "اکنون کہ دندان فرو ریختہ، و گوش گراں گشتہ، موی سپید است، از دوری بر آتش تنگ، دستا بلرزہ اندر است، و پای در رکاب" و نیچ آہنگ:

۴۸۴، طبع دوم) اس خط میں جوانبخت کے سہرے کا قضیہ دہرایا ہے۔ میرزا صاحب کا سہرا، ذوق کا جواب اور میرزا صاحب کی معذرت، یہ سب دہلی اردو اخبار، مورخہ ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۸ھ (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔ غالباً اس اخبار کو پڑھ کر شفق نے استفسارِ حال کیا، اور یہ سب کچھ اس واقعے کے فوراً بعد پیش آیا، اس لیے کہ میرزا صاحب نے بیان واقعہ سے پہلے لکھا ہے: "ورنہ دیدہ دران از دوربینگرند کہ نامہ نگار را مژہ خوں فشان است و دل دردمند"۔ ظاہر ہے کہ دل کی دردمندی اور مژہ کی خوں فشانی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی، اور کچھ ہو بھی، تو اتنی تو یقیناً ہوگی کہ اسے ایسے پُردرد انداز سے بیان کیا جائے۔ لہٰذا میرزا صاحب کو سنہ ۱۸۵۲ء کے آخر کی بجائے ابتدا میں بہرا ہونا چاہیے۔

سرور نے خط میں فرماتے ہیں: "میں پانچ سات برس سے بہرا ہو گیا ہوں"۔ (عودہ: ۱۱۱) یہ خط ان کے نام کے خطوں میں دوسرا ہے، اور تیسرا خط پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا تھا۔ اسی بنا پر اسے بھی ۱۸۵۸ء ہی کا ہونا چاہیے۔ اگر یہ صحیح ہے، تو پھر میرزا صاحب کے اس تخمینے کے پیشِ نظر انھیں ۱۸۵۱ء میں بھی ثقلِ سماعت کا مریض ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب ایک فارسی قصیدے میں، جو واجد علی شاہ کی مدح میں اور کلیات (ص ۳۲) میں چھپ چکا ہے۔ فرماتے ہیں:

نغان ز پیری و رنجوری و گرانیِ گوش	کہ کرد ایں ہمہ دشوار کار آسان را

یہ قصیدہ میری رائے میں سنہ ۱۸۴۹ء کے آخر میں لکھا گیا ہے، اس لیے کہ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

کہ گفتہ است در آئینِ بزمِ سور و سرور	کہ فرخی نبود روزہای آبان را
من از درازیِ شبہای قوس بیزارم	کہ بہر انجمن آرد فلک زمستان را
خوشا درازیِ شب زانکہ گر بود تاریک	درنگ در نظر افزون بود چراغان را
وگر بود شب مہ، نیز بزمِ عیش آرای	بجرعہ دیر نگہدار ماہِ تابان را

قطب الدولہ کے نام کے ایک خط مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۴۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے یہ قصیدہ میر احمد حسین میکش کے ہاتھ قطب الدولہ کے پاس بھیجا تھا (باغِ دودر، ۹۵ الف)۔ منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام کے ایک خط مورخہ ۲۰ فروری ۱۸۴۹ء میں میرزا صاحب نے یہ لکھا ہے کہ میر احمد حسین کہ ہمنوائی شما است و میکش تخلص می کند، بہ لکھنؤ رفتہ است۔ در ہر نامہ کہ بمن می فرستند، بشما سلام می نویسد (ایضاً: ۹۵ ب)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میکش فروری سے خاصا قبل لکھنؤ جا چکے تھے۔ چونکہ مذکورۂ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ لکھتے وقت ماہِ آبان کی راتیں تھیں، اور آفتاب برجِ قوس میں تھا۔ اور آبان ایرانی سال کا آٹھواں مہینہ اور نومبر کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے قصیدے کو نومبر ۱۸۴۸ء میں لکھا جانا اور میرزا صاحب کو اس وقت بہرا ہونا چاہیے۔

میرزا صاحب نے ایک فارسی قصیدہ آزردہ کی مدح میں لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

نالم از درد دل، اما چارہ چون خواہم ز کس   من کہ نتواند بگوش من رسد آوای من

اس شعر میں اپنے ضعف کا بمبالغہ بیان مقصود ہے۔ یعنی میرا حال کمزوری سے یہ ہو گیا ہے کہ منہ سے آواز نہیں نکلتی یا نکلتی ہے تو بہت پست۔ حتیٰ کہ میں خود اسے نہیں سن سکتا، پھر ایسی حالت میں کسی سے کیا اعانت کی امید رکھوں۔ وہ میری کب سن سکے گا۔ جو مدد کو آگے بڑھے۔ مگر میرا خیال ہے کہ میرزا صاحب نے یہ مضمون اپنے بہرے پن کی حالت سے پیدا کیا ہو، تو کچھ بعید نہیں۔ اگر یہ خدشہ درست ہے، تو انھیں ۱۸۴۵ء (۱۲٦۱ھ) سے قبل بہرا ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ قصیدہ سنہ مذکور کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہونے کے باعث اس سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

نتیجہ بحث یہ ہے کہ میرزا صاحب سنہ ۱۸۵۲ء میں بالیقین بہرے تھے سنہ ۱۸۴۹ء میں گمان غالب ہے کہ بہرے ہوں اور سنہ ۱۸۴۵ء میں اُن کے بہرے ہونے کا احتمال ہے۔
آل محمد مارہروی کو یوں غلط فہمی ہوئی کہ میرزا صاحب نے سرور کے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کے خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کرکے لکھا تھا: "اگرچہ تریسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں۔ پر بینائی میں فتور نہیں"۔ (عود: ۱۳) اس سے میرزا صاحب کا مقصد صرف یہ تھا کہ گو بہرا ہوں، مگر اس بڑھاپے میں نگاہ تیز ہے۔ آل محمد صاحب یہ سمجھے کہ ٦۳ برس کی عمر میں بہرا پن شروع ہوا۔

(۳) میرزا صاحب نے ۱۵ فروری ۱۸٦٦ء کو یہ شکایت نواب خلد آشیاں کو لکھی ہے۔ "۱۲ مئی سنہ مذکورہ کو ذکا کے خط میں لکھتے ہیں کہ "رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ وضعف بصر"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کی بینائی میں فرق، رامپور سے دلی واپس چلتے ہوئے جو تکلیف میرزا صاحب نے اٹھائی تھی، اس کے باعث پیدا ہوا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ میرزا صاحب ہی نے ۱۴ رجب ۱۲۸۱ھ (۱۴ دسمبر ۱۸٦۴ء) کو تفتہ کو لکھا ہے: "سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا"۔ (خطوط: ۱/ ۹٦) چونکہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے لکھے ہوئے خط بنام سرور میں صاحب عالم کو مخاطب کرکے میرزا صاحب لکھ چکے ہیں کہ "اگرچہ ٦۳ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں، پر بینائی میں فتور نہیں۔ عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں"۔ اس لئے انھیں اس تاریخ کے بعد اور تفتہ کے نام کے خط کی تاریخ ۱۴ دسمبر ۱۸٦۴ء کے درمیان کسی وقت اس شکایت میں مبتلا ہونا چاہیے۔ اور اس صورت میں ۱۴ مارچ ۱۸٦٦ء کو ان کا یہ لکھنا کہ "امراض قدیم بڑھ گئے۔ دوران سر، رعشہ اور ضعف بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں"، امنافی نہایت ظاہر کرتا ہے۔

(۴) نیز ملاحظہ ہو عود ہندی مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۸٦٦ء

صفحہ ۵۱

(۱) میرزا صاحب نے ۱۲ مئی سنہ ۶۶ء کے ذکا کے نام کے ایک خط میں اس سے ملتے جلتے الفاظ میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: "آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے" (اردوئ: ۳۸)

(۲) یہ غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے اور سبد چین کے پہلے ایڈیشن میں چھپ چکی ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے ازراہ سہو بحر رمل مثمن مخبون کو، ہزج مثمن سالم لکھ دیا ہے میر شمس الدین فقیر دہلوی نے رسالہ قافیہ (ورق ۱۹ الف) میں لکھا ہے: "بحر رمل مثمن مخبون، مثالش سعدی گوید۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم | چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

والیضاً سعدی گفتہ۔

مردماں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید از دل تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

تقطیعش بہشت فعلاتن تمام می شود۔ ازاں جملہ رکن صدر فاعلاتن آمدہ باقی ہمہ مخبون در صدر و ابتدای ایں وزن اگر سالم بجای مخبون آرند یا بالعکس جائز است۔ پوشیدہ نماند کہ ایں وزن مشتبہ می گردد بہ بحر بسیط مقطوع، زیرا کہ قطع چوں در متفاعلن در آید، مفاعل بسکون لام می شود۔ و آں را بہ فعلاتن منقول می سازند۔ اما چوں فعلاتن از فاعلاتن مخبون بے نقل حاصل می شود، اعتبار نمودنش از بحر رمل اقرب در صواب است۔"

صفحہ ۵۲

(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۱۵ مئی سنہ ۱۸۶۶ء تحریر ہے۔ غالباً دوسرے دن ڈاک میں بھیجا گیا تھا

(۲) بادشاہ دہلی سے بہادر شاہ ظفر مراد ہیں۔ میرزا صاحب کی ملازمت کی تفصیل کے لئے تعلیقات قلعہ معلیٰ دیکھئے۔

صفحہ ۵۳

(۱) ند آگرے کو سہواً مکرر لکھ دیا ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "میری" لکھا ہے۔

(۳) یہ غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے۔ اس کے جواب میں صفحہ ۲۰۳ میں (۲۳ جون سنہ ۱۸۶۶ء) کو خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "مفاوضۂ عدیم المعاوضہ مع غزل حسن التماس بہجت آپ کے وصول سے شادمانی کا لایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سبحان اللہ مضمون اور طرز ہر ایک شعر غزل مذکور کا بہا عدیم المثال ہے۔

صفحہ ۵۵

(۱) منشی سیلچند کے لیے ان کے نام کے خطوط سے قبل کا نوٹ ملاحظہ فرمایئے۔

صفحہ ۵۶

(۱) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۸ ستمبر ۶۶ء

(۲) نواب خلد آشیاں نے ۱۳ ربیع الثانی سنہ ۸۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۶۶ء) کو جواباً تحریر فرمایا "اس صورت میں رسید ثانی ضرور نہیں ہے۔ اور حسب الایما واسطے بھیجے جانے ہنڈوی مشاہرہ آپ کے اس طور پر کہ تاریخ پہلی یا دوسری تک آپ کے پاس پہنچ جایا کرے حکم بنام اہالی سررشتہ کے صادر ہو گیا ہے"

صفحہ ۵۷

(۱) بدر الدین محمد چاچی، چاچ (تاشقند) کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمد بن تغلق (۷۲۵-۵۲ھ) کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور اس کی مدح سرائی میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا۔ سلطان محمد بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے ان کی کافی قدر و منزلت کی اور "فخر الزماں" خطاب دیا۔ بدر نے سنہ ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں انتقال کیا۔ ان کے قصائد شہرت عام کے مالک ہیں۔ اور برسوں درسیات فارسی میں شامل رہے ہیں لیکن تلمیحات و کنایات کی افراط کے سبب سے بدر کے کلام میں لطف کم ہے۔

(۲) میرزا طاہر خاں، وحید تخلص مشہور شاعر اور نثار اور قزوین کا باشندہ ہے۔ سنہ ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں شاہ عباس صفوی نے اپنا مجلس نویس مقرر کیا۔ سنہ ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں وزیر بنایا گیا اور ۱۸ سال تک اس عہدے پر رہا۔ عماد الدولہ خطاب غالباً اسی عہد کی یادگار ہے۔ تاریخ ایران مشہور بہ تاریخ طاہر وحید کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طاہر کو نثر نویسی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ لیکن اشعار کی شہرت صرف عہدہ وزارت کی بدولت ہوئی۔ اس نے مجمع الشعراء کے نام سے ایک تذکرہ شعراء بھی لکھا تھا جس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کرزن کلکشن میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے کہ تقریباً سنہ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں انتقال کیا۔

(۳) میرزا جلالائی طباطبائی اصفہان کا باشندہ ہے۔ سنہ ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۳ء) میں ہندوستان آیا، اور شاہ جہاں کے دربار کا مورخ مقرر ہوا۔ ابھی ۵ سال کی تاریخ لکھنے پایا تھا کہ حاسد نے سازش کی اور کام ہمیشہ کے لئے رک گیا۔ جلالا انشاء میں خاص طرز کا مالک ہے یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ میرزا صاحب نے طباطبائی کو سہواً "طبائی" لکھ دیا ہے۔

(۴) اعجاز خسروی ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی شاعر و نثار حضرت امیر خسرو دہلوی متوفی سنہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کی تصنیف ہے۔ یہ نثر مرصع کی ممتاز کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے

(۵) ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے بیٹے اور دہلی کے آخری بادشاہ ظفر کے باپ تھے، رمضان سنہ ۱۱۷۳ھ (۲۳ اپریل ۱۷۶۰ء) کی تاریخ کو پیدا ہوئے اور رمضان ۱۲۲۱ھ (۱۹ نومبر سنہ ۱۸۰۶ء) ہی کو ۴۸ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے

بیٹھے، ۱۱ور ۳۱ سال ۹ ماہ ۱۲ دن سلطنت کرکے ۲۸ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۵۳ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو جمعے کے دن فوت ہوگئے (مفتاح التواریخ: ۳۷۵) اکبر شاہ اپنے والد کی طرح شاعر بھی تھے اور "شعاع" تخلص کرتے تھے۔ شاہ عالم کا مجموعۂ کلام فارسی و اردو و ہندی موسوم بہ نادرات شاہی، کتاب خانہ رامپور کی طرف سے طبع ہوچکا ہے۔

(۶) میرزا صاحب کا یہ عریضہ نواب خلد آشیاں کے فرمان مورخہ ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کا جواب ہے۔ القاب و آداب کے بعد نواب صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"۔۔۔۔۔ دریں ولا تقریظ شرح قصائد بدر چاچی از نوک قلم جلوہ خیز گردیدہ۔ اولاً بر دیباچہ مولوی عبدالرحمن وحید و مابقی بر طرز جلالائے طبا طبائی نگاشتہ ام۔ چوں زیور اصلاح در گنج خانۂ عالی طبیعت آں استاد زماں مخزون ست، بہمیں نظر آں نقش باطل را مرسل ساختہ، مرقوم کہ آنچہ فطرت کمالات پسر شمار نہ پسندد، خامۂ اعجاز نگار را بر ہر چہ تا نبیہ علاوہ ازیں مجموعۂ پریشانی بہ مثالیش تکلیف تحریر دہند و بہ اسرع از منہ دیدہ سفیدان ایں دیار را از سرمۂ جواہر آگیں جواب باصواب مسرور و شاد ماں سازند۔"

شرح قصائد بدر چاچی، جس کا فرمان میں ذکر ہے، مولوی محمد عثمان خاں بہادر مدار المہام کی تصنیف ہے۔ خان موصوف نواب خلد آشیاں کی خدمت میں زمانۂ ولیعہدی سے آمد رفت رکھتے تھے۔ زبان فارسی اور حساب وغیرہ سے بخوبی واقف اور قدرے عربی آشنا تھے۔ جب نواب صاحب تخت نشین ہوئے تو ان کا تقرب اور رسوخ یہاں تک بڑھا کہ ریاست کے مدار المہام بنا دیئے گئے۔ مزاج میں قدرے درشتی اور جبر تھا۔ اس وجہ سے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کو جامع مسجد کے اندر جلسۂ میلاد النبی کا انتظام کرتے ہوئے نادر شاہ خاں نامی ایک پٹھان کے ہاتھ سے چاقو کا زخم کھا کر انتقال کرگئے۔ میاں منصور علی صاحب منصور رامپوری نے "رخصت" مادۂ تاریخ نکالا۔ اخبار الصنادید (۲: ۱۵۲-۱۵۶) میں گیارہ تاریخ کو زخمی ہونا اور بارہ کو وفات لکھی ہے۔ ان کے خاندان کی ایک مستورۂ محترمہ کا بیان بھی یہی ہے۔ مگر جعفر عرشی نے بزرگان شہر سے پرس وجو کی تو بالاتفاق سب نے یہی بتایا کہ ہمیشہ سے ۱۲ ربیع الاول ہی کو جلسۂ میلاد النبی ہوا کرتا ہے، اور یہ واقعہ سب کے نزدیک جامع مسجد کے اندر جلسے میں پیش آیا تھا۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ مولوی نجم الغنی خاں مرحوم کی تحریر انھیں محترمہ کے بیان پر مبنی ہے جو ان کی رشتہ دار تھیں۔

(۷) اس نثر سے مذکورہ بالا تقریظ شرح قصائد چاچی مراد ہے۔ مثل میں یہ نثر موجود نہیں ہے اس لئے میرزا صاحب کے مواقع اصلاح معلوم نہیں ہوسکے۔

صفحہ ۵۸

(۱) نواب صاحب نے ۱۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کے فرمان میں (جس کا کچھ حصہ ۱۳ اگست کے عریضے کے حاشیے میں نقل کیا جاچکا ہے) میرزا صاحب کو تحریر فرمایا تھا: "۔۔۔ مطلب دگر، چوں کہ راقم کو ترتیب بیاض اشعار منتخبۂ اساتذۂ فارسی

دار دو کی منظور ہے" اس واسطے جو الہ خاطر محبت انکا کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوان فارسی واردو اپنے کا فرماکر مع انتخاب کلام ضیاء الدین خاں صاحب لطف کریں، تا شامل انتخاب کے جو اس سرکار میں عمل میں آیا ہے، ہو جائے"۔ میرزا صاحب نے حسب الحکم اردو دیوان کا انتخاب ۱۸ ستمبر کو اور فارسی کلیات کا انتخاب ۲۴ ستمبر کو ارسال کیا۔ یہ دونوں انتخابات جو حسب الحکم فرمان مورخہ ۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۶۶ء) اس تاریخ سے قبل موصول ہو چکے تھے، کتب خانہ سرکاری میں محفوظ تھے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ضروری حواشی اور مقدمے کے ساتھ "انتخاب غالب" کے نام سے ان کو یکجا شائع کر دیا گیا ہے۔ نواب صاحب کے پسندیدہ اشعار کی کئی چھوٹی چھوٹی بیاضیں کتب خانے میں محفوظ ہیں، مگر ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ سب یا کوئی ایک مذکورۂ بالا بیاض ہے۔

(۲) نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ و جاگیر دار لوہارو کے خلف اصغر تھے۔ ان کی چچازاد بہن غالب سے منسوب تھیں۔ اس نسبتی رشتے کے علاوہ اہم رابطہ یہ تھا کہ نواب صاحب فنِ شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ یہ فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے (اردوی: ۰۰ ا ۲) ان کی سلامتِ ذوق و حسنِ طبیعت کے میرزا صاحب اس درجہ معترف تھے کہ انھیں اپنا نمونہ کہتے تھے۔ کلیاتِ فارسی میں انکی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں۔

نکتہ شیوہ، شاگردِ من یمن ماناست صنم بصورتِ خودی تراشد آذرِ من
اگرچہ اوست ارسطوی و من فلاطونم بود بپایہ ارسطوی من سکندرِ من

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر ادب، تاریخ، حکمت، سیاستِ مدن اور جغرافیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے الیٹ صاحب کو تاریخِ ہند کی ترتیب میں بہت مدد دی تھی۔ ان کے کتب خانے کے متعلق میرزا صاحب لکھتے ہیں: "میرا ایک نسبتی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مجمعِ نثر ہی اور کلیاتِ نظمِ فارسی اور کلیاتِ نظمِ اردو سب اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتابخانہ کہ ڈر کر عرض کرتا ہوں ۲۰ ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا۔ ایک ورق نہیں۔" (اردوی: ۲۹) نواب ضیاء الدین خاں بہادر نے سنہ ۱۳۰۲ھ ہجری (۱۸۸۴ء) میں وفات پائی مجروح نے مصرع "اب نہ باقی رہی وہ رونقِ شہرِ دلی" سے ہجری سال نکالا ہے (تاریخِ لطیف: ۱۴۲)

(۳) میرزا صاحب نے یہاں "احسن" لکھا ہے، مگر اوپر غزلوں کا ذکر ہے، اس لیے "ان" ہونا چاہیے۔

(۴) [illegible] مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۶۶ء

(۵) [illegible] نے ۱۲ مئی ۶۶ء کو ذکا کے خط میں لکھا ہے کہ: "رامپور کے سفر کا رہ آورد رعشہ و ضعفِ بصر"۔ خلد آشیاں کے ۱۸ نومبر سنہ ۶۶ء کے خط میں اس بیماری کا ذکر کرکے پھر ۱۴ مارچ ۶۷ء کو لکھا کہ "دورانِ سر، رعشہ اور ضعفِ بصر، نئی بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں"۔

لیکن میرزا صاحب کی اس بیماری کا پتا مارچ ۱۸۵۲ء میں بھی چلتا ہے۔ شیفتہ کے نام کے فارسی خط میں جواں بخت کے سہرے کا جھگڑا بیان کرکے لکھا ہے کہ: "اکنوں کہ دنداں فرو ریخت، و گوش گراں گشت، موی سپید است و روی پر آژنگ، دست بلرزہ اندرست و پای در رکاب" (پنج آہنگ: ۸۱۴، طبع دوم)۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں جب کہ ان کی عمر ۵۴، ۵۵ برس کی تھی، چند دانت گر چکے تھے، کان بہرے ہو گئے تھے، اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ لہٰذا میرزا صاحب کا رعشے کو نئی بیماری کہنا درست نہیں معلوم ہوتا۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ یہ رامپور کے سفر کی سوغات ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہاں سے واپسی میں جو دکھ اٹھایا تھا اس کے نتیجے کے طور پر اس مرض میں زیادتی ہو گئی ہو۔

(۶) نیز ملاحظہ ہو عریضہ مورخہ ۱۳ اگست ۱۸۶۶ء

(۷) یہ فارسی کے محاورے، "نشان دادن"، بمعنی پتا بتانا کا ترجمہ ہے۔

صفحہ ۵۹

(۱) یہ عریضہ نواب صاحب کی اس تحریر کا جواب تھا: "۔۔۔۔۔۔ نامۂ محبت آمیز مع تقریظ بدر چاچی و مضامین اصلاح آگیں سرمۂ کش چشم وصول گشتہ روشنی بخش عیون دیدہ سفیدان انتظار گردید۔ چنانچہ لنظیر ہمہ الفاظ کہ شاید مجا لتاً با معان نظر ملاحظہ نشدہ مرسل داشتہ ام چشم کہ اگر اقوال این ہمہ اساتذہ قابل اعتبار باشد فبہا۔ والا لعدمشاہدہ از چگونگی آں مطلع سازند۔ المرقوم ۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء"

آشیاں چیدن: عرفی، بیت

آشیاں از خس و زاغ بچیدم بر سر   سر فتدم ساختہ بر خار مغیلاں رفتم

عذرا: زن دوشیزہ، و عذاری بفتح الزاء و کسرہا و عذرا داستا جمع۔ از منتہی الارب۔ از فرہنگ جہانگیری: "ارژنگ چہار معنی دارد، اول بمعنی ارتنگ است کہ مرقوم شد، دوم نام مصوری بودہ ما نند مانی، و سوم نام دیوی، چہارم نام پہلوانی از توران۔ ارتنگ نگارنامۂ مانی نقاش، و گاہ ارتنگ بہ مانی اطلاق کنند" آغاز دیباچہ: "کہ کاخ دماغ صدر نشینان محفل سخندانی را بہ نقوش خیالات رنگارنگ رشک ارژنگ مانی ساخت" پس مانی ارژنگ بمعنی مانی نگار خانہ بودہ است۔ و در کلام اہل ولایت نیز ملاحظہ رسیدہ

(۲) کتاب خانے کے پرانے کاغذات میں ایک ورق دستیاب ہوا تھا جس میں شیر کے فارسی اردو اشعار سیدھے قلم سے خط لکھنے کے باریک نیلگوں کاغذ پر درج ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ انھیں اوراق کا بکس ماندہ ہے، جن کے ارسال کرنے کا میرزا صاحب نے ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں ایک سہ ورقہ مولوی مہدی علی خاں مرحوم (تحویلدار کتب خانہ) کے کاغذات میں سے دستیاب ہوا جس پر یہی اشعار کسی منشی کے ساتھ مندرج ہیں۔ یہ اول الذکر کی نقل معلوم ہوتی ہے اور اسی طرح کے کاغذ پر زیادہ خوشخط قلم سے تحریر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نقل رامپور میں سرکار کے حضور میں پیش کرنے کے لیے تیار کی گئی ہوگی۔ ان اشعار

کے علاوہ نیر کا ایک فارسی قصیدہ بھی کتابخانے میں محفوظ ہے۔ یہ لارڈ رپن کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ اور نیر کے بہترین کلام میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے اشعار مذکورہ کے بعد اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مرسلہ شعر حسب ذیل ہیں:

غزلیات فارسی

گوئی کہ فیض حق رسد ناگہاں رسد
خوش طالعی کہ جذبۂ شوقی بجاں رسد

لذت شناس بیم بلا، ز ورق امید
در چارہ موجہ افگند ار بہ کراں رسد

ہاں نالۂ رسا، سر موجی کہ از سپہر
در گوش خلق زمزمۂ الاماں رسد

حاجی بپای مزد بہ دار السلام شد
ساقی بدست رنج بدار الاماں رسد

گریم چو ابر بو کہ بدان کوی جسم زار
چوں خس، بپای مردی آب رواں رسد

بر رغم محتسب سر بازار در کشیم
گر ساغری ز پیر مغاں ارمغاں رسد

نیر بر آسماں بنہم باز پای ناز
گر ایں سر نیاز بر آں آستاں رسد

ایضاً

از دیدہ و دل ارزش لعل و گہر افتاد
تا آبلہ در سینہ و خون در جگر افتاد

اشکی کہ نہ در پای تو از چشم تر افتاد
در دیدۂ صاحب نظران از نظر افتاد

عطار و دم دشنہ و حلاج و سر دار
در موقف تسلیم چو خونہا ہدر افتاد

گردم سر پا لغز تو، ای ساقی بدست
می در قدحم از دگراں بیشتر افتاد

گر شد ہنرم عیب ز دازدی طالع
از بہر چہ عیبم نہ بجائی ہنر افتاد

نیر کشدم نازکی ساعد قاتل
با بخیہ گر از ہر درز انیا زخم دگر افتاد

ایضاً

گر نباشم بدر دوست گدائی کم گیر
در بہیرم بریہش، بی سر و پائی کم گیر

نقش امید اگر جلوۂ دلخواہ نداد
از سر لوح ازل حرف کذائی کم گیر

زشت دانستہ اگر دست کشیدی ز جفا
از جفاہای ندانستہ جفائی کم گیر

زخم گر بہ شدنی ہست و نمک پیدا نیست
مرضی بیشتر انگار و دوائی کم گیر

غیر در خلوت دلدار اگر راہ نیافت
از بلاہای شب ہجر بلائی کم گیر

مادر دہر نزاید سپس از سہ مولود
مشت خاکی و گیاہی و ہوائی کم گیر

گر فرو ریزد اساس کہن چار ارکان
اشکی و آہی و سوزی و ہبائی کم گیر

گر فرو بست لب از حرف حقیقت نیر
از چمن بلبل آشفتہ نوائی کم گیر

ایضاً

بنیش در میکدہ سر بجنبیدن دہیم
نشۂ اقبال را اوج رسیدن دہیم

ریزش خون از دو چشم ز رفتنگ ما بگشت
با ہمہ تن خون شویم، داد چکیدن دہیم

تا دگر خنجر خوارہ آتش بر نکشیم از جگر
بلکہ لب زخم را ذوق مکیدن دہیم

تیرے غصے نے ایک دم میں کیا — مردۂ صد ہزار سال ہمیں
نقص سے رنج کچھ نہیں رخشاں — حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

ایضاً

شاید بہار آئی کہ جو پہنچے جنوں — پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تار تار
سر پیٹے، سینہ کوٹے، کہ افسوس ہیں ملے؟ — عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار
رخشاں پہ غصہ، ہلس کے ملنے سے کیوں ہوئے؟ — ملتے ہی ہیں ہم، ہیں عیار، یار یار

ایضاً

چاک بخیسر مرا گریباں ہے — دل کا مضطر مرا گریباں ہے
لاغری میں بریدہ ناخن سے — مختصر تر مرا گریباں ہے
رات سینے سے سینہ کس کا ملا — کہ معطر مرا گریباں ہے
چاک کرنا جگر کا سکھلایا — میرا رہبر مرا گریباں ہے
سر آوارگان دشت پر — سایہ گستر مرا گریباں ہے
پھر بہار آئی، اب جنوں کا ہاتھ — اور یہ تیرا مرا گریباں ہے

ایضاً

کیا پہنچے تو، فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو — بیت الصنم ہے، شیخ، خدا کا یہ گھر نہ ہو
رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں آپ — آنکھوں میں آ گیا کوئی [illegible] نہ ہو

ہو

سحر کہ باد سحر در دمید جان در تن — بنور صبح، نمود دم دو دیدگان روشن
چہ صبح؟ صبح دل افروز روزگار بہار — چہ بار؟ باد روان بخش نوبہار چمن
سحر کشیدہ برخ غازہ از نمود شفق — صبا دمیدہ بہ گل ردح از نسیم سمن
فروغ صبح بدیدہ کشیدہ سرمۂ نور — کہ خواندہ گشت [illegible] سر نوشتہ لعلن
نسیم باغ بچیدہ گشادہ طبلہ عطر — کہ تودہ تودہ سمن ریختہ است و گل من من
زبان زموج نسائم لبسان باغ ارم — جہان زجوش شمائم [illegible] منن
بویژہ بلدہ دہلی خلد عدن سواد — کہ گفتہ ذرہ خاکش ہم ارز در عدن
چہ دہلی؟ آں کہ ز فرط شگفتگی زمیں — تو دہ زخندۂ گل قہقہہ بردی چمن
چہ دہلی؟ آں کہ بہ ہر وقت بودہ دار الملک — ز روزگار مغل تا زمان حیر جو دمعن (۱)
چہ دہلی؟ آں کہ بود پای تخت ہندستان — چنانکہ مملکت انگلینڈ را لندن
چہ دہلی؟ آں کہ ز معموری مدارس بود — علوم مشرقی جملہ قسم را معدن
چہ دہلی؟ آں کہ ز آموزش صناعت بود — مدار جملہ ہنرہا و مرکز [illegible] فن
ز نقش نقشہ درایان، دم جبیں سائی — ستارہ زار شدی صحن موقع (۲) [illegible]
ز بوسہ لب پایان خوردہ [illegible] رایان — شدی بسنگ درش شبہہ عقیق یمن
سپاس حق کہ دگر یافتہ ہمسان عظمت — زخیر مقدم گیہان خدیو لارڈ ریپن

(۱) راجہ کیرداں یا نذداں (۲) کلمہ ہندیست بمعنی بار دادن ملیکن مستعمل فارسی زبانان مدح سرای ملوک ہند است۔

بدان مشابه که روز جلوس قبلا خان(۱)   نشد مزیّن و بازیبا بلدهٔ پیکن(۲)
بدان نمونه که بر توپی(۳) شده است آیین بند   دمی درو ده مظفر شهنشه جرمن
بگونه گونه نمایش گرفته آرایش   چه باره دور شهر و چه کوچه و برزن
خلائق از پی دید شکوه استقبال   شتافته خیز روان سوی ریل اسٹیشن
چه موج باد، همه ره سپر، چه خیل دعام!   چو سیل آب همه قطره زن، چه مرد و چه زن!
بقطع راه یکی بر دگر تقدم جوی   شمرده خار و خس راه اطلس و ادکن
بمانده هم بسر خلق، تا بپیل تخلد   در ازدحام گر انداختی کسی سوزن
بود ز فرط خجستگی یا که از کشاکش خلق   که پاره پاره بر اندام گشته پیراهن
چو روز عید کسان از هم و آمد و رفت   بیکدگر شده گرم معانقه همه تن
مصافحه شده یکدست سهوا زاحباب   ز بسکه بود ز تحسین شهر دستک زن(۴)
غریو تهنیت، انواع مژده بخش قدوم   فگنده غلغله در گنبد سپهر کهن
پیادگان و سواران ستاده هر دو طرف   همه نهنگ شکار و همه پلنگ اوژن
گروه ساز نوازان بیکطرف از دو صف   بلب نی و بکف اندر جلاجل و ارغن
بهر دیار درون همه اکابر شهر   فراهم آمده زانسان که گرد دمه خرمن
معززان یورپ جمع با اهالی هند   چنانکه سبزه و گل بود در یک گلشن
ز سر گرفته کلاه انگلش سران ز اینسر   نهاده دستا بسر هندی افسران زانین
نموده تهنیت و خم و سرفرو پی تسلیم   که پابوسی و سربازی است از ان روشن
گذیده شیوهٔ دیرین ادای تهنیت است   بوالیان ممالک زاهل ملک و وطن
ولی بخاطر ما تم لطیفه گذرد   امید آنکه قبولش کنند اهل فطن
که دلپذیرای عدالت گرای ملک آرای   خود از زبان درافشان بلهجهٔ آمین
بشهریان بدهد مژدهٔ مبارکباد   ز عهد دولت خود عهد نشر عدل و امن
نوید راحت و آسودگی و آزادی   امید رفع بلاهای قحط و رنج و فتن
خدا نگاها وقتیکه در میان سفر   بیار سال از امروز دور تا صد دن(۵)
هم از تبدل آب و هوای ملک و فصول   هم از مشقت راه دراز پیمودن
رسیده بود بهم رنج صعب و ضعف قوی   بدان شریف عناصر بدان لطیف بدن
عموم مردم هند و خصوص دهلویان   شدند مضطرب و مبتلای درد و حزن
دراز ساخته دست دعا بدرگه حق   برای صحت فرمان دهٔ زمین و زمن
دعای صبحگی و نماز نیم شبی   هزار شکر که پذرفت ایزد ذو المن
بزد و خرمیها نیست ایرون آمد   هم از خسوف علالت هم از محاق محن
نگاهبان تو چشمان روشنان سپهر   که هست بر قدت از فضل چشم شان جوشن
بیادگار قدوم مسرت آثارت   ز شهر گشته فراموش شیوهٔ شیون

(۱) نبیرۂ چنگیز خاں (۲) پای تخت چین (۳) پای تخت پروش (۴) چیرز یہ انگریزی لفظ ہے اور اس کے معنی تالیاں بجانا ہیں یعنی (۵) در ترکی دہ ہزار سال گویند۔

بروزگار درود جستنگی بارست — بدشت لاف ہمائی زده است بوم و دمن
ز مهر گرفته کلاه و مه پی تعظیم — اگر گزشته بر ایوان تو ز پیرامن
سزد ز شهپر کروبیان بر کلهت — که گشته طرف کلاهت بچرخ سایه فگن
ز اختلاف صلاحت، امور سهل محال — ز اتفاق رضایت، محال ہا آسان
گورنری بتو نازد نه تو بدان که فروغ — بود ز شمع لگن را نه شمع را ز لگن
توان شمرد نظیرت چگونه آگسطس؟ — که فتح یافته بر یک ضعیفه قبطی زن را (۱)
توان نوشت عدیلت چگونه اسکندر — که فوج خود نتوانست برد تا بجمن
ز اتحاد تو، بیجدل همه پروٹسٹنٹ (۲) — ز اعتقاد تو، خوشنود کیتھلک رومن (۳)
از آنکه ملت پیشینهٔ مسیحی را — مصدقی بخلوص یقین و خوبی ظن
فزون تری ز دگر ملکها بحکم دہان — برحم و شفقت قلبی و مهر و خلق حسن
ز خلق و دوستی و حق پرستی تو بدہر — نبوده هیچ کسی دشمنت جز اهرمن
بزیر حکم تو، از روی طول صد کشور — ز رود بار برہم پتر (۴) تا بقطع چین
مطیع امر تو، از راه عرض یک عالم — ز کوهسار همالہ (۶) الی بلاد دکن
اگر بعهد تو بودی، بیامدی فارس — ز شرح دانش و داد تو خوش بیان ملٹن (۷)
ز مدح خوانی تو هومر آمدی ابکم — ز وصف گوئی تو در جهل آمدی الکن
مگر بگوشهٔ دامان تو رسد دستش — دراز دست از آن آفریده شد بهمن
مراد از آن دل ترکی (۸) بود حیا سبار — سنین عمر تو هرگز کند شمار از دن (۹)
خوشا مبارکی عهد معدلت مهد تست! — که اعتدال ربیعی است در دی و بهمن
سپیچی اسپ سواره گرا کتاپا هوا — شود ز هوای بهاری بهیبت تو سمن
شکار شیر از آن رو بجد پسندیده — جناب ارل گری نوجوان شیر اوژن
که بجبر ز روان مستقل شوند مہشت — هزار جان بزراعت درون و کشتن
ز فرط پتلیه کشتی و پلنگ افگنیش — شده از زردالی خون، دشت زرد خان بن (۱۰)
توئی که باز سپردی امارت کابل — بعبد رحمن خان آن جلا شده ز وطن
نه صرف قطعهٔ ملکی بدو ببخشیدی — که دادی اسلحه و سیم و زر چهل مخزن
بدان قدر که هم از سیم می تواند ساخت — برائے توپ گلوله گران تر از آهن
بزور زر که بزد به همان زر مردی — امیر فتح و ظفر یافته است بر دشمن
ولی بایں همه بذل تو جهد و الطاف — اعانت و مدد و بخشش و عطا و منن
امید خیر سگالی از او نباید داشت — دنی کجا است بجز بنده مرد عهد شکن!
شما را دست رضا جوئی و همسایه — زدن دو جنگ پی افغنزر بدو دامن
ومیکه گشت معین یک انگلش افسر — پی سفیری آن ملک و بود مسکن

---

(۱) ملکہ قلوپطرا مصری، (۲) عقیدۂ دیگر حاکمان انگلستان (۳) عقیدہ و میسری (۴) دریای بتری ہند در انتہای بنگالہ (۵) مواضع سرحد بلوچستان و افغانستان (۶) قطع سے کو نقطہ مراد ہے یعنی (۷) جبال شمالی ہند (۸) ملٹن و ہومر دو جلیل ہر دو شاعران یورپ بوده اند (۹) دو ہزار سال (۱۰) یک عدد انگریزی (۱۱) نام یک دریای ایرلینڈ.

بفرزندہ زنار استی ایں تدبیر — نمودہ عرض براہ و زبیل ایجرٹن(1)
کز آبیاری فرمان رود ابش تیتاب — بود شگفتہ و شاداب تر ز صد گلشن
بلی و طبعِ دیرینہ خیرخواہ ہانست — خصوص مدح طرازان ساحر زود چمن
ادائے مودن اندر زہ در معادی مدح — نگارکردن مطلب بضمنِ شعر و سخن
درین ہنگامہ کہ بالجملہ تہنیت نامہ است — وز آسمان شدہ برنظم وی نثار پرن
یکی نگارش مدح است لوکہ باد قبول — دگر گزارش رائی کہ بود(2) مستحسن
بیان بندہ نہ فخر بلکہ شکر است — کہ از مہامنِ ایں عہد و یمن ایں مامن
نہادہ اند بطبعم تفنن از ہمہ علم — سپردہ اند بدل حصہ ز ہر یک فن
ز نظم و نثر ز جفر و نجوم ہم از تاریخ — ز حکمت عملی و ز انتظام مدن
کلام پارسی پیری خیال آمیز — کہ فائق شد ز من ایں تازہ طرز نو فیشن(2)
ز بندہ نیز بخشاں کند قبول ایں نذر — کہ بر تر است ز سلک گہر بار ز وتن
درم و عاست کہ ہم بردعا سخن سنجاں — گرفتہ اند مبارک بفال ختم سخن
مدام تا شود آوردہ ذکر رتن سین و پدم(3) — مدام تا کہ شود بردہ نام نل و دمن(4)
ہمیشہ تا کہ ملاحق بود بوجہ فرات — ہمیشہ تا کہ معانق بود بگنگ جمن
بہم بہ مارکوئیس خوش زیاد مارشنس(5) — چہ در ممالک ہند و چہ در دیار برٹن(6)
بفرق ہر دو گراں مایہ و سرِ دیگر ارل(7) — بہ تقدیس سہ اقانیم(8) باد سایہ فگن!

(3) ضیاء الدین خاں بہادر کے کتب خانے کے غدر میں لٹ جانے کے متعلق میرزا صاحب نے صاحب عالم کو لکھا ہے: "میرا ایک نسبتی بھائی، نواب ضیاء الدین خاں بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا، چنانچہ مجموعہ نثر اور کلیات نظم فارسی وار دو نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتب خانہ ڈر کر عرض کرتا ہوں بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا۔ لٹ گیا، ایک ورق باقی نہیں رہا۔" (اردوی: ۱۵۱، لاہور ایڈیشن) یوسف علی خاں عزیز کو تحریر کیا ہے: "بھائی تم کیا فرماتے ہو! جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں کے گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟" (ایضاً: ۱۵۳)

(4) میرزا صاحب نے سہواً "غزنیں" لکھ دیا ہے۔ صحیح "غزنوی" ہے۔

صفحہ ۶۰

(1) میرزا صاحب کے ۱۹ ستمبر کے عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے جو فرمان لکھا

(1) نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب (2) یعنی طرز و روش لغت انگریزی (3) رتن سین و پدماوت راجہ و رانی چتوڑ (4) راجہ و رانی اوجین (5) بیگم مارکوئیس چنانکہ پرنسس و ڈچس بیگمان پرنس و ڈیوک (6) وطن ویسرائے (7) یعنی ارل گرے مذکور فرزند کلاں ویسرائے (8) جمع اقنوم اصول سہ گانہ تثلیثیاں کہ مراد از اب و ابن و روح است۔

لبید ہیں ایک اور جگہ بھی فرماتے ہیں در عبدالرشید میں کہا گئی اور میاں انجو میں کہا پیری ہے (عود: ۱۴۸)

(۳) لالہ ٹیکچند بہار تخلص، خان آرزو (متوفی سنہ ۱۱۶۹ ہجری (۱۷۵۶ء)) کے شاگرد اور اردو فارسی کے شاعر تھے، بہار عجم کے علاوہ ایک کتاب جواہر الحروف بھی ان کی تصنیف ہے سال وفات کسی تذکرے سے معلوم نہ ہو سکا۔

(۴) سیالکوٹی مل وارستہ تخلص، مصطلحات شعرا کے مصنف ہیں یہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی، متوفی سنہ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) کے شاگرد تھے اور ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) میں فوت ہوئے تھے۔ مصطلحات شعرا کو عام طور پر سنہ ۱۱۸۰ھ کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ لیکن در اصل اس کا نام "مصطلحات شعرا" تاریخی ہے۔ جس سے سنہ ۱۱۴۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ مصطلحات الشعرا مشہور ہو جانے کے باعث "ال" کے ۳۱ عدد زیادہ جوڑ لیے جاتے ہیں۔

(۵) میرزا صاحب نے سہواً "اوس" کے لکھ دیا ہے۔

(۶) یہاں لفظ "کے" ساقط ہو گیا ہے۔ آئندہ عریضے کو دہراتے ہوئے میرزا صاحب نے یہ لفظ لکھا تھا۔ اس لیے میں نے بریکٹ میں بڑھا دیا۔

(۷) اصل خط میں سہواً ۱۳ تاریخ درج ہو گئی ہے، صحیح ۱۲ ہے۔ اس لیے کہ اولاً خود میرزا صاحب ہی نے اس خط کے لفافے پر ۱۲ اکتوبر تاریخ لکھی ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ تاریخ ثبت کے دوسرے دن یہ خط پوسٹ کیا گیا تھا، ثانیاً نواب خلد آشیان نے اس خط کا جواب جو آگے آرہا ہے، تیرہ اکتوبر کو دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خط کا جواب تیرہ کو لکھا جائے وہ خود تیرہ کا مکتوب نہیں ہو سکتا۔ میرزا صاحب کے عریضے کے بعض کنایات سے ناخوش ہو کر نواب صاحب نے جواباً تحریر فرمایا: "..... مکتوب حیرت اسلوب مشعر اختراع معنی غلط نسبت بہ ہندی نژادان پارسی نشین و دیگر اعتراضات و این کہ راقم را طریقۂ بحث یاد نیست، موصول مطالعہ گشتہ باعث استعجاب عظیم گردید۔ از آنجا کہ تا حال درپی تحقیق و تنقیح امور علمیہ کہ معاذ اللہ از مناظرہ و منافسہ بچشم حق بین ما بعید می نماید، امری دیگر بظہور نیامدہ و آنچہ حالی خاطر بود بی ریب در حوالۂ قلم دقائق سنج گردیدہ۔ لیکن می نازم بر ذہن موشگافی آں فرید زمان کہ نوشتہ ام را بہ بحث و جنجال محمول نمودہ، امثال این کنایہ ہای نو، مثل نسبت استادی بجناب راقم و لفظ بحث کہ ہر دو خلاف واقع و موجب رنج و عنا است نگاشتند۔ پس اگر آں مشفق را ہمچنین منظور باشد، اشارتی سازند کہ واسطۂ ترسیل رسائل از میانہ ہم برداشتہ شود۔ ورنہ بنان خامہ را با مور خارج المبحث تکلیف ندادہ باشند کہ نتیجہ اش سوای صداع الرأس امری بخیال نمی رسد۔ و راقم پایۂ اعتبار محققان کہ صاحب تصانیف مقبول انام بودہ اند از خود زیادہ دانستہ بحوالۂ کلام شان پرداختہ۔ اگر نزد آں صمیم جا دیدہ آنہا قابل قبول نبودہ، بایستی کہ ہم برآں نمط تحریری پرداختند۔ مصلحت این قدر اطناب سخن از فہم ہیچمدانی بیرون است۔ زیادہ ازین توسن حکمت بلطف عنان آموختن است۔ المرقوم ۳ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء"۔ چونکہ نواب صاحب کے اس فرمان سے اظہار ناخوشی و ناراضگی ہوتا تھا، میرزا صاحب نے

فوراً معذرت نامہ مورخہ ۱۶ ماہ اکتوبر لکھ کر طلب عفو کی۔ نواب صاحب نے معذرت قبول کرتے ہوئے تحریر فرمایا: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مشفقا! سابق ازیں بملاحظہ مضمون مفاوضۂ سابقہ امری کہ منجمل شدہ بود، بے شائبہ تکلف حوالۂ خامہ گر دیدہ حالا کہ آں مہربان تیاد بلیش بہ مداحتند ، اذ آں رفع شکوک لاحقہ تحریر دید۔ خاطر لطف مشاہر مقرون جمعیت باشد۔ المرقوم ۲۱ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء"

اس کے بعد نواب صاحب نے پھر کوئی نثر اصلاح کے لئے نہیں بھیجی جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی طبیعت کا تکدر کلیتہً دور نہیں ہوا۔

صفحہ ۶۲

(۱) یہاں بیت کی جگہ مصرع کا مخفف "ع" ہونا چاہیے۔

(۲) صاحبزادہ سید مہدی علی خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پوتے، صاحبزادہ حفیظ اللہ خاں بہادر کے بیٹے اور نواب خلد آشیاں کے چچا تھے۔ شعر و سخن کا شوق تھا۔ اور مخف تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں نواب فردوس مکاں سے تلمذ تھا۔ آخر میں میر احمد علی رسا کے شاگرد ہوئے۔ ۷۴ برس کی عمر پائی۔ ستائیسویں ماہ رمضان سنہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) کو رحلت فرمائی۔" انتخاب یادگار: ۳۸۴، دتاریخ لطیف: ۲۲۹)۔

(۳) تاریخ سلطنت انگلشیہ ہند طبع مرادآباد دسنہ ۱۸۶۶ء ص ۳) میں لکھا ہے۔

"ماہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء میں جناب نواب گورنر جنرل بہادر نے بمقام آگرہ دربار عام کو زیب و زینت بخشی۔ دربار میں والیان ریاست و رئیسان نامی وگرامی، علاوہ ان رئیسان کے کہ جن کو تمغہ "ستارۂ ہند" عطا ہوئے بقدر ۸۲ کس کے تھے، علی قدر مراتب اپنی اپنی جگہ کرسی نشین ہوئے۔ نواب گورنر جنرل بہادر، نائٹ گرانڈ ماسٹر اسٹار آف انڈیا بڑے تزک اور احتشام سے معہ دس بارہ صاحبان انگریز جلیل القدر کے بپوشاک و خلاع شاہی پہنے ہوئے رونق افروز ہوئے۔

۔ ول صاحب سکریٹری بہادر اسٹار آف انڈیا نے استادہ ہو کر فرمان ملکۂ معظمہ با بحالی عطائی تمغہ ہائے اسٹار آف انڈیا کے پیش فرمایا۔ بعدہ بترتیب درجہ ہا تمغۂ اسٹار آف انڈیا یعنی "ستارۂ ہند" عطا ہوئے۔"

اس کے بعد حاضرین دربار کی فہرست دی ہے۔ اس میں بسلسلہ والیان ریاست نمبر ۸ پر درج ہے، "آنریبل نواب رامپور تشریف نہیں لائے۔" اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ نواب خلد آشیاں نے بہ سفر تمغۂ ستارۂ ہند پانے کے لیے کرنا چاہا تھا جیسا کہ آگرہ تک سفر کا انتظام درست ہو چکا تھا۔ سرکار سنبھل تک تشریف بھی لے گئے تھے۔ مگر مزاج ناساز ہو جانے کی وجہ سے رستہ ہی سے مراجعت فرمائی۔

(۱) نواب خلد آشیاں کے اس سفر کے متعلق صاحب اخبار الصنادید (ج ۲، ۱۴۰) نے لکھا ہے:

"مسٹر جان انگلش صاحب کمشنر و ایجنٹ نے ریاست نواب سید کلب علی خاں سے جو بیماری و علالت کے آثار دیکھ کر بہت جلد آنریبل ایڈمنڈ ڈرمنڈ صاحب لفٹننٹ گورنر مغربی و شمالی کے حضور میں رپورٹ کی، اور انہوں نے لارڈ لارنس صاحب

گورنر جنرل کی خدمت میں نواب سید کلب علی خاں بہادر کی لیاقت خداداد کی اطلاع کی۔ گورنر جنرل نے باظہارِ مسرت مثل نواب سید یوسف علی خاں کے نواب سید کلب علیخاں کو بھی لیجسلیٹیو کونسل میں ممبر تجویز کیا۔ نواب صاحب نے ہنگامِ استمزاج باوجودِ ناچاقیٔ طبیعت و ضعف باقتضائے عزم بلند ممبری قبول کی۔ ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۸ دسمبر ۱۸۶۶ء) کو رامپور سے علیگڑھ تک گاڑی کی ڈاک میں اور علیگڑھ سے کلکتے تک تخمیناً پانسو ہمراہیوں کے ساتھ ریل کے ذریعے سے گئے۔ اثنائے راہ میں کانپور، الٰہ آباد، اور بنارس وغیرہ ہر مقام پر حکام نے استقبال کیا اور سلامی سر ہوئی۔ مہاراجہ الیسری پرشاد نارائن سنگھ صاحب جی سی، ایس، آئی، والی کاشی نریس نے بنارس میں بنظرِ اتحادِ قدیمی دھوم سے دعوت کی۔ کلکتے میں گورنر جنرل کی طرف سے بطرزِ مرغوب استقبال ہوا۔ سلامی سر ہوئی۔ آب و ہوائے کلکتہ نے ان کے مزاج سے بھی مخالفت کی، اور طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف رہی۔ پھر بھی کونسل میں کئی اجلاس کیے۔ جب ناسازی زیادہ بڑھی، تو حسبِ اصرار گورنر جنرل ڈاکٹر بیلی سے علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹر کی رائے ہوئی کہ آب و ہوا یہاں کی ان کے مخالف ہے، بلکہ قیام کلکتے سے امراضِ شدید لاحق ہونے کا اندیشہ ہے، مگر نواب صاحب نے اسے قبول نہ کیا۔ جب گورنر جنرل کو اس کا علم آیا، تو بمقتضائے محبت خاص بکمالِ اصرار واپس کیا۔ ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۸۳ھ (۳۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء) کو کلکتے سے رامپور واپس ہوئے۔

میرزا صاحب کے ۶ بیضے (۸۱) کے لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب محلۂ کاشی پور کے مکان نمبر ۵ و ۷ میں قیام فرما ہوئے تھے۔ میرزا صاحب کا قطعۂ تاریخ حسب الحکم حضور اخبار دبدبۂ سکندری میں طبع ہوا اور ۳ نومبر کو اس کی اطلاع ان الفاظ میں میرزا صاحب کو دی گئی: "تاریخِ مذکورہ کہ بطرزِ نو عدیم المثال ست در اخبار دبدبۂ سکندری طبع گردیدہ شد۔"

صفحہ ۶۳

(۱) خط میں کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں تھی۔ میں نے قوسین میں لفافے کی تاریخ اضافہ کردی ہے۔

(۲) میرزا صاحب نے "بات" لکھا ہے۔

(۳) دہلی سے مرادآباد کو جو ریلوے لائن آتی ہے، اس پر دہلی جنکشن کے بعد شاہدرہ اور پھر غازی آباد کا اسٹیشن آتا ہے۔ یہ بستی پہلے نواب غازی الدین خاں بہادر عماد الملک وزیر شاہ عالمگیر ثانی و شاہ عالم ثانی نے سنہ ھ (۱۷۴۰ء) میں بسائی تھی۔ پہلے اُن کے نام پر غازی الدین نگر کہلاتی تھی۔ جب ریل کے محکمے نے اسے جنکشن بنایا، تو بول چال کی سہولت کی خاطر غازی آباد نام رکھ دیا۔ اسی نام سے اب مشہور ہے۔ غلے کی منڈی ہو جانے سے آبادی اور دولت دونوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے۔ اور یہ قصبے سے ترقی کرکے شہر کے درجے پر پہنچ گیا ہے (امپیریل گزیٹیر: ۵، ۱۶ ف)

(۴) اس خط کے جواب کا مسودہ منقولہ میں نہیں ہے۔

صفحہ ۴۶

(۱) میرزا صاحب نے اس خط میں تین جگہ اس لفظ کو اسی طرح لکھا ہے۔
(۲) آثار الصنادید، یادگارِ دہلی سید احمد ولی اللّٰہی اور واقعاتِ دار الحکومت دہلی بشیر احمد دہلوی میں اس کوٹھی کا ذکر نہیں ملتا۔
(۳) یہاں لفظ (سے) زیادہ معلوم ہوتا ہے۔
(۴) بیگم سے مراد جہاں آرا بیگم ہیں، جو شاہ جہاں بادشاہ کی چہیتی بیٹی تھیں۔ یہ ممتاز محل کے بطن سے ۲۱ صفر ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) کو بدھ کے دن پیدا ہوئیں۔ ماں کو شہزادی سے اتنی محبت تھی کہ اُس نے مرتے وقت شاہ جہاں کو وصیت کی کہ میرے متروکے کا آدھا حصہ جہاں آرا کو دے کر باقی آدھا بیٹوں میں تقسیم کرنا۔ خود شاہ جہاں اتنا چاہتا تھا کہ بیٹی کی صحت کی خاطر ہندوستان میں انگریزوں کا بیج بو لیا، جو آکاس بیل کی طرح آخر میں مغل سلطنت کے درخت کی شاخوں پر چھا کر خود درخت ہی کو کھا گیا۔ صورت یہ پیش آئی کہ سنہ ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں جہاں آرا کی سالگرہ کا جشن منایا گیا۔ سوءِ اتفاق کہ عین سالگرہ کے دن شمع کی لو سے شہزادی کا دامن جل اُٹھا۔ شہزادی اُس وقت دربارِ شاہی کے پاس کھڑی تھی۔ پاسِ حیا سے زنانے کی طرف بھاگی ہوا لگنے سے سب کپڑوں نے آگ لے لی، اور جہاں آرا کا گلاب سا بدن جل کر کوئلہ ہو گیا۔ باپ کو اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی۔ مگر فرطِ محبت میں دوا اور دعا کا کوئی جتن نہ چھوڑا۔ ہزار ہا روپیہ خیرات کیا گیا، اور ملک بھر کے حاذق اطبا اکٹھے کر لیے گئے۔ قسمت دیکھیے کہ ان میں سے کوئی کامیاب نہ ہوا۔ اُس زمانے میں ایک انگریز ڈاکٹر بندر سورت میں آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اُس کی شہرت سُن کر طلب کیا۔ اُس کے پانچ مہینے کے علاج سے شہزادی تندرست ہو گئی۔ بادشاہ نے جشنِ صحت میں لاکھوں روپیہ ایثار کیا۔ قدسی کو قصیدۂ تہنیت پر، جس کی رباعی کا یہ شعر لاجواب ہے۔

تا سرزدہ از شمع چنین بی ادبی ‏ ‏ ‏ ‏ پروانہ زعشق شمع را سوختہ است

۵ ہزار روپے کا صلہ عطا ہوا۔ ڈاکٹر کو چاندی میں تلوا دیا، اور اُس قوم پرور کی استدعا پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں آزاد تجارت کا فرمان عطا ہوا۔

جہاں آرا کو قدرت نے ذہنِ رسا اور روشن دماغ عطا کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے اس جوہر کو نکھار دیا۔ اور وہ عربی، فارسی اور ترکی میں صاحبِ دستگاہ ہو گئی۔ اپنی اعلیٰ دماغی خوبیوں کی بدولت باپ کے مزاج میں بیحد دخیل تھی۔ بھائیوں کی جنگ میں دارا شکوہ کی حامی رہی، اور عالمگیر کے بادشاہ ہو جانے پر آگرے کے قلعے میں باپ کی خدمت کی خاطر جا پڑی تھی۔

تصوف کی دلدادہ اور خاندانِ چشت کی شیدا اور مرید تھی۔ صاحبِ تصنیف و تالیف بھی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی سیرت پر مونس الارواح نام کی کتاب اس کی تصنیف ہے۔ شعر بھی کہتی تھی۔ مختصر کم۔ کتاب خانۂ رامپور میں رسالۂ خواجہ عبداللہ انصاری کا ایک خوشخط نسخہ ایران کے مشہور خطاط میر علی الکاتب کے قلم کا محفوظ ہے، جس پر جہانگیر اور شاہ جہاں کی دو تحریریں ثبت ہیں۔ اُس کے آخر میں جہاں آرا نے اپنے قلم سے ایک عبارت لکھی ہے۔

مزاج میں انکسار، فیاضی، مہمان نوازی، بردباری اور ثقاہت بہت تھی۔ سادہ معاشرت کو پسند کرتی، اور تزک و احتشام سے متنفر تھی۔ اس نے ۳ رمضان ۱۰۹۲ھ (۵ ستمبر ۱۶۸۱ء) کو انتقال کیا، اور شاہ نظام الدین میں سنگِ مرمر کے خود تعمیر کردہ مجر میں دفن ہوئی۔ (واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی: ۲، ۲۲۹، ح ۱)

جہاں آرا نے ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں چاندنی چوک کی جانبِ شمال مکاناتِ دلکشا اور ایک باغ بنایا تھا، جو پہلے صاحب آباد کہلاتا تھا، بعد ازاں بیگم کا باغ مشہور ہوا۔ اور اب ملکہ کی مورت نصب ہو جانے کے بعد ملکہ کا باغ کہلاتا ہے۔ یہ ۹۷۰ گز لمبا اور ۲۴۰ گز کا چوڑا تھا۔ اس میں عجیب عجیب بارہ دریاں اور مکانات تھے۔ اس میں نہر جاری تھی۔ اور جگہ جگہ فوارے اور حوض بنائے گئے تھے۔ مرورِ ایام سے اس باغ کی وضع قطع بالکل بدل گئی۔ چار دیواری، جس میں جابجا برج بنے ہوئے تھے، غدر میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اب صرف چار برج رہ گئے ہیں دو تو باغ کے احاطے کے شمال رُخ پر موجود ہیں، تیسرا انجن کے کمرے کے پاس اور چوتھا اس مقام پر ہے، جہاں عجائب خانے کے شیر وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ پرانے درخت کاٹ کر نئے چمن لگائے گئے ہیں۔ جگہ جگہ بنچیں پڑی ہیں۔ بیچ میں ایک خوبصورت گول چبوترہ بنا کر آس پاس گھاس کے تختے بو کر پھولوں کے گملے دھرے ہیں۔ پہلے اس چبوترے پر بینڈ بجتا تھا پھر موقوف ہو گیا۔ یہیں ایک سنگِ مرمر کا حوض تھا، جو اب قلعے میں ہے۔ اس میں فوارہ لگا ہوا تھا، اور بیچ میں سے نہر رواں تھی۔ چند سال ہوئے باغ اور اسٹیشن کے بیچ کی سڑک چوڑی کی گئی۔ تو کچھ حصہ باغ کا اس میں شامل ہو گیا۔ (آثار الصنادید: ۲، ۵۵، طبعِ دہلی ۱۲۶۳ھ = ۱۸۴۷ء، واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی: ۲، ۲۳۱)

(۵) سنہ ۱۸۵۵ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتے سے رانی گنج تک جو ۱۲۰ میل کا فاصلہ ہے، جاری تھی۔ تعمیر کا کام برابر دلی تک جاری رہا۔ پہلے آگرے سے جمنا کے غربی کنارے کے ساتھ ساتھ داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اس کی جگہ ٹونڈلا جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے مشرقی کنارے چولا تک کا حصہ سنہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا۔ اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا۔ سنہ ۱۸۶۶ء کے آخر میں یہ پل، جو ۲۶۶۰ فٹ لمبا ہے، ۶۶۰۳۵۵ روپے کی لاگت سے بن کر تیار ہوا، اور یکم جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گزری۔ اور این، ڈبلیو آر نے، جو اس زمانے میں سندھ پنجاب دلی ریلوے کہلاتی تھی، غازی آباد کو ریل کے ذریعے دلی سے ملا دیا۔ اس ریل کا اسٹیشن پہلے ہملٹن روڈ پر بنا تھا، جسے میرزا صاحب نے ولی محمد سوداگر کی کوٹھی کے پاس بتایا ہے۔ اب اس جگہ این ڈبلیو کا مال گودام ہے۔ موجودہ ریلوے اسٹیشن دراصل ای، آئی، آر، کا ہے۔ راجپوتانہ مالوہ ریلوے کا اسٹیشن موری دروازے تھا، این ڈبلیو آر کا ہملٹن روڈ پر، ای، آئی، آر سے جداگانہ۔ مسافروں کو تکلیف ہوتی تھی۔ ان سب کو ملا کر یہ ایک اسٹیشن بنا دیا گیا۔ (یادگارِ دہلی: ۱۳۵، واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی: ۱، ۳۴۷ و ۲، ۲۲۳)

نواب خلد آشیاں غالباً دلی سے اس بنا پر سوار نہ ہوئے کہ دسمبر کے آخر تک انھیں اس پل کے کھلنے کی صحیح تاریخ کا علم نہ تھا۔

(۶) میرزا صاحب نے اس جملے اور آیندہ جملے کے درمیان ۲ نقطے دیے ہیں۔
اس عریضے کے جواب میں ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا:
"...چون راقم عنقریب روانہ کلکتہ می شود۔ چنانچہ برای انتظام گاڈیہای ریل رفعت دعوالی مرتبت محمد اصغر علی خان رسالدار را روانہ آنجا نمودہ شدہ و ہنوز تاریخ رسیدن بمقام اسٹیشن ریل دہلی مقرر نگشتہ، لہذا حوالہ خامہ مودت نگاری شود کہ حال تقرری تاریخ رسیدن آنجا از خان معزی الیہ دریافتہ نمودہ شود۔" رسالدار صاحب کے خاندان میں تلاش کرنے پر بھی میرزا صاحب کا کوئی خط نہ ملا، جس سے پتا چلتا کہ اُن سے میرزا صاحب نے استفسار کیا یا نہیں۔ لیکن یہ امر اخبار المصنا دید کے محولۂ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ سرکار علی گڈھ تک گھوڑوں کی ڈاک میں اور وہاں سے بذریعہ ریل کلکتے گئے تھے، اس لیے یہ یقین ہے کہ میرزا صاحب سعادتِ ملاقات حاصل نہ کرسکے۔

(۷) میرزا صاحب کا یہ ارشاد سہو پر مبنی ہے، کیونکہ اُن کی پنشن، دربار اور خلعت یہ تینوں اعزاز غدر کے بعد بند ہوگئے تھے۔ تفصیل دیباچے کی بحث تعلقات انگریزی میں ملاحظہ ہو۔

(۸) سرڈانل میکلوڈ صاحب مراد ہیں۔ یہ لفٹنٹ جنرل ڈنکن میکلوڈ کے یہاں فورٹ ولیم، کلکتہ، میں ۶ جون سنہ ۱۸۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ ولایت جاکر تعلیم پائی۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں ہندوستان واپس ہوئے، اور صوبۂ بنگال میں ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۹ء تک ضلع ساگر و نربدا، اور بنارس میں رہے۔ ۱۸۵۴ء میں پنجاب کے جوڈیشل کمشنر ہوئے۔ غدر سنہ ۵۷ء میں لاہور میں تھے۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے اور ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ء کو لندن کی زمین دوز ریل کے ایک حادثے سے انتقال کرگئے۔ یہ مشرقی علوم و فنون کے بڑے حامی تھے، اور چاہتے تھے کہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم کی تعلیم دی جائے۔ پنجاب یونیورسٹی انھیں نے قائم کی تھی۔

(۹) سبدِ چین (ص ۷۹) میں یہ رُباعی میکلوڈ کی مدح کی چھپی ہے:

آی پایہ بلند ساز والا جاہی ... از مہر نو باد ہر چہ از حق خواہی
مکلوڈ کہ در صورت نہمت ... چوں مہر عیان معنی رد مح الٰہی

بعید نہیں اسی کو خوشخط لکھا کر پیش کیا ہو۔ لیکن اسی کتاب میں ایک قطعہ بھی درج ہے جس کی ۱۸ بیتیں ہیں، اور پہلا شعر یہ ہے:

بزم نواب جم حشم مکلوڈ ... دستانی است پُر ز نعمت و ناز

اس میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

آدمم تا بہ پیش دی نالم ... از جفاہای زمانۂ ناساز
از ادب دم نمی توانم زد ... با چنین داغہای سینہ گداز
چون رسد وقت کار سر ناصر ... گویم اما بہ شیوۂ ایجاز
مدح یا ہی انگلستان است ... بر زبان سن از زمانِ دراز
اندرین پایہ یا سنِ مسکین ... نیست در ہند ہیچ کس انباز
غالبم اسم شہرہ نام نیست ... اسد اللہ خانِ مدح طراز

(سبدِ چین : ۳۷)
میرزا صاحب کا ایک اور ۷ اشعر کا قطعہ، کسی گورنر کی مدح میں ہے۔ اُس کا پہلا شعر حسبِ ذیل ہے:

سپس از ادای سپاسِ خدای عزّوجل ... ثنای حضرتِ نواب می کنم انشا

اس میں میرزا صاحب لکھتے ہیں:

زہی عطای گرانمایۂ گرامی قدر ... کہ سود تارکِ من از شرف بادجِ سما
توان فگند بہ گیتی بنای ہشت بہشت ... زسفت پارچہ کان ہر یکی است بیش بہا
حمائلِ گہر و جیغۂ و دگر سرپیچ ... چو روشنانِ فلک با فروغ داد ضیا
چو لی طلب بمن اینہا رسیدہ است بود ... زبہرِ مطلبِ خویشم توقعِ امضا
توقع آنکہ یکی سارتی فکٹ یابم ... زپیشگاہِ عنایاتِ دائیٔ والا

(سبدِ چین: ۵۵)
خیال یہ ہے کہ قطعۂ اوّل دربار میں تعارف کے طور پر رُباعی کے ساتھ پیش کیا ہوگا، اور دوسرا قطعہ خلعت پانے کے بعد اظہارِ تشکر اور طلبِ سارٹیفکٹ کے لیے لکھا ہوگا۔ اس قطعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ باوجود منٹگمری صاحب سے خلعت پانے کے میرزا صاحب کو یہ یقین نہ تھا کہ اُن کا خلعت و دربار جاری ہے۔ اُنھیں دربار میں مدعو نہ کیے جانے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

صفحہ ۶۵

(۱) میرزا صاحب کے اس بیان سے کہ نہ تو کمشنر کو علم تھا کہ اسداللہ خاں کو خلعت ملے گا، اور نہ مجھے اس کا خیال گزرتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ اب تک خلعت بحال نہیں ہوا تھا، صرف شرکتِ دربار کی اجازت ملی تھی، ورنہ گورنر خلعت دیتے وقت کیوں کہتا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ اس کے شکریے میں میرزا صاحب نے جو قطعہ لکھا ہے، اُس کا یہ شعر ابھی گزر چکا ہے:

چو بے طلب بمن اینہا رسیدہ است، بود ... زبہرِ مطلبِ خویشم توقعِ امضا

اُس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ میرزا صاحب خلعت سے مایوس تھے، ورنہ بے طلب کی قید کیوں لگاتے۔ لیکن وہ خود بیان کرتے ہیں کہ سنہ ۱۸۶۳ء میں منٹگمری صاحب نے بلا کر خلعت دیا، تو کہا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا" اس صورت میں یہ بھی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اُنھوں نے کسی مصلحت سے اُس وقت یہ بات مشہور کر دی تھی۔ (مکاتیب: ۴۴)

(۲) میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن فرہنگِ آصفیہ اور نوراللغات میں قناویز لکھا ہے یہ ایک قسم کا نہایت چمکدار موٹا ریشمی کپڑا ہوتا ہے پہلے بخارا سے آتا تھا، اب یورپ سے آتا ہے اور گرنٹ کی قسم میں شمار ہوتا ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "دو بوجہ" لکھا ہے۔

(۴) یہ عریضہ میرزا صاحب نے کلکتے کے پتے سے لکھا تھا چنانچہ لفافے پر تحریر ہے: کلکتہ محلہ کاشی پور، خانہ نمبر ۷ اور نمبر ۵۔

صفحہ ۷۶

(۱) لارڈ لارنس مراد ہیں۔ یہ الیگزنڈر لارنس کے چھٹے بیٹے تھے۔ ۴ مارچ ۱۸۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ فروری ۱۸۳۰ء میں کلکتے آکر سول سروس میں نام لکھایا۔ ۸ برس تک دہلی اور اس کے اطراف میں اسسٹنٹ اور ڈسٹرکٹ افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۵ء تک دوبارہ اسی علاقے میں خدمات انجام دیں۔ ۱۸۴۶ء میں ستلج جالندھر کے دوآبے کے کمشنر مقرر ہوئے۔ لاہور میں رزیڈنٹ بھی رہے۔ کانگڑے کی بغاوت فرو کی۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کے الحاق کے بعد انتظامی بورڈ کے ممبر مقرر ہوئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں بورڈ توڑ کر انھیں پنجاب کا چیف کمشنر بنا دیا۔ اپنے بھائی سر ہنری لارنس سے جمہوری معاملات میں انھیں معقول اور سنجیدہ اختلاف تھا۔ غدر میں پنجاب کو محفوظ رکھا اور فوجی مدد بھیج کر دہلی کے محاصرے میں اہم اعانت کی۔ یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے مقرر ہوئے، اور ۱۲ جنوری ۱۸۶۹ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ یہ بہت طاقتور، مستعد، جفاکش اور کٹر مذہبی آدمی تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی پر "بیرن لارنس آف دی پنجاب اینڈ گریٹلی" کے اعزاز سے مفتخر ہوئے۔ ۲۷ جنوری ۱۸۷۹ء کو لندن میں انتقال کیا اور ویسٹ منسٹر ابی میں دفن ہوئے۔

(۲) اس سلسلے میں نواب خلد آشیاں نے ۳۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو تحریر فرمایا: "مشفقا! بعنایت ایزدی مخلص بخیریت تمام بتاریخ ۶ جنوری سنہ حال فائز مقام کلکتہ گردید۔ و ملاقات جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام شوکتہم، و دیگر صاحبان عالی شان و نیز اجلاس کونسل بعنوان شائستہ و طرز بایستہ بپایۂ حصول رسید۔"

(۳) دونوں لڑکوں سے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مراد ہیں۔ دیباچے میں ان کا حال تفصیل سے لکھ دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ میرزا صاحب کی استدعا منظور نہیں ہوئی، اور ان کی زندگی میں کسی لڑکے کی تنخواہ مقرر نہ کی گئی۔

(۴) نواب خلد آشیاں نے ۷ رمضان ۱۲۸۳ھ (۳ فروری ۱۸۶۷ء) کو لکھا تھا: "بتاریخ سی و یکم ماہ جنوری سنہ حال راقم بعنایت الٰہی مع الخیر بعد شمول جلسۂ اجلاس کونسل از مقام کلکتہ داخل رامپور گردید۔" تعجب ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۱۴ فروری تک موصول نہیں ہوا۔

(۵) اصل خط میں سہواً "ہو جاؤں" تحریر ہو گیا ہے۔

صفحہ ۷۷

(۱) لفافے پر ۵ فروری درج ہے۔ غالباً دوسرے دن ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔

(۲) صحیح لفظ "طمانینت" ہے، مگر اردو زبان کے عام و خاص سب طمانیت ہی بولتے ہیں۔

صفحہ ۷۸

(۱) بریکٹ کی عبارت میرزا صاحب سے سہواً چھوٹ گئی تھی، ہم نے دیگر نسخہ الف سے ایزاد

کردی ہے تاکہ کلام تمام ہو جائے۔
(۲) اصل میں "بات" ہے۔

صفحہ ۶۹

(۱) لفافے کی پشت پر تحریر ہے: "پیش نمودہ شد۔ قطعۂ نوشتہ نزد مہتمم اخبار برای طبع ... فرستادہ شود .... مطابق ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۶۷ء"
(۲) انتخاب یادگار (ص ۹۰) اور اخبار الصنادید (ج ۲، ص ۱۳۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب خلد آشیاں نے ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۲ھ (مارچ سنہ ۱۸۶۶ء) میں جو جلوس کا پہلا سال تھا، باغ بینظیر کے میلے کا آغاز کیا۔ یہ میلہ آٹھ روز بڑی رونق سے رہتا تھا۔ باغ میں ہر قسم کے مال کی دکانیں ہوتی تھیں، جن میں سے یہاں ذکر کے قابل مطبع نظامی کانپور کے مالک عبدالرحمٰن خاں بن حاجی محمد روشن خاں کی کتابوں کی دکان ہے۔ روہیلکھنڈ کے اکثر معززین بھی اس میلے میں شریک اور نواب خلد آشیاں کے مہمان ہوتے تھے۔ نواب صاحب خود بھی آٹھ روز برابر وہیں مقیم رہتے تھے، اور اکثر اوقات دوکانوں پر تشریف لے جاکر اسباب خریدتے۔ قسم قسم کے جلسے، مشاعرے اور تماشے بھی ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں میلے کی ترقی کے لیے ایک عمارت تیار کرکے اُس میں قدم شریف رکھوایا، پھر میلے میں دلّی والوں کی طرح اس پر پنکھا چڑھایا جاتا تھا۔ بائیس میلے نواب صاحب نے کیے، تیئیسواں میلہ قریب تھا کہ رحلت کی۔
(۳) نسخوں میں اس خط کا جواب شامل نہیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ سرکار نے کن لفظوں میں اس قطعے کی داد دی۔

صفحہ ۷۰

(۱) سبد چین (ص ۵۱) میں اس قطعے کے یہ ۶ شعر درج ہیں:

نمائشگی در خورِ شانِ خویش	بر آراست نوابِ عالی جناب
بشب زہرہ و مہ فتادہ بہ سقف	بود چشمکارش بہ روز آفتاب
زغالب چو پرسیدہ شد سالِ آن	چنین گفت آن زندِ خانہ خراب
ازان رو کہ بزمِ عیش و نشاط	زبخشش جہانی شود کامیاب
چو بینی طرب را نہایت نماند	بود سالِ آن "بخشش بیحساب"
خدایا! بپہند خداوندگار	کہ از طبعِ غالب رد و پیچ و تاب

(۲) خط میں تاریخ درج نہیں تھی۔ میں نے لفافے سے اضافہ کی ہے۔
(۳) میرزا صاحب نے سوچیتا لکھا ہے۔ اسی طرح خط نمبر ۳۵ میں بھی سوتیٔے لکھدیا ہے۔
(۴) صاحبزادہ محمد حسن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پرپوتے اور نواب خلد آشیاں کی صاحبزادی حیات النساء بیگم ملقب بہ عالیہ سلطان بیگم کے شوہر تھے۔ (اخبار الصنادید ۲: ۳۴۲) انھوں نے عین عالم جوانی میں انتقال کیا۔ نواب خلد آشیاں کے لیے یہ واقعہ بہت روح فرسا تھا، اسی لیے میرزا صاحب نے اس قدر پُر اثر تعزیت نامہ ارسال کیا ہے۔

(۵) یہ مصرع میرزا صاحب کے ایک فارسی نوحے کا دوسرا مصرع ہے۔ پہلا مصرع یہ ہے۔ "شد غرقہ بخون پیکر شاہ شہدا ہائے"۔ ملاحظہ ہو کلیات نظم فارسی۔ ۶ ستمبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط موسومہ نواب میر غلام بابا خاں رئیس سورت میں بھی نواب میر جعفر علی خاں کے بعمر ۶۴ سال فوت ہو جانے پر افسوس کرتے ہوئے میرزا صاحب نے یہی مصرع دہرایا ہے۔ ملاحظہ ہو اردوی معلی: ۷۶، طبع لاہور۔

صفحہ ۱۷

(۱) علی بخش خاں خانساماں کے سلسلے میں چھبیسویں عریضے کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔
(۲) میرزا صاحب نے سو اُ روپیے لکھدیا ہے۔

صفحہ ۲۷

(۱) صاحب عالم میرزا رحیم الدین بہادر حیا ابن میرزا کریم الدین رسا دلی کے شاہی مرا دے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے، رجب سنہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب فردوس مکاں کی طلب پر رامپور تشریف لائے، اور یہیں سنہ ۱۳۰۴ھ میں نواب خلد آشیاں کی وفات کے ۸ دن بعد ۹۴ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ انھیں شعر و شطرنج کا بہت شوق تھا۔ میرزا صاحب نے ان کے دیوان کا دیباچہ بھی لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے گلستان سخن (۲۷) اور خمخانہ (۲، ۱۰۵) ملاحظہ ہو۔
(۲) میرزا رحیم الدین بہادر حیا کے پوتے رامپور میں بقید حیات ہیں۔ انھوں نے بھی فاضل شطرنج باز کے حالات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔
(۳) ان صاحبزادی کا نام اور ان کے والد کا نام اگلے خط میں خود میرزا صاحب نے لکھدیا ہے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے بھائی کا نام نبی بخش خاں تھا، اور یہ کہ ان صاحبزادی کے نانا جنرل آکٹر لونی، جو مسلمانوں میں اختر لونی مشہور تھے اور نانی ایک مسلمان بی بی مبارک بیگم نامی تھیں۔ مبارک بیگم نے بازار سرکی والان (قاضی حوض، دلی) میں سنگ سرخ کی ایک مسجد بھی بنوائی تھی، جو سنہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) میں بن کر تیار ہوئی اور آج تک "لال مسجد" کے نام سے مشہور ہے (ذکر غالب: ۳۷، بحوالۂ واقعات دارالحکومت دہلی: ۲، ۹۳۳)
(۴) اصل "بات"

صفحہ ۷۳

(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۲۹ اگست درج ہے۔ لیکن یہ سہو قلم معلوم دیتا ہے، کیوں کہ ڈاک خانے کی مہر میں بھی ۱۹ ہی درج ہے۔ نواب خلد آشیاں نے ۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۴ھ (۲۸ اگست سنہ ۱۸۶۷ء) کو جواباً تحریر فرمایا: "... چونکہ صفا و صنۂ بہجت طراز سے منشای خاص آپ کا بخوبی منکشف نہ ہوا، اس واسطے خوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ خلاصۂ مکنون خاطر محبت مظاہر سے مطلع کیجیے، کہ بمقتضای انضباط روابط موانست قدیمہ جو بات کہ ممکن ہوگی وہ ظہور میں آئے گی۔ خاطر جمع رکھیے"
(۲) ذکر غالب (ص ۳۷) میں ان کا نام خورشید بیگم لکھا ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے، تو

غالباً خورشید بیگم عرف ہوگا۔

(۳) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "۔۔۔۔۔۔ چون کہ آن مشفق تعدادِ مصارفِ شادیِ مجوزۂ خود تحریر نمودہ اند، لہذا حوالۂ خامۂ محبت نگار میشود کہ اول از تعدادِ مصارفِ شادی اطلاع نمایند کہ بعد دریافتِ آن درین خصوص تجویز مناسب بعمل خواہد آمد، چراکہ بمقتضای موانستِ و اتحادِ قدیمہ راقم را خوشنودیٔ آن مہربان در امورِ مناسبہ مد نظر است ۔۔۔۔۔۔ المرقوم ۱۸ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء

صفحہ ۴۷

(۱) سلطان سنجر بن ملک شاہ سلجوقی سنہ ۵۱۱ھ (۱۱۱۷ء) میں تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ یہ بڑا اولوالعزم اور صاحبِ جود و کرم بادشاہ تھا۔ اس کا ابتدائی عہدِ حکومت، فتوحات کی وسعت کی بدولت تاریخ کا روشن باب ہے۔ علم و ہنر اور شعر و سخن کا بھی بڑا قدر دان اور مربی تھا۔ رشید وطواط اور انوری وغیرہ اس کے درباری شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اس نے کاشانۂ انوری کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے دو بار شرف بخشا۔ آخر میں ترکمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہاں سے بدقت آزاد ہوا، تو ۱۴ ربیع الثانی سنہ ۵۵۲ھ (۱۱۵۷ء) کو دستِ قضا نے پکڑ لیا۔

(۲) شاہجہان ہندوستان کے مغل سلاطین کا پانچواں حکمران تھا۔ ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں رانی بالمتی، دخترِ راجہ اودے سنگھ والیِ جودھپور کے بطن سے پیدا ہوا۔ ۳۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں سلطنت کی مسند پر قدم رکھا۔ اور سنہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں عالمگیر اورنگ زیب کے حق میں تاج و تختِ ہند سے دست بردار ہو کر آگرے کے قلعے میں جا بسا۔ موجودہ دلی اسی کی آباد کی ہوئی ہے۔ بڑا سخی داتا اور شہرۂ آفاق قدر دانِ علم و ہنر بادشاہ گزرا ہے۔ دلی کی مسجدِ جامع اور لال قلعہ، اور آگرے کے عدیم النظیر روضۂ تاج محل کا بانی ہے۔ اس کی قدردانی اور قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ محمد جانِ قدسی اور کلیم ہمدانی کو قصیدوں کے صلے میں روپیوں سے تلوا دیا۔ حسنِ اتفاق کہ دونوں ساڑھے پانچ ہزار روپے بھر نکلے۔ قدسی کو دوبار خلعت اور دو ہزار روپے عطا ہوئے۔ کلیم کو جشنِ وزنِ شمسی کی تقریب میں ۱۰ ہزار روپے کا صلہ عطا کیا۔ بعض شاعروں کے منہ ہیرے اور موتیوں سے بھر دیے۔ اس نے آگرے میں سنہ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں وفات پائی اور تاج محل میں اپنی بیوی کے برابر مدفون ہوا۔

(۳) باقر علی خاں کے لیے دیباچۂ پنج آہنگ "خاندانِ سلیمی" ملاحظہ ہو۔

(۴) میرزا صاحب نے "کرتا ہے" لکھا ہے لیکن یا تو "کرتا ہوں" ہونا چاہیے اور یا "کرتی ہے"۔ چونکہ میرزا صاحب تمام دلی والوں کی طرح مرکب مصادر میں جزوِ اول کی تانیث کی صورت میں علامتِ مصدر "تا" کو "تی" سے بدل دیتے ہیں اسلئے میرے نزدیک "ہوں" کی جگہ "ہے" سہواً لکھا گیا ہے۔

(۵) اس عریضے کی تاریخوں میں میرزا صاحب سے سہو ہوا ہے۔ انھیں سنہ ۱۲۸۴ھ اور ۱۸۶۷ء لکھنا چاہیے تھا، مگر ۱۲۳۸ھ اور ۱۸۶۶ء لکھ گئے ہیں۔ اسی طرح انگریزی مہینے کا نام بھی رہ گیا ہے۔ البتہ لفافے کی تاریخ میں ماہ و سنہ انگریزی یوں لکھا ہے: ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء۔ لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا نوٹ ہے: "پیش نمودہ شد۔ ہنوز حکم تحریر جواب صادر نشدہ۔ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء"

صفحہ ۷۵

(۱) اس عریضے کے جواب میں لکھا گیا تھا: "...فی الحقیقت مزاج راقم از مرکز اعتدال منحرف شدہ بود، حالا ہم طبیعت خوب صاف نیست، تجویز استعمال مسہلات درپیش... ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ء"۔

(۲) نواب صاحب نے ۱۸ نومبر سنہ مذکور کو قطعے کی رسید میں تحریر فرمایا: "...مفاوضۂ عدیم المعاوضہ مع یک قطعہ مضامین نو طرز نادر رنگ افروز چہرۂ وصول گردید، و از ملاحظۂ مضامین نوش انشراح دل بحصول انجامید"۔

(۳) عریضے کے لفافے پر ۳ نومبر ۱۸۶۷ء تاریخ درج ہے۔

صفحہ ۷۶

(۱) میرزا صاحب نے "گنگھائیں" لکھا ہے۔

صفحہ ۷۷

(۱) مثل میں محمد حسن خاں مالک اخبار دبدبۂ سکندری کی رسید شامل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اخبار کی قیمت کے میرزا صاحب کی اکتوبر کی تنخواہ میں سے مجرا کر کے انھیں دیے گئے تھے اس حساب سے سو روپے میں سے چودہ روپے بارہ آنے کٹتے ہیں۔ شاید پانچ روپے بارہ آنے کے فرق کی وجہ میرزا صاحب کا ضعف حافظہ ہے۔

(۲) لفافے پر تحریر ہے: "پیش نمودہ شد، ہنوز حکمی صادر نگردید۔ ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۶۷ء"

(۳) یہاں میرزا صاحب نے الفاظ کی قدیم ترتیب کو بدل دیا ہے۔

صفحہ ۷۸

(۱) سرکار کا یہ زبانی ارشاد غالباً کسی درباری کے توسط سے میرزا صاحب تک پہنچا ہوگا کیونکہ کسی فرمان میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) اس عریضے کے لفافے پر میرزا صاحب نے یکشنبہ دوم رمضان و ۲۹ دسمبر لکھا ہے۔ نواب خلد آشیاں نے جو ۲ رمضان ۱۲۸۴ھ (۶ جنوری سنہ ۱۸۶۸ء) کو جو فرمان تحریر فرمایا ہے، اس میں میرزا صاحب کے اصل مدعا کا کوئی تذکرہ نہیں۔

صفحہ ۷۹

(۱) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "توجہہ" لکھا ہے۔

(۲) اس رباعی کے ساتھ مثل میں کوئی عریضہ منسلک نہیں، صرف لفافہ شامل ہے، جس پر انگریزی تاریخ ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۶۸ء تحریر ہے۔ رباعی کی رسید میں نواب خلد آشیاں نے ۱۰ شوال سنہ ۱۲۸۴ھ (۵ فروری سنہ ۱۸۶۸ء) کو تحریر فرمایا: "...قطعۂ مبارکباد عید الفطر بطرز نو و مضامین شستہ، افزایش سرور گشتہ، ساز رنگ تہنیت و انبساط افزود"۔ اس فرمان میں

رباعی کو قطعۂ مبارکباد لکھنا کتابت کا سہو ہے۔

صفحہ ۸۰

(۱) عریضے کے لفافے پر "دوشنبہ نہم مارچ سنہ ۱۸۶۸" درج ہے۔

(۲) کاغذ سے ہنڈوی مراد ہے۔

(۳) عریضے میں کاتب کا نام اور تاریخ کتابت دونوں درج نہیں۔ لفافے پر میرزا صاحب نے دوشنبہ ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء تحریر کیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ اولاً اس لیے کہ ڈاک خانے کی انگریزی مہر میں ۱۱ مئی درج ہے، ثانیاً اس لیے کہ عریضے میں تنخواہِ اپریل کی اطلاع دی ہے اور یہ مسلم ہے کہ اپریل کی تنخواہ اپریل میں نہیں ملتی، مئی میں ملتی ہے۔ اس لیے اس کو ۱۱ مئی سنہ ۶۸ء کا ہونا چاہیے۔

(۴) میرزا صاحب نے سہواً ۱۸۶۷ لکھ دیا ہے۔ صحیح تاریخ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸ء ہے، اس لیے کہ اولاً تو جون سنہ ۶۸ء کے نوشتہ عریضے میں اس کی رسید طلب کی ہے، اور اُس میں اس خط کو "سابق کا عریضہ" لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں عریضوں کے درمیان کسی تیسرے عریضے کا فصل نہیں تھا، ثانیاً اسی عریضے کے لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا حسب ذیل نوٹ ہے: "تصویر بعد ملاحظہ سپردِ سید مجاور علی صاحب شد۔ ۲ جون سنہ ۱۸۶۸ء" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ واقعہ سنہ ۶۸ء کا ہے۔ اگر سنہ ۶۷ء کا ہوتا تو اسی سال میرزا صاحب تقاضا ہی رسید کرتے، اور اُسی وقت سرکار یہ تصویر ملاحظہ فرما کر سید مجاور علی صاحب کو دیتے۔

صفحہ ۸۱

(۱) نواب صاحب نے جوابی فرمان مورخہ ۷ جولائی سنہ ۶۸ء میں تحریر فرمایا ہے: "شبیہ آن مشفق وصولِ شادمانی آوردہ از فرطِ محبتہا منظور شد۔" اس تصویر کے علاوہ میرزا صاحب نے جہاں جہاں اپنی تصویریں بھیجی تھیں، اُن کے لیے اردوی معلی (ص ۲۰، ۳۲، ۴۳، ۶۲، ۱۶، ۷۳، ۲، ۲۴، ۷۴، ۳) ملاحظہ ہو۔

(۲) اس عریضے میں صرف (طالب غالب) میرزا صاحب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ نیز کاتب نے بجائے دلجمعی کے دلجی لکھا ہے۔ اسپیر غالباً میرزا صاحب کی نظر نہیں پڑی۔

(۳) یہاں لفظ "میں" ساقط معلوم ہوتا ہے۔

(۴) مظفر حسین خاں بہادر ابنِ مسیح الدولہ حکیم علی حسن خاں بہادر جاوید جنگ ابنِ حکیم الملوک میرزا علی خاں بہادر لکھنوی نواب خلد آشیاں کے مصاحب تھے۔ ان کے والد مسیح الدولہ شاہِ اودھ کے طبیبِ خاص تھے۔ سلطنتِ اودھ کی بساط اُلٹ جانے کے بعد یہ خاندان بھی ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ رامپور اُس زمانے میں صاحبانِ علم و ہنر کا ملجا و ماوی تھا۔ مظفر حسین خاں اور اُن کے بھائی احسان حسین خاں نے بھی سنہ ۱۸۶۷ء میں اس دربار دُربار کا قصد کیا۔ نواب خلد آشیاں نے ان دونوں کی کما حقہٗ قدر و منزلت کی۔ مسیح الدولہ صاحبِ علم اور ایک نہایت عمدہ ذخیرۂ مخطوطات و مطبوعات کے مالک تھے جو اُن کے انتقال کے بعد اُن کے دونوں بیٹوں کو وراثت میں ملا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کی

ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ مولانا شبلی نے یہ کتاب خانہ دیکھا تھا اور وہ اس کی جامعیت اور ندرت کے بیحد معترف تھے۔ مظفر حسین خاں سے نواب صاحب نے اس ذخیرے کا ایک معقول حصہ خرید کر سرکاری خزانۂ کتب میں شامل فرمایا تھا۔ ان کتابوں پر مظفر حسین خاں کے دستخط ثبت ہیں، اور متعدد نسخوں پر جابجا حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ خود ان کے اپنے مصنفہ متعدد رسالے بھی کتب خانے میں موجود ہیں۔ یہ عربی زبان میں فلسفہ و حکمت پر لکھے گئے ہیں۔ میرزا صاحب سے ان کے روابط تھے۔ جب رامپور آئے، تو میرزا صاحب نے منشی سیلچند سے ان کی درباری قدر و منزلت کے متعلق استفسار کیا تھا۔۔۔۔ ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱۲۷۔

احسان حسین خاں نے ۵ رجب سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کو کربلای معلیٰ میں انتقال کیا (کلیات منیر: ۵۳۵) اور مظفر حسین خاں سنہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں فوت ہوئے (ایضاً: ۷۴۵)

صفحہ ۸۲

(۱) اس خط میں خلافِ دستور میرزا صاحب نے دعائیہ شعر نام اور تاریخ کے بعد لکھا ہے۔

صفحہ ۸۳

(۱) یہ بچت انگریزی تنخواہ کو آمدنی میں شامل کر لینے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سہ ماہی سود کے علاوہ کلی صرف نو سو اٹھ روپے شاگرد پیشہ ہی کے رامپور کے سو روپے میں سے منہا کر دیے جائیں، تو ۳۲ روپے بچتے ہیں۔

(۲) شاگرد پیشے کی تنخواہ کا ذکر عریضہ ۱۰ میں بھی گزر چکا ہے۔

(۳) اصل میں سود کی دال ساقط ہے۔ اسی سہ ماہی سود کی مقدار کے متعلق سرور کو لکھا ہے: "دو تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائی قرض معہ ۹/۱ بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے۔ مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء میں تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپیہ سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپیہ مہینا آیا۔ معہ ۹/۱ کے ساٹھ رہیں گے۔

کچھ رامپور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش وناخوش گزارا ہو جاتا ہے۔" (اردوی: ۱۰۳، لاہور ایڈیشن)

(۴) لفافے کی پشت پر لکھا ہے: "پیش نمودہ شد۔ ہنوز حکمے صادر نگردید ۲۳ اکتوبر ۱۸۶۸ء"

صفحہ ۸۴

(۱) اس عریضے کے لفافے پر ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء درج ہے، حالانکہ ڈاک خانے کی مہر کے اندر بھی ۷ تاریخ ہی مندرج ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ سہواً لفافے پر ۱۵ دسمبر لکھا گیا ہے۔ لفافے کی پشت پر نوٹ ہے: "پیش نمودہ شد۔ حکم صادر نشد۔ ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء"

(۲) اس لفظ کو ہم نے قرأتِ اس اور رعشے کی بنا پر "قرضخواہ ہوں" لکھا ہے

(۳) اصل میں ۱۲۵۸ لکھا ہے۔ اور لفافے پر دہم جنوری سنہ ۱۸۶۹ء تحریر ہے۔ یہ میرزا صاحب کا آخری تحریر ہے۔ حسین علی خاں کے عریضے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری کی تنخواہ

۱۵ فروری کو میرزا صاحب کے انتقال سے ایک گھنٹہ قبل پہنچی تھی' اس لیے اُس کی رسید اپنے قلم سے نہ لکھ سکے۔ دوسرے روز حسین علی خاں نے سرکار کو میرزا صاحب کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: "بتاریخ ۱۵ فروری سنہ حال' مطابق ۲ ذیقعد روز دوشنبہ وقت ظہر جناب داداجان صاحب قبلہ نواب اسد اللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ صاحب نے اس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ فدوی کچھ عرض نہیں کرسکتا کہ کس قدر رنج والم اس سانحۂ جانگزا و جگر خراش سے لاحق ہوا ہے۔ اور نیز جناب دادی صاحب مدظلہ کا حال اس رنج سے عالمِ پیری میں ایسا ہوگیا ہے کہ گذارش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حضور کا نوازش نامہ مع ہنڈوی یک صد روپیہ بابت تنخواہ جنوری سنہ ۶۹ء کے ۱۵ فروری کو ایک گھنٹہ پہلے انتقال داداجان صاحب سے شرفِ صدور لایا تھا۔ رسید ہنڈوی واسطے اطلاعِ حضور کے عرض کی گئی۔"

فروری کے چودہ دن کی تنخواہ کی رسید حسین علی خاں نے ۱۱ مئی سنہ ۶۹ کو اپنی مُہر لگا کر دہلی سے روانہ کی تھی' جو اُن کے خطوط کے فائل میں منسلک ہے۔ مگر اُن کے مکتوب بنام سیکرٹری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۶ ماہِ مذکور تک تنخواہ کی ہنڈوی انھیں نہیں ملی تھی ۱۲ صفر ۱۲۸۶ھ کے ایک نوٹ سے پتا چلتا ہے کہ اُس تاریخ سے قبل رقم یہاں سے بھیجدی گئی تھی۔ یہ تاریخ ۲ جون سنہ ۱۸۶۹ء کے مطابق ہے جسین علی خاں نے اپنے ۱۲ جون کے عریضے میں اس کے وصول کا ذکر کیا ہے۔

صفحہ ۸۵

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے لفافے پر لکھی تھی۔

صفحہ ۸۶

(۱) چیف کمشنر سے لارڈ لارنس مراد ہیں' جو ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۴ء تک پنجاب کے چیف کمشنر اور بعد ازاں وایسرائے بنادیے گئے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ الصفحہ ۶۶

(۲) کمشنر دہلی سے چارلس سانڈرس مراد ہیں۔ ان کا حال معلوم نہ ہوسکا۔

(۳) اس زمانے میں دہلی کے کلکٹر فلپ ہنری اجرٹن' آئی' سی' ایس تھے' یہ ۹ اگست ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں ہندوستان آئے۔ شمال مغربی صوبے میں سنہ ۱۸۵۰ء تک خدمات انجام دیں سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۸۵۹ء تک دہلی کے مجسٹریٹ اور کلکٹر رہے لیکن سنہ ۵۷ کے محاصرۂ دہلی میں رخصت پر تھے۔ اکتوبر سنہ مذکور میں واپس آکر بڑی مضبوطی سے شہر اور ضلع میں امن و امان کو بحال کیا۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں امرتسر کے کمشنر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۸ء میں راولپنڈی تبادلہ ہوا۔ ۱۷ جنوری سنہ ۱۸۹۳ء تاریخ انتقال ہے

(۴) اس لفظ کو میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن صحیح "ریونیو بورڈ" ہے۔

(۵) اس سلسلہ میں جمعہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۵۸ء کو تفتہ کو لکھا ہے: "وہ عرضی میری سرجان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گذری۔ اُس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمۂ سائل کے پاس بھیجدی جاے اور یہ لکھا جاے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی

میرے پاس آگئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اُس میں ملفوف کرکے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔

اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے یہاں گیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اُس حکم کے نہیں کی۔ پرسوں تو اُن کے ہاں یہ رو بکاری آئی ہے۔ دیکھیے مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے، جو اُس کو دیکھیں گے۔

بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا، اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

بھائی، ہدایت تو اچھی ہے، نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور راجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے، مشتمل اُس حکم پر خط میرے نام آیا ہے حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملے نے خط نہ لکھا، صرف وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔" (اردوی: ۸۵، لاہور ایڈیشن؛ خطوط: ۱، ۱۳۱)

صفحہ ۸۷

(۱) لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اسے لکھ تو ۲۴ تاریخ ہی کو لیا تھا، مگر ارادہ تھا کہ ۲۵ کو پوسٹ کرائیں گے، اس لیے ۲۵ مارچ تاریخ لکھدی تھی، بعد ازاں از راہِ عجلت ۲۴ ہی کو ڈاک میں ڈالوا دیا۔ اصل عبارت یہ ہے: "در شہرِ رامپور موصول و بخدمت نواب صاحب مشفق و مکرم، مظہرِ لطف و کرم، نواب زین العابدین خاں صاحب عرف کلن میاں سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد، از غالبِ یکرنگ، بیرنگ۔ مرسلہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء، فروری۔ جواب طلب و شتاب طلب ۱۲۔ چون عجلت در ارسالِ مکتوب می بایست، ہم بروزِ چہارشنبہ آخرِ روز ۲۴ مارچ فرستادہ شد۔"

(۲) یہ خط میرزا صاحب نے زین العابدین خاں کے اصل خط کے حاشیے پر نقل کرکے منشی سیلچند صاحب کو بھیجا تھا۔ زین العابدین خاں کے خط کی عبارت یہ ہے: "نواب صاحب مشفقِ مہربان، کرمفرمای دوستان، مجموعۂ خوبیہای بیکران، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلامِ مسنون و اشتیاقِ ملاقاتِ مسابہجت مشحون، یہ چند خزف ریزے بھیجکر تکلیف دیتا ہوں کہ نگاہِ گوہر سنج سے ملاحظہ کرکے اغلاطِ محاورات، و تراکیب، و سستی بندش و تعقیداتِ صوری و معنوی، و تنافرِ الفاظ، و ابتذالِ مضامین، جس جگہ واقع ہو مطلع فرمائیے۔ فقط۔ امرِ مستفسرۂ سابق میں صدورِ مہربانی نامۂ نامی نے خلجان رفع کیا۔ جواب اس کا بھی اگر جلد عنایت ہو، بعید از نشاطِ دیرینہ سے نہ ہوگا۔ زیادہ شوق و بس۔ فقط نگاشتہ، دہم مارچ سنہ ۱۸۶۵ء مقام جے پور۔"

صفحہ ۸۸

(۱) یہ خط دیوانِ بیتاب قلمی کے ورق ۸۴ الف کے حاشیے پر میرزا صاحب نے لکھا ہے آخر میں تاریخ نہیں ہے۔ لیکن دوسرے خط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء سے قبل لکھا گیا تھا۔

صفحہ ۸۹

(۱) دیوانِ مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۹۰

(۱) دیوانِ مطبوعہ میں "میں بھی" ہے۔

صفحہ ۹۱

(۱) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
(۲) مطبوعہ میں دوسرا مصرع یوں چھپا ہے: "میں تم پہ مبتلا ہوں، وہ ہے مبتلای شمع"
(۳) مطبوعہ: "ہیں زخم اور آبلہ"
(۴) مطبوعہ: "جب قابلِ بیاں ہی نہ اپنا رہا قلق"

صفحہ ۹۲

(۱) مطبوعہ: "پھوڑا ہوا ہے پک کے"
(۲) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ دیوانِ مطبوعہ اور اُس قلمی نسخے میں جو میرزا صاحب کے اصلاحی نسخے سے منقول ہے، یہ غزل نہیں ہے۔
(۳) دیوانِ مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔
(۴) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔
(۵) مطبوعہ: "لکھیں نہ نامے میں"۔ دراصل قلمی صحیفے میں یہ اصلاح غالباً خود بیتاب نے کی ہے۔

صفحہ ۹۳

(۱) مطبوعہ: "قتل کا اپنے خوش آیا ہے یہ ایما ہم کو"۔ یہ بعد کی ترمیم معلوم ہوتی ہے۔
(۲) مطبوعہ: "جوشِ وحشت میں ہوں کیوں ننگ میں عریانی کا"۔ یہ بھی بعد کی ترمیم ہے۔
(۳) میرزا صاحب کی یہ اصلاح درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ "مقتضی" مصدر اقتضا کا اسم مفعول ہے، اور جمع اس کی مقتضیات، بفتح یا بغیر تشدید ہوگی، نہ کہ مقتضیات جیسا کہ میرزا صاحب نے لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ میں مصرع اس طرح درج کیا گیا ہے: مقتضای بشری سے تو نہ تھا صبر مگر۔
(۴) مطبوعہ: "لگا"
(۵) مطبوعہ میں یہ غزل ردیف نون میں درج کی گئی ہے۔ مگر مطلع کی حسبِ ذیل صورت ہے
عبث ہیں خونفشاں یہ دیدہ و مژگاں تر دونوں فغان و نالہ ہیں تو ہوں، مگر ہیں بے اثر دونوں

صفحہ ۹۴

(۱) مطبوعہ: "رکھے منہ کیوں کر وہ میرے سینۂ پُر داغ پر"
(۲) مطبوعہ: "توڑا کر"

(۳) مطبوعہ: "حشر کے دن ہوگی اُس سے ایک صحبت اور بھی"۔
(۴) مطبوعہ: "خم ہے یہاں گردن"۔
(۵) مطبوعہ میں یہ شعر اسی طرح باقی رکھا گیا ہے۔

صفحہ ۹۵

(۱) یہ خط دیوان کے آخری سادہ صفحے پر لکھا گیا ہے۔

صفحہ ۹۶

(۱) مطبوعہ میں یہ شعر نہیں ہے۔
(۲) مطبوعہ میں اس مطلع کو اس طرح چھاپا گیا ہے: "غنیمت ہے، زباں پر اپنی تو ذکر اُس کا لاتا ہے
یہی چرچا کیے جا، مجھ کو، ای ناصح، خوش آتا ہے"۔
(۳) مطبوعہ: "وہم ہے آفت"۔
(۴) مطبوعہ: "ہو گیا"۔

صفحہ ۹۷

(۱) مطبوعہ: "ناصح، تم رہے عقبیٰ میں تو کام آنے سے"۔
(۲) مطبوعہ: "ملا کر خاک میں بس جلد بے دہ"۔
(۳) مطبوعہ: "عشاق"۔

صفحہ ۹۸

(۱) بیتاب کا اس زمین میں دو غزلہ ہے، مگر یہ قافیہ یا اس مضمون کا شعر انھوں نے نہیں لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اپنی عادت کے خلاف پورا شعر خود کہہ کر لکھ دیا ہے۔
(۲) مطبوعہ میں یہ شعر اس طرح درج ہے:
مار ڈالا بیقراری نے، کوئی اللہ سے مانگ لائے اک ذرا سا صبر میرے نام سے
(۳) دراصل میرزا صاحب کی سمجھ میں صرف لفظ "یونہی" نہیں آیا تھا، جسے کاتب نے "کوہی" لکھ دیا تھا، ورنہ مصرع کے اور تمام لفظ صاف صاف تحریر ہوئے ہیں۔
(۴) مطبوعہ: "تھا بہت شوقِ طپش، لیکن ادب مانع ہوا"۔

صفحہ ۹۹

(۱) مطبوعہ: "عاشق ہیں، بآسانی اگر قتل کرے گا"۔

صفحہ ۱۰۰

(۱) بیتاب نے بھی غلط نہیں لکھا ہے۔ اصلاح کا منشا صرف حسنِ کلام بڑھانا ہے۔
(۲) مطبوعہ: "بغیر اُس کے پیوں خونِ دل، یہ ہے ساقی"۔

صفحہ ۱۰۱

(۱) اصل میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے: "نیکیوں کی تیرے جھکی زمین سر کچھ تو دیر کی"۔

صفحہ ۱۰۲

اصل میں مصرع کا پہلا لفظ "نرمش ہے" اور لفظ "آج" کاتب سے رہ گیا ہے۔
(۲) مطبوعہ: "طبانچہ"۔

(۳) مطبوعہ میں یہ قصیدہ نہیں ہے۔

صفحہ ۱۰۴

(۱) میرزا صاحب نے آراستگی پر اسی طرح اعراب لگائے ہیں۔ مگر مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) مطبوعہ: "پہنچتی ہے"

(۳) یہ کتابت کی غلطی ہے۔

(۴) مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۰۵

(۱) مطبوعہ میں اس اصلاح کا اتباع نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) مطبوعہ: "آگاہ تو ہے"

(۳) یہ کتابت کی غلطی ہے۔

صفحہ ۱۰۶

(۱) مطبوعہ میں یہ شعر نہیں ہے۔

صفحہ ۱۰۷

(۱) مطبوعہ: "عدو کے پر بتانے کی نہیں ہے"

(۲) مطبوعہ: "تو اُن کو کرے پیار"

(۳) مطبوعہ میں یہ رباعی نہیں ہے۔

(۴) یہ کتابت کی غلطی ہے۔

(۵) اصل: "مظلومین" یہ کتابت کی غلطی تھی۔ در اصل آسے مظلومی لکھنا چاہیے تھا، جس سے مظلوم ہونا مراد ہے۔ میرزا صاحب مظلوم کی جمع مظلومین سمجھے۔ چونکہ یہ لفظ غیر موزوں سا تھا، انھوں نے "مقتولوں" سے بدل دیا۔ حالانکہ زیادہ موزوں وہی "مظلومی" ہے۔

صفحہ ۱۰۸

(۱) یہ غزل میرزا صاحب کی اُس غزل کی ہم طرح ہے، جس کا مقطع ہے: ابھی ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالب!! آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آتے۔ پوری غزل کے لیے غالب نامہ ۴۳۰، طبع دوم ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۱۰۹

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کے لفافے پر لکھی تھی۔

صفحہ ۱۱۰

(۱) یہ خط نواب فردوس مکاں کے غسلِ صحت کی تاریخ کے متعلق لکھا گیا تھا۔ سرکار کے مرض اور افاقے کے متعلق عرائض ۳۶ تا ۴۴ اور اُن کے حواشی ملاحظہ ہوں۔

(۲) منشی صاحب نے میرزا غالب کے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۶۴ء کے جواب میں جو خط تحریر کیا تھا، اُس میں ذکرِ ماہِ جشن کے بعد درخواست کی تھی کہ "ایک مادہ تاریخ کا فدوی نے نکالا ہے، سو عرض کرتا ہوں۔ اُمیدوار ہوں کہ اُس کے دو شعر موزوں

فرما کر عنایت نامہ موسومہ فدوی کے ہیں عنایت فرمائیے:

کاٹ کر سر اعدا عرض کرتو اے منشی   بندگانِ عالی کا آج غسلِ صحت ہے

اس شعر کا مصرعِ ثانی مادۂ تاریخ ہے۔ چونکہ اس کے اعداد ۱۸۶۶ ہوتے ہیں اس لیے ایک عدد کا تخرجہ کیا گیا ہے۔ فقرہ (کاٹ کر سر اعدا) بتاتا ہے کہ اگر سر اعدا یعنی حرفِ الف کے عدد کو، جو ایک ہے، مادۂ تاریخ میں سے کم کر دیا جائے، تو اعداد مطلوبہ ۱۸۶۵ حاصل ہو جائیں گے۔ چونکہ یہ امر قاعدۂ تاریخ گوئی کے عین مطابق ہے، اس لیے میرزا صاحب نے اس پر جو اعتراض کیا ہے، وہ درست نہیں۔

(۳) قصیدۂ تہنیت عریضۂ نمبر ۴۴ کے حاشیے میں درج ہے۔

(۴) شاہ کبیر الدین صاحب سہسرام کے ایک بزرگ تھے۔ مزید حالات کا پتا نہیں۔

(۵) میرزا صاحب نے سہواً ماہِ آیندہ کو رجب لکھ دیا ہے ورنہ فی الواقع اگلا مہینا رمضان کا تھا اس لیے کہ عریضہ ۴۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس سال ۱۳ دسمبر کو رجب کی بھی ۲۳ تاریخ تھی۔ لہذا ۱۹ جنوری کو، ۱۹، یا ۲۰ شعبان ہوگی، اور شعبان کے بعد رمضان آتا ہے، رجب نہیں آتا۔

صفحہ ۱۱۱

(۱) زین العابدین خاں کا خط میرزا صاحب کے مکتوب (۱۲۰) کے حاشیے میں نقل ہو چکا ہے

(۲) عریضۂ نمبر ۴۴ مراد ہے

(۳) سفر: ضرور۔

(۴) یہ عریضہ کلیاتِ نثر فارسی میں شامل نہیں ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ رامپور سے نقل روانہیں کی گئی۔

(۵) اس کے آخر میں میرزا صاحب نے اپنا نام اور تاریخ کتابت کچھ نہیں لکھا ہے۔ پشتِ ورق پر کسی اہلکار دارالانشا نے حسبِ ذیل یادداشت لکھی ہے: "قصیدہ ہای شاعران مرسلۂ مرزا نوشہ صاحب ۲۹ رجب سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کی ۱۵ یا ۱۶ کو میرزا صاحب نے یہ خط لکھا ہوگا۔ خط کا لفافہ ضائع نہ ہو جاتا، تو تاریخ کا واقعی علم ممکن تھا۔

صفحہ ۱۱۲

(۱) سید فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی، سید عبدالحی عرف میر سید احمد احمدؔ تخلص کے بیٹے اور حکیم حاجی مولوی سید غلام یحییٰ کے پوتے ہیں۔ نسب میں حسینی سید اور بلگرام کے باشندے ہیں۔ اپنے نانا کے گھر مارہرے میں پیدا ہوئے "شمس الضحیٰ" سے سالِ ولادت ۱۲۴۹ھ نکلتا ہے۔ رشحاتِ صفیر (صد ۱۹، مطبع نور الانوار، آرہ، ۱۲۹۳ھ) میں خود اپنا حال اس طرح لکھا ہے:

" خالقِ بے ہمتا نے قصبۂ مارہرہ ضلع کول میں مجھے خلعتِ ہستی پہنا دیا، جو میرے نانا حضرت شاہ عالم صاحب علیہ الرحمہ، سجادہ نشینِ مارہرہ کا مسکن ہے، جن کو حضرت غالب دہلوی نے پنج آہنگ اور اردوی معلی وغیرہ میں پیر و مرشد کر کے یاد کیا ہے، اور قصبۂ بلگرام کو

میرا وطن کیا، جو صوبۂ اودھ میں نام بر آوردہ اور معدنِ علم وفن ہوتا آیا ہے، اور شیخ اتان علی سحر اور میرزا سلامت علی دبیر لکھنوی اور مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی کا شاگرد اور شیخ امداد علی بحر لکھنوی کا مقلد اور میر مظفر علی اسیر لکھنوی کا معتقد ہے مگر آب و دانہ پانچ برس کی عمر میں مجھے قصبۂ آرہ ضلع شاہ آباد، قریب عظیم آباد پٹنہ کے لایا۔ اور شوقِ علم نے ہمیشہ اس نزاد بہ نشین نادانی کو اکثر بلاد و امصار میں صورتِ پرکار پھرایا۔ بارہا لکھنؤ کی سیر کی، دہلی گیا۔ اساتذۂ سابق سے سابقہ رہا۔"

استادِ من بشیوۂ اُردو زبان سحر | کز ناسخ است یافتہ تمغای شاعری
در مرثیہ دبیر بود اوستادِ من | مقبولِ کبریا شدہ از مدحِ حیدری
غالب بود بہنر و بہ شعرم بیا زری | کو ہست در زمانہ علم با ہنروری

(ایضاً: ۱۴)

میرزا صاحب نے رشحاتِ صفیر کی تقریظ میں ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"سیدی، سندی، نورِ بصر، لختِ جگر، قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کے طولِ عمر و دوامِ دولت و بقای اقبال کی دعا مانگتا ہوں، جن کو سیدِ فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ سبحان اللہ! تفرقۂ تذکیر اور تانیث کی تقریر کہ وہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے، کس لطف سے ادا ہوئی ہے۔ ہر چند اس راہ سے کہ سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں، قواعد تذکیر و تانیث کے منضبط ہونے کے خود معترف ہیں، لیکن قوتِ علم اور حسنِ فہم اور لطفِ طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہنچائے ہیں کہ مجھے دل سے پسند آتے ہیں۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظورِ انظار اولوالابصار رہے گا۔ جو صاحب اس کو مطالعہ فرمائیں گے نفع بھی پائیں گے، اور لطف بھی اٹھائیں گے۔ مؤلف صاحب جو کہ میاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں، سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرات کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے، جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے۔

مادحِ خورشید مدّاحِ خودست | کہ مرا دو چشم سر نامرمدا ست

۱۲۳۸ ھ
اسد اللہ

داد کا طالب غالب

صفیر نے ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) میں انتقال کیا (خمخانہ: ۵، ۳۳۹، تاریخ لطیف ۱۶۳)

اس قصیدے کے ہر شعر کا پہلا حرف ملایا جائے تو "نواب مستطاب معلی القاب جناب نواب کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہ والی رام پور" بنتا ہے۔ اسی کا نام صنعتِ توشیح ہے۔ حاشیے کا حلِ لغات خود صفیر کا نوشتہ ہے۔

قصیدہ بہ صنعتِ توشیح در مدحِ نواب مستطاب معلی القاب جناب نواب کلبِ علی خاں بہادر دام اقبالہٗ والیِ رامپور

نوید ساقیٔ رنداں کہ ہے طرب کا ظہور — لنڈھا دے شیشۂ صہبا پلا دے جامِ سرور

وہ اٹھا ابر وہ بادل چلے برسنے کو — وہ بیٹھا قافلۂ رنج و الم بفضلِ غفور

اڑی نقاہتِ نرگس بڑھی وجاہتِ گل — کھلی صباحتِ نسریں گھٹی ملاحتِ سورا [۱]

بہار جلوش میں ہے پھولوں کے رنگ ہے آج — ہزار عیش میں ہیں وصلِ گل ہے گل گل دور [۲]

مرا بھی خانۂ دل نقش ہائے رنگیں سے — کیا ہے صنعتِ معمارِ طبع سے معمور

سبب نہ پوچھ کہ دل کیوں ہے خانۂ باغِ طراز — جہت نہ ڈھونڈ کہ ہے شبستاں کیوں یہ پر نور

تجھے ہو آج مبارک یہ دور دورِ شراب — تجھے ہو آج سزاوارِ عیش کا مذکور

طرب طرب نہ کہے کھل کے کس لیے غنچہ — کہ آج مسندِ دولت ہے نور سے معمور

امارت آج ہے نازاں کہ زیبِ مسند ہیں — جنابِ کلبِ علی خاں غیور ابنِ غیور

بنایا دورِ فلک نے زمیں کو رشکِ ارم — کہ رامپور ہوا ہے تمام دارِ سرور

میں اس خوشی میں پڑھوں اک مطلعِ رنگیں — کہ جس کے لکھنے کو آئے بیاضِ دیدۂ حور

مطلع

عنایت اُس کی نہ چاہے اگر نظامِ امور — تو سیلِ دیدۂ [۳] سلطاں ہو خانۂ دستور [۴]

لیاقتِ ازلی سے ہے مطمئن عالم ق — جلالتِ ابدی سے ہیں منتشر جمہور

یہ اس لیے ہے کہ ایذا نہ دے کسی کو کوئی — وہ اس لیے ہے کہ کرنے ظلم اُن کی حد سے دور

اسیرِ دامِ خطِ دست ہیں ہے دزدِ حنا — جو چورِ رشتۂ شمع کا گلگیر نے کیا محصور

لوائے عدل ہوا سایہ افگنِ سرِ خلق — ہما کے سایے کے خواہاں نہیں ہیں اب جمہور

قلوبِ خلق ہیں یوں اُس کے حکم سے خورسند — کہ جیسے رشح کو ہو انتعاشِ طلعتِ حور

اس انتظام کو دیکھو یہ عدل ہے نایاب — زمیں پر ایک جگہ ہے مقامِ سایہ و نور

بری ہیں درد و غم و رنج سے تمام قلوب — ہوئے ہیں فرطِ بشاشت سے دل برائے سرور

جمال و ظلم سے اُمید میں غنی و فقیر — جلال و رعب سے دہشت میں قیصر و فغفور

نہیبِ عدل اگر روکے ظلمِ حادثہ کو — بری ہو نامِ یتیمی سے گوہرِ منثور

اشارہ ہو جو ذرا عدلِ ذاتِ اقدس کا — کتاں ہو ماہ سے زائل تو آفتاب سے نور

بلند عدل کا پایہ ہوا یہ اُن کے سبب ق — کہ اب ہے فکرتِ کسریٰ پہنچنے سے معذور

نیابت اُن کی کرے آ کے ہاں اگر کسریٰ — یقین اتنا تو ہے بعدِ انقضائے دہور

وہ پہنچے رتبۂ اول پہ عدل کے لیکن — جو اور قصد یہ ہو گام سنج کیا مقدور

اٹھائے چوبِ ادب سر پر اُس کے شحنۂ رعب — بٹھائے مہرِ جلالت کے سایے میں گو سے دور

ہدایت اُس کو برایا کی دمبدم ملحوظ — رعایت اُس کو رعایا کی رات دن منظور

کسی کا رنگ بگاڑے نہ کوئی باہم دگر — نہ لے سیاہیٔ قادِ حل سفیدیٔ کافور

(۱) سور معنی رنگ سا سرخ ۱۲ غیاث (۲) گل گل یعنی کادِ کادِ ۱۲ برہان (۳) سیل تیہدن یعنی گور گردن ۱۲ برہان - (۴) یعنی وزیر ۱۲

لبِ شکایت و فریاد کیوں نہ بند رہیں
مقامِ امن میں ہیں رات دن وحوش و طیور

بندھے ہیں ایک ہی رسی میں ظلم و فتنہ و شر
کہ روزِ شحنۂ انصاف اُس پہ ہے مامور

علوِ جاہ و مراتب میں گرد ہے دارا
سموِ شان و جلالت میں ہیچ ہے فغفور

لکھوں وہ مطلعِ رنگیں میں اب سراپا میں
کہ آپ آپ سراپا ہو جس سے ابروئے حور

مطلع

یہ خال در رخ ہے کہ ہے اتصالِ ظلمت و نور
کہ جس طرح ہے بہم ربطِ فلفل و کافور

خدا نے حسن دیا، حسن پر ریاست دی
وہ آفتاب کا جلوہ، یہ ماہتاب کا نور

اسی طرح کا ہے، بلبل ترے گلوں میں رنگ
یونہی ہے سرو میں، قمری، جمالِ قد کا ظہور؟

نمودِ خط نے کیا حسنِ خط کو روز افزوں
جہاں میں دیکھی سواد و بیاضِ دیدۂ حور

صباحتِ رخ و کیفیتِ ملاحتِ خال
بہم ہوئیں، تو بڑھا ذوقِ دیدۂ جمہور

الف ہے بینیِ روشن مگر امارت کا
یہی الف سرِ اقبال کا ہے تاجِ سرور

حسین، رشکِ قمر، نوجوان، جواں دولت
شجاع، باذلِ دوراں، بلند قدر، غیور

بہائی آب گہر آب و تابِ دنداں نے
صدف کا گھر ہوا تاراجِ سیلِ قلزمِ نور

کھلا ہو لعل کہاں لب کے رنگ پہ سرسبز
تری نظر کا ہے، اے جوہری صریح قصور

ہوا ہے مطلعِ تازہ کا پھر مجھے سودا
مخاطب اُن سے ہوں باطن میں، ظاہراً ہو دور

مطلع

اگر حضور کو ہو پرورش ذرا منظور
دُرِ یتیم کو ہرگز نہ کوئی دیکھے غور

دکھائیں پائی طلب سے جگا کے روزِ نشاط
اگرچہ طالعِ خفتہ ہو خواب سے مجبور

رہے خیالِ کرم میں حضور کے جو کوئی
تو اُس کے مطلبِ خاطر کا غیب سے ہو ظہور

دیا ہے آپ کو حق نے وہ دل کہ صورتِ ابر
قریب اُس سے ہے سیراب، فیضیاب ہے دور

اگرچہ دور ہوں میں آستانِ دولت سے
مگر حضور کے الطاف کا اگر ہو صدور

مجھے ہو دورِ قریب اور قرب عزت ہو
رہوں ہمیشہ میں انعام و لطف سے مشکور

اگرچہ مجھ کو ہے مشکل یہ منزلت پانی
کہ مدح خواں ہوں زمانے میں آپ کا مشہور

قلم کو میرے نہیں آج تک یہ راہ ملی
سخن نے میرے نہیں پایا مدح کا دستور(۱)

بندھے ہیں لب مرے، گویا ہے مہرِ خاموشی
ہزار گنجِ سخن اور طبع ہے گنجور(۲)

اشارہ چاہتی ہے طبعِ مدح سنج مری
کہ تا بحشر ہو جس کا جہان میں مذکور

لکھوں وہ مدح کہ جو یادگارِ عالم ہو
پڑھوں قصیدہ وہ جس سے حضور ہوں مسرور

ہوا ہے کیا تجھے کلکِ صفیرِ مدح سرا
نہیں ہے مدح سراؤں کا یہ کہیں دستور(۳)

وہ آفتاب ہے، تو ذرہ کیا ہے مدح تری
ہزار تجھ سے ہیں مدحت سرا قریبِ حضور

اگر کرم ہو انھیں کا تو ہاں کہوں میں بھی
کہ مجھ کو بخت پہ اپنے ہے کبر و ناز ضرور

لے اب دعا کا محل ہے اٹھا دے دستِ دعا
کہ طبع ہوتی ہے آمین کہنے پر مامور

یہ آفتاب ہے جب تک فلک پہ جلوہ فروز
یہ ماہتاب ہے جب تک زمین پہ قاسمِ نور

(۱) یعنی اجازت۔ (۲) خزانہ دار ۱۲ (۳) یعنی قاعدہ و طریقہ ۱۲

رہے حضور کے اقبال کو ترقی روز ۔۔۔ بڑھے حضور کی عمر اور جاہ و سور و سرور
الٰہی میری دعا یہ قبول کر لینا ۔۔۔ بحقِ احمد و آلِ رسولِ پاک و طہور (۱)
میری ہو مدح پسندِ طبیعتِ عالی ۔۔۔ لکھوں اُنھیں کی ثنا میں جواب لکھوں میں سطور
پڑھوں مدام قصائد لکھوں دوام ثنا ۔۔۔ یہیں سے مدح سرا ہوں با بتہاج و سرور
وہ شہر شہر میں مشہور رہوں مرے ممدوح ۔۔۔ میں شہر شہر میں مداح اُن کا ہوں مشہور
رہیں وہ مسندِ دولت پہ جلوہ گر دائم ۔۔۔ رہوں میں مدح سرائی پہ رات دن مامور

(۳) خواجہ حالی مرحوم، خواجہ ایزد بخش کے بیٹے اور پانی پت کے رہنے والے تھے۔ سونی پت کے نہیں۔ جو میرزا صاحب نے سہواً لکھ دیا ہے۔ سنہ ۱۸۳۷ء کے قریب پیدا ہوئے عربی و فارسی کی تحصیل کے ساتھ شعر و سخن کا بھی مشغلہ جاری رکھا۔ میرزا غالب کے قابلِ فخر شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں، اور نئی طرزِ شاعری کے موجد ہیں۔ یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، مسدسِ حالی وغیرہ اُن کی تصنیفات ہیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔
یہ عرضی اور قصیدہ ان کے کلیات میں موجود نہیں ہے:

حاشیہ بوسانِ بساطِ فیض مناط، حضرت نواب کیوان جناب، جہانِ مطاع، جہانبانِ آب دام اقبالہٗ

بموقفِ عرض ۔۔۔ میرساند

بعد گذارشِ مراتبِ عجز و انکسار و تقدیمِ آدابِ تحیت و ثنا صوتی چند خارج از آہنگِ بری کشند، ہرچند سامعہ خراش است، اما شنیدنی دارد۔ دوش در عالمِ سرخوشی خیال بینی چند تازہ زبان در مدحِ بندگانِ حضور ترتیب میداد۔ ناگاہ دلِ سودا زدہ بمنازعت برخاست و گفت: "چیست کہ از چار سو ردی درہم کشیدہ سرِ نیاز براین آستانہ فرود آوردہ؟ مگر با ملازمانِ درگاہ سابقۂ معرفتی داشتہ باشی؟" گفتم: "درمیانۂ شاہ و گدا معرفت چگونہ تواند گنجید؟" گفت: "پس حلقۂ کوئی در دولت بچہ نسبت راست آید؟ نشنیدۂ کہ گفتہ اند سہ در میر و وزیر و سلطان را بی وسیلت مگرد پیرامن۔" گفتم: "آنجا کہ کرم عمیم است۔ بیگانہ حکمِ آشنا دارد۔" گفت: "یاد دارم کہ پیش از مسند آرائیِ بندگانِ حضور قصیدۂ متضمنِ مدحِ حضرتِ فردوس مکان بوساطتِ بعضی از اعیانِ حسن پور گذارش کردہ و از انجا نویدِ قبولی ہم ہنوز رسیدہ تا بصلہ و انعام چہ رسد۔ اکنون بکدام توقع این ہمہ شادمان بودۂ؟" گفتم: "شرمت بادا! مگر آگاہ نۂ از قولِ عرب کہ گفتہ اند: کَمْ تَرَكَ الْأَوَّلُ لِلْآخِرِ۔" گفت: "نہ ترا فضلِ مشہور، نہ ذکری سائر۔ سخن چون تو گمنامی بہ التفات چہ ارزد؟" گفتم: "در مذہبِ من حرام است ستایشِ کسی کہ از شہرتِ متکلم بحسنِ کلام وارسد، و از مَنْ قَالَ بِمَا قَالَ پی برد۔" گفت: "آخر عوض این مدیحہ سرائی چہ خواہی؟" گفتم: "خواہم آنچہ خواہم۔" گفت: "از طلبِ مجہولِ مطلق چہ خیزد؟" گفتم: "کار باروشن ضمیری است کہ گفتہ و ناگفتہ پیشش یکی است۔" گفت: "لیکن، اما از اظہارِ مدعا چہ خلل زاید؟" گفتم: "سائل را زبانی دارد۔" گفت: "چگونہ؟" گفتم: "ہمتِ ممدوح بلند تر از آن است کہ آرزوی

(۱) یعنی پاک ۱۲ ضیا منہ

سائل بدان تواند رسید۔" گفت: "اگر ہمچنین است بچہ نوع از بارینت ممدوح سبکدوش خواہی شد؟" گفتم: "تحیت این دو مصرع ؎ شکر بجا آر کہ مہمانِ تو روزیِ خود میخورد از خوانِ تو" گفت: "چہ در فارسی و اُردو ہم قدرتِ نظم و نثر باندازۂ بایست داشتۂ، تراچہ افتاد کہ صعب را بر ذلول اختیار نمودی، و خود را کاوش و دیگران را کاوش بر کاوش افزودی؟" گفتم: "ملاحظۂ فضل و شرفِ ذاتِ ممدوح نگذاشت کہ مکارم اخلاقش جز بہ اشرف لغات و افضل السنہ وصف کردہ شود و فضلِ عربی بر سائر السنہ، چنانکہ دانی، محتاجِ بیان نیست۔" القصّہ چون سخن بہ اینجا کشید دل را محلِ گفتگو باقی نماند۔ گفت: "این ہمہ کہ گفتی عین صواب است۔ اما اگر دعا باندازۂ ہمتِ ممدوح خواہند، چہ جواب خواہی داد؟" گفتم: "بیک بیتِ خود از این عہدہ بیرون آیم ؎

بقدرِ ہمتش نتوان دعا کرد
الٰہی، ہرچہ طبعش خواہد آن باد!

عرضی دعاگو، صفدر الدین، ابن الطاف حسین، مقیم دہلی متصل حوض قاضی مکان حکیم احسن اللہ خان

فَازَ الزَّمَانُ بِمَالِہٖ — مِنْ جَذْلِہٖ وَذُبَالِہٖ
سَاغَ التَّفَاخُرُ بِالْعُلٰی — لِشَرِیْفِہٖ وَرُذَالِہٖ
لَزِمَ التَّعَفُّفَ قَانِعًا — مَنْ کَانَ مِنْ سُؤَالِہٖ
نَالَ ابْنُ یُوْسُفَ نَوْلَہٗ — بِالْخَلْقِ دُوْنَ سُؤَالِہٖ
مِطْوَاعُ شَرْعِ الْمُصْطَفٰی — بِحَرَامِہٖ وَحَلَالِہٖ
لَا مَیْلَ فِیْ اَحْکَامِہٖ — لَا مَیْلَ فِیْ اَقْوَالِہٖ
لَا حَجْرَ فِیْ اِنْفَاقِہٖ — لَا حَصْرَ فِیْ اَمْوَالِہٖ
اَلْحُسْنُ مِنْ اَخْلَاقِہٖ — وَالْخَیْرُ مِنْ اَفْعَالِہٖ
اَلْفَتْحُ تَحْتَ لِوَائِہٖ — وَالنَّصْرُ خَلْفَ قِتَالِہٖ
اَلْحَقُّ اِسْمُ قَضَائِہٖ — وَالصِّدْقُ فِیْ تَمْنِ مَقَالِہٖ
اِنْ شِئْتَ تَعْرِفُ مَا التُّقٰی — فَانْظُرْ اِلٰی اَعْمَالِہٖ
اِنْ رُمْتَ تَدْرِیْ مَا النُّہٰی — فَارْقُبْ مَجَارِیْ حَالِہٖ
یَشْرِی الْمُنٰی مُتَتَابِعًا — بِعَطَائِہٖ وَنَوَالِہٖ
یَرْقَی الْعُلٰی مُتَنَاہِیًا — فِیْ فَضْلِہٖ وَکَمَالِہٖ
یُحْیِی الْوَرٰی وَیَمِیْنُہٗ — بِجَمَالِہٖ وَجَلَالِہٖ
یُرْوِی الْغَلِیْلَ بِلَفْظِہٖ — نِعْمَ الرَّوِیُّ فِیْ قَالِہٖ
یَشْفِی الْعَلِیْلَ بِلَحْظِہٖ — طُوْبٰی لِصَبٍّ قَالِہٖ
بِالْحَدْسِ فَاقَ اُولِی النُّہٰی — فَامْتَازَ عَنْ اَمْثَالِہٖ
مَا مِنْ مُحَالٍ مُہْلِکٍ — اِلَّا عَلَی اسْتِدْلَالِہٖ

لا کلُّ قصدٍ وافقا — إلّا الّذی فی بالِه
یغزو وینصرُ دائما — بیمینِه وشمالِه
یُغنی العداةَ کأنّه — لا عوذَ مِن مُرسالِه
وکأنّما خُلِقت الرّدی — مِن فوقَ مِن إرعالِه
کم طلعةٍ تجلو الاسی — منها بریقُ جمالِه
کم لهجةٍ تشفی الجوی — منها تهلّلُ یُرمقا لَه
إذ ما یُبادِرُ للوغی — کالنّصرِ مِن عُمّالِه
ومتی یُفیضُ علی الوری — فاللهُ باقٍ ما لَه
کم سائلٍ یسطو بِه — ثقةً بحُسنِ فعالِه
لولا الظنونُ مع الحِجی — لا بلّیتُ کونَ مثالِه
لزمَ العناءُ حسودَه — لا مرحبًا بِعضالِه
مَن لا أرادَ بقاءَه — قد حلَّ فی إبسالِه
یا مَن کفی أهلَ المُنی — مُتضاعفًا فی فالِه
قد دَلهتنی فاقةٌ — رِدنا بحالِ الدّالِه
لازلتَ مُحتدَّ الوری — بمُحصّلٍ وبالِه

(۳۱) حکیم فصیح الدین رنج میرٹھ کے باشندے اور قوم کے بنی اسرائیل تھے، عربی کی تحصیل کے بعد طب پڑھی اور اسی کو پیشہ بنا لیا۔ شعر و شاعری کا شوق اور میرزا صاحب سے تلمذ تھا۔ شعرائے اردو کا ایک تذکرہ، "بہارستانِ ناز"، ان کی تصنیف ہے۔ آقا حسن عرف میرزا صاحب نے توقیعاتِ کسریٰ کا اردو میں ترجمہ کیا اور مہاراجہ سردیپ سنگھ والیِ بلرام پور کی فرمائش پر مطبع ہنگامہ بہادری بلرام پور میں اس کی طباعت ہوئی تو رنج نے حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا تھا:

مسرت نے مژدہ سنایا مجھے — کہ احکامِ نوشیروانی چھپا
ہوا سن کے مسرور اور شادماں — دلِ غنچہ ساں، گل صفت کھل گیا
لکھوں اس کے چھپنے کی تاریخ میں — اسی فکر میں تھا میں بیٹھا ہوا
یکایک سنا لب سے ہاتف کے یوں — "یہ نسخہ ہے نو شادمانی سما" ۱۲۸۳ھ

(خمخانہ: ۳، ۵۰۷، ۵۰۵، ۱۴۲ احکامِ نوشیروانی: ۱۱۰)

قصیدہ در تہنیتِ جشنِ سکندر حشمت، دارا شوکت، فیض رسانِ فیاضِ زمان، حاتمِ دوران، نواب کلبِ علی بہادر دام اقبالہ

آج کل چلتی ہے عالم میں خوشی کی وہ ہوا — آشیاں میں ناچتا ہے طائرِ قبلہ نما
دھوم ہے شادی کی کس کی آج غل ہے مبارکباد کا — زیرِ گردوں جا بجا بالائے گردوں جا بجا
ہے یہ جوبن پہ عروسانہ لباس سرخ سے — شورِ قلقل ہے لبِ مینا سے ہے یہ قہقہا

علمی مباحثوں میں شریک ہوتا رہتا تھا جس سے اس کی معلومات اور قابلیت میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے دربار کے نورتن ابتک مشہور ہیں۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ دینِ الٰہی کی ترویج ہے جو خالص اسلامی نقطۂ نگاہ سے بعید معز، مگر خود اس کی سیاست ملکی میں بہت معاون ثابت ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی پرشور فضا اسی مذہب کی بدولت جنت نشان بنی تھی۔ اکبر نے جمادی الآخرہ سنہ ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) کو ۶۵ سال کی عمر میں اس دار فانی کو خیرباد کہا۔

(۴) ابوالفضل، شیخ مبارک کا بیٹا اور فیضی کا بھائی ہے۔ یہ سنہ ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۹ اکبر شاہی میں ملازمت کا شرف حاصل کیا، اور بہت تھوڑے عرصے میں وزارت کے درجے تک جا پہنچا۔ اس کو ربیع الاول سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں شاہزادہ سلیم کے ایما سے ۵۲ سال ۲ ماہ کی عمر میں شہید کر دیا گیا۔ یہ بڑا مدبر اور زبردست ادیب تھا۔ آئینِ اکبری، اکبرنامہ اور مکاتبات علامی تصنیفات ہیں۔ شعر بھی کہتا اور علامی تخلص کرتا تھا۔ یہ اکبری دربار کے نورتن میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے قتل کی اطلاع سے اکبر کو اس قدر صدمہ ہوا تھا کہ اس نے کئی وقت کھانا نہ کھایا۔ اور بار بار کہتا کہ اگر شیخو بابا مجھے قتل کرا دیتا تو اس سے بہتر تھا۔

(۵) فیضی، شیخ مبارک کا بڑا بیٹا۔ اور اکبری دربار کا ملک الشعرا تھا۔ حکمت کا فلسفہ، ریاضیات، تاریخ اور بیشتر کتابیں کا عالم تھا۔ سواطع الالہام، اور موارد الکلم، عربی میں، اور کلیاتِ نظم اور خمسہ اور ترجمۂ لیلاوتی فارسی میں اس کی مشہور تصنیفات ہیں۔ یہ ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) کو ۵۰ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

(۶) اصل میں نون ساقط ہے چونکہ میرزا صاحب نے ہمیشہ اس لفظ کو نون کے ساتھ لکھا ہے، اس لیے متن کے اندر نون کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۷) حکیم ابوالفتح مسیح الدین ابن حکیم عبدالرزاق گیلانی اکبر کا طبیب خاص اور اس عہد کا بڑا فاضل تھا۔ یہ اپنا علمی وجاہت و عظمت کے سبب سے بادشاہ کے دربار میں ممتاز رتبے کا مالک اور نورتن میں شامل تھا۔ اس نے سنہ ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں وفات پائی۔

صفحہ ۱۱

(۱) میرزا صاحب نے یہاں اس طرح لکھا ہے: "در رامپور آزاد خاں کا بنگلہ، و بہ چہ سکندری کا مطبع، محمد حسین خاں مالک مطبع"، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مطبع کا نام "حسنی" اور مالک مولوی محمد حسن خاں تھا۔

(۲) مطبع حسنی مراد ہے۔ مولوی محمد حسن خاں صاحب نے سنہ ۱۸۵۷ء میں اسے جاری کیا تھا۔

(۳) ڈپٹی سنگھ، بلراجپور کے زمیندار تھے۔ غدر کے پرآشوب ایام میں انگریزوں کی خدمات جان بازی سے انجام دیں، جن کے صلے میں تلسی پور کا سارا علاقہ جو ضبطی میں آ چکا تھا، گورنمنٹ نے عطا کر دیا، اور ضلع بہرائچ کا بھی ایک بڑا علاقہ مرحمت کیا۔ اس کے علاوہ [illegible] علاقے [illegible] اور [illegible] القلم کر دی گئی۔ ڈپٹی سنگھ کو [illegible] دیوانی کی [illegible] اور [illegible] ان کے پاس [illegible] ایجنٹ اسلحے کے اثر سے [illegible] قرار پائے [illegible] [illegible] کا خطاب [illegible] کا اعزاز حاصل ہوا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ میراثی کی مجلس [illegible] کے رکن بھی رہے۔

ان کا نام چار دوسرے تعلقہ داران اودھ کے ساتھ لارڈ کیننگ کے اعلان میں باعتراف خیر خواہی مذکور ہوا ہے۔
دیگبجے سنگھ کو شعر کہنے کا بھی شوق تھا۔ راجہ تخلص کرتے تھے۔ سید آغا حسن عرف میرن صاحب ناسخ تخلص سے مشورۂ سخن رہتا تھا۔ دیوان "مخزن فصاحت" کے نام سے ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء (۱۰ رمضان سنہ ۱۲۸۵ھ) کو بلرامپور کے مطبع جنگ بہادر میں چھپا تھا۔ ان کی فرمائش پر میرن صاحب نے توقیعات کسریٰ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا، جو مطبع مذکور میں دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء کی کسی تاریخ کو چھپ کر احکام نوشیروانی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں انھوں نے انتقال کیا ہے۔ ۲۷ مارچ ۱۸۷۳ء کو یہ نظیر کے میلے کی سیر کے لیے رامپور بھی آئے تھے۔ نواب خلد آشیاں نے رنگ محل میں ٹھیرایا اور بڑی مدارات کے بعد ۳۱ مارچ کو رخصت کیا۔ (صحیفۂ زریں: ۱۱، ختم نامہ ۳، و ۳۰، اخبار الصنادید: ۲/ ۱۵۷،)
(۴) یہ لفظ اصل میں ساقط تھا۔ سیاق کلام کے حسب اقتضا بڑھا دیا گیا ہے۔
(۵) اصل میں "عملواری" کی بجائے "عملداری" ہے۔ چونکہ یہ خط میرزا صاحب کے قلم کا نہیں ہے اس لیے سہو کاتب پر محمول کر کے متن میں تصحیح کی گئی ہے۔
(۶) نواب محمد علی خاں والیٔ ٹونک کے لیے صفحہ ۲۵ کا حاشیہ ۵ ملاحظہ ہو۔ نواب محمد علی خاں کے مرثیے سے میرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ نواب صاحب پر لاوا کے ٹھاکر کو قتل کرانے کا جو الزام ہے، اس سے متعلق بار بار اظہار رنج و افسوس کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ ٹونک کے اس اہم واقعے سے میرزا صاحب کا اتنی بے تعلقی ظاہر کرنا مدیر دبدبۂ سکندری سے ناراضگی کے باعث تھا۔ ورنہ وہ اس خاندان کے پرانے نیازمند تھے۔ نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خاں بہادر کی مدح میں ان کے دو فارسی قصیدے موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا: "ای ذات تو جامع صفت عدل و کرم را" دسمبر ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) سے پہلے اور جولائی سنہ ۱۸۳۸ء (جمادی الآخرہ ۱۲۵۴ھ) کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس لیے کہ یہ موخر الذکر سنہ کے نوشتہ دیوان میں شامل نہیں، اور پہلی تاریخ کے چھپے ہوئے نسخے میں موجود ہے۔ دوسرا قصیدہ: "عید اضحیٰ با سپر آغاز زمستان آمد" کسی ایسے سال میں لکھا گیا ہے جس میں بکرید شروع جاڑوں میں آئی تھی، اور ایسا برس از روئے حساب ۱۲۶۵، ۶۶ اور ۶۷ میں سے ایک ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ان برسوں میں اکتوبر کی ۱۸، اور ۸، اور ستمبر کی ۲۷ کو ذی الحجہ کی پہلی ہوئی تھی، جو موسم سرما کے آغاز کا زمانہ ہے۔

سنہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں جب نواب محمد علی خاں گدی پر بیٹھے، تو میرزا صاحب نے ایک تاریخی مثنوی لکھ کر بھیجی تھی۔ اس میں فرماتے ہیں:

زہی آنکہ از روزگاری دراز   بر آں عتبہ سائیدہ جبین نیاز

یہ میرزا صاحب کی طرف سے کھلا ہوا اقرار ہے اپنی قدیم نیازمندی کا۔ میرزا صاحب نے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء سے کچھ پہلے ایک خط سرور مارہروی کو لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں: "میں نے کسی زمانے میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والیٔ ٹونک